قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2022 قیمت 15 ₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

محبتوں کے چراغ

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:07، جولائی 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
تنقید نگاری کا فن — سید نفیس دسنوی 7
ممبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار نجیب اشرف ندوی — محمد زبیر 10
مصحفی اور اس کا امروہہ پن — رئیس احمد فراہی 13

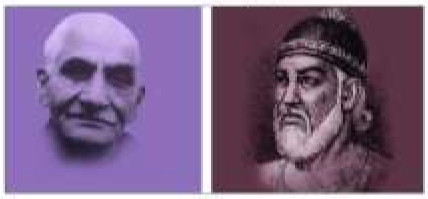

اردو تنقید کے نقوش — ارشاد قمر 16
رومانیت اور اردو افسانہ — عروسہ فاروق 19

زبان اور زمینی صورت حال
رسم الخط ہی زبان کی شناخت ہے — سید احمد نجار 24

لعل و گہر
اختر جاوید ایک پانچ سالہ بچہ — بدنام نظر 26
حیرت فرخ آبادی کا شعار تغزل — بدر محمدی 28
وامق جونپوری کی غزل گوئی — اسود گوہر 31

تصوف اور شاعری
بہادر شاہ ظفر کی صوفیانہ شاعری — نیلوفر حفیظ 34
اردو شاعری میں تصوف کی رنگارنگی — نظیر احمد گنائی 38

چراغ محبت
گورو روی داس کے افکار و نظریات کی عصری معنویت — مول راج 41

کبیر اور ان کے نظریات — منور عالم 43
کبیر داس — محمد یٰسین 45

خراج عقیدت
ایسے تھے نصرت ظہیر — محمد اکرام 47

سلسلہ صحافت
زبیر رضوی کی ادبی صحافت — خورشید اکرم 52

اردو صحافت میں زبان کا استعمال — محمد حنیف خان 55

کتاب دریچہ
جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — علی شاہد دلکش 58

نیا آسمان نئے ستارے
اردو زبان و ادب میں تصور کی تفہیم — محمود الحسن خان 60
گئودان اور اڑیہ ناول کا تقابلی مطالعہ — صلاح الدین شاہ 63

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 66

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 78

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

اردو زبان کی زمینی صورت حال وہ نہیں ہے جو اردو شعبوں، اداروں، تنظیموں، تحریکوں سے جڑے بعض ذہنوں میں ہے بلکہ زبان کی سطح پر اردو کا منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور زمینی صورت حال جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، واقعی اردو والوں کے لیے وہ قدرے تشویشناک ہے، کیونکہ اس زبان نے اپنے آغاز و ارتقا سے جس طرح اپنا دائرہ وسیع کیا تھا وہ رفتہ رفتہ سمٹتا اور سکڑتا جا رہا ہے، خاص طور پر اردو سے منسوب علاقوں میں اب اردو زبان کی صورت حال شاید زیادہ بہتر نہیں کہی جا سکتی۔ وہاں اردو کے تعلق سے محبت اور جنون کا وہ جذبہ نہیں ہے جو پہلے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اردو سے محبت کرنے والے ہر طبقے کے لوگ تھے اور انھیں اردو زبان کے تکثیری کلچر سے بے پناہ محبت تھی۔ اس زبان کی شگفتگی، شائستگی ہے کہ ہر ایک کو اپنا اسیر بنا لیتی اور کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والا اس زبان میں اجنبیت یا غیریت محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ ایک طرح کی ذہنی اور جذباتی قربت محسوس ہوتی تھی مگر اب خود اردو علاقوں میں یہ زبان اجنبیت محسوس کر رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے خود اپنا قصور نکل آئے گا کیونکہ جس زبان میں ہمارے ملک اور مٹی کا تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور مذہبی سرمایہ ہے اس زبان کے فروغ اور تحفظ کے تئیں ہم زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں۔ اب اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس زبان کی جو جنم بھومی ہے، جہاں اس زبان نے پرورش، پرداخت اور ارتقا کے بہت سے مرحلے طے کیے، جو علاقے اردو کے مراکز اور گہوارے سمجھے جاتے تھے، جہاں اس زبان کو ایک تہذیبی، ثقافتی شناخت کی حیثیت حاصل تھی، جہاں سے سیکڑوں اخبارات، رسائل وغیرہ شائع ہوا کرتے تھے، وہاں اب اس زبان کی صورت حال زیادہ بہتر نہیں ہے، کیونکہ لوگوں کی اس زبان سے وابستگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کی جو اکثریتی آبادیاں ہیں وہاں بھی اس زبان کے تعلق سے حساسیت نہیں پائی جاتی۔ یقیناً یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ اس زبان کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے ہر حلقے اور ہر طبقے تک پہنچنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ جب تک ہم ایک مربوط اور منظم لائحہ عمل طے نہیں کرتے تب تک اس زبان کو ہندوستان کے ہر علاقے تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اردو کے بہت سے ادارے، تنظیمیں، تحریکیں ہیں جو اس زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے کوششیں کر رہی ہیں مگر ان کی کوششیں مکمل طور پر بارآور نہیں ہو پا رہی ہیں کہ انھیں ہمارے اردو سماج کی مکمل حمایت حاصل نہیں ہو پاتی۔ اگر اردو سے جڑے ہوئے افراد میں اپنی زبان کے تحفظ کے تئیں جذبہ اور جنون پیدا ہو جائے تو یقینی طور پر اس زبان کو بہتر انداز میں فروغ ملے گا اور اس سے لوگوں کی وابستگی بڑھتی جائے گی۔

اردو زبان کی تلخ زمینی صورت حال کے باوجود ہمارے لیے خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو نئے نئے علاقوں میں اپنی موجودگی درج کرا رہی ہے۔ امریکہ، آسٹریلیا، جاپان، جرمنی، روس، چین، برطانیہ، ڈنمارک، ناروے اور دیگر ممالک میں اس زبان کے محبت کرنے والوں کی تعداد خاصی ہے اور وہ ایک جذباتی قربت محسوس کرتے ہوئے اس زبان کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ زبان معاش اور مفاد کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس کی کوملتا، نازکی، نزاکت، نفاست، لطافت انھیں ایک طرح کی ذہنی وابستگی کا احساس دلاتی ہے۔ اردو کے نئے نئے علاقے، نئی نئی بستیاں سب اس کے وسیع ہوتے دائرے کا ثبوت ہیں۔ اس لیے اردو زبان کے تعلق سے اب سنجیدہ ہونے اور اپنی زمین میں اس کے سکڑتے اور سمٹتے دائرے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے اور اس میں ہمارا بیش قیمت تاریخی اور تہذیبی سرمایہ ہے، اس لیے اگر ہمیں اپنی تہذیب، تاریخ، تمدن کا تحفظ کرنا ہے تو اس زبان کو زندہ رکھنا ہوگا اور اس کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی کیونکہ اردو اتنی خوبصورت شستہ، شائستہ اور کومل زبان ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی عبقری شخصیت نے اسے زبانوں کا تاج محل کہا ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقو ںکی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ھوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

اردو دنیا جون 2022) کا شمارہ ملا۔اس شمارے میں کم وبیش سبھی مضامین بے حد معلوماتی اور معیاری ہیں خاص کر اطفال ادب کے گوشے میں رئیس انور، میمنہ خاتون، بلال احمد اور تجمل حسین کے مضامین خوب ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ راقم کا مضمون 'ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب' بھی شامل ہے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ہندوستان کا کوئی بھی بچوں کا سائنسی ادیب چھوٹ نہ پائے اس کے باوجود غیر دانستہ طور پر جناب ایم اے کریمی (گیا) کا نام چھوٹ گیا جنھوں نے بچوں کے لیے سائنسی کہانیاں اور کوئز لکھی ہیں۔آپ کی سائنسی موضوعات پر بچوں کے لیے تین کتابیں شہد کی مکھیاں (1991)، ریشم کے کیڑے (1996) اور عجیب کیڑے (2016) منظر عام پر آچکی ہیں۔آپ کی بچوں کے لیے دو سائنس کی کتابیں میں کون ہوں اور ننھا جاسوس آنے والی ہے۔ آپ کی ادارت میں تین رسالے بچوں کی دنیا (گیا)، زمین کے تارے (گیا) اور اطفال ادب (گیا) شائع ہوئے ہیں۔

عبدالودود انصاری: سابق پرنسپل، اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری اسکول، ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، مغربی بنگال

ماہ جون کا 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔اس شمارے میں آپ نے ادب اطفال اور سائنس پر جس طرح توجہ دی اُس کی آج بہت ضرورت ہے۔ محترمہ میمنہ خاتون کا مضمون ادبِ اطفال کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جناب تجمل حسین نے سائنسی ادب اطفال پر بہت بہترین معلومات بہم پہنچائی۔ محترمہ خواجہ کوثر حیات نے جناب محمود شکیل کے خیالات کو اجاگر کر کے گویا افسانے کا حق ادا کردیا۔ محترمہ ہاجرہ بانو نے اردو کے مرہٹی زبان پر اثرات کو بیان کر کے اردو معیار کو اور بلند کردیا۔ان تمام مشمولات میں جناب عبدالودود انصاری (کولکاتا) کا مضمون ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب، گویا اس شمارے کی جان ہے جس میں انھوں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں بچوں کے سائنسی ادب کی وہ معلومات فراہم کیں جن سے پیشتر اردو ادبا ناواقف تھے۔ ان کا یہ مقالہ ان کی تحقیق کا نچوڑ ہے۔

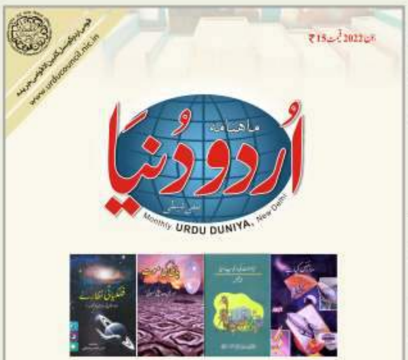

عبدالودود صاحب برصغیر کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے مکتوب نگاری کے ذریعے بچوں کو سائنسی معلومات دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی دو کتابیں 'آؤ سائنسی خط لکھیں' اور 'آؤ سائنسی خط پڑھیں' سائنسی مکتوب نگاری پر شاہکار کتابیں ہیں۔ مکالمہ نگاری پر ان کی کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' بچوں کے لیے بہترین کتاب ہے۔ یہ تینوں کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کی ہیں۔آپ نے ہندوستان میں پہلی بار سائنسی موضوعات پر یک موضوعی کوئز پر مبنی کتابیں تصنیف کی ہیں، جیسے جانور کوئز، پرندہ کوئز، سانپ کوئز، کپڑا کوئز اور فلک کوئز وغیرہ۔ اب تک موصوف کی کم وبیش 30 سائنسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور لگ بھگ 300 سے زائد سائنسی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

بہرحال اس معیاری شمارے کی اشاعت پر میں آپ کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر: 36، ڈلرس کالونی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

جون کے شمارے میں 'ہماری بات' کے تحت مدیر صاحب نے اردو زبان پر مبنی مطلوبہ درس و تدریس اور مضامین کی اشاعت کے فقدان اور ضرورت پر اظہارِ خیال کر کے لائق مدیر کا فریضہ انجام دیا ہے، جو کہ قابلِ مدح ہے۔

جناب مشتاق احمد گنائی نے اردو زبان کے فروغ وارتقا کی بابت بہت اہم تجاویز پیش کی ہیں۔ فقط پہلے ہی سوال میں 'وجوہات' جمع لفظ کا تصرف بے حد کھٹکتا ہے۔ در اصل 'وجہ' عربی زبان کا مؤنث اسم لفظ ہے اور اس کا جمع عربی لفظ مذکر اسم 'وجوہ' ہی با ضابطہ ہے، لیکن اسی لفظ کا دوبارہ اعادہ کر کے 'وجوہات' لفظ (جو کہ غلطی سے ادب میں مروج بھی ہو چکا ہے) کا استعمال کرنا یکسر غلط ہے اور فقرے میں 'کے وجوہ' الفاظ کا ہی تصرف درکار تھا۔ اسی موقر جریدہ میں تقریباً ہر ایک شمارے میں شائع سوالنامے میں اول سوال میں (اس بار بھی ص 73 پر) ہر بار اسی غلط جمع لفظ 'وجوہات' کا تصرف کیا جاتا رہا ہے۔ اس ناچیز نے اپنے ایک مراسلے میں اسی جانب توجہ مبذول کرائی بھی تھی، لیکن سب بے سود رہا تھا۔

اردو داں عالم و فاضل حضرات کو زبان و املا کے علاقے میں سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ص 8 پر دوئم کالم میں ڈاکٹر گنائی کا اعلان ہے کہ ان کے اپنے علاقے پلوامہ میں اردو میڈیم کا کوئی اسکول نہیں ہے۔ اگلے ہی ص 9 پر آخری سوال کے جواب میں ان کا واضح طور پر یہ اعلان برعکس ہے کہ ان کے پلوامہ ضلع میں تین سینٹرل اسکول اور دو عدد اسکول نو ودیالیہ ہیں۔ ان میں انھوں نے اردو درس و تدریس کا معقول اور تشفی بخش انتظام ہونے کی بات کہی ہے۔

اگرچہ سنہ 1857 کے غدر پر مبنی لاتعداد کتب، مضامین وغیرہ تا حال دستیاب ہیں، تاہم جناب عبدالحق نے اسی ہنگامہ خیز سال کے چند مآخذ کے بطور دو خاص کتب کے خصائص نشان زد کیے ہیں، اور وہ بھی کلاسیکی زبان میں اور تنقید کی یہ زبان لائقِ ستائش ہے، مستزاد، یہ دیگر نقادوں کے لیے قابلِ تقلید بھی ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

ہماری بات میں اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن کی بات آپ نے تفصیل سے بتائی ہے حالانکہ اسی دوران اردو صحافت کئی نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اسی شمارے میں عزیز وسیم فرحت کا مضمون 'جاں نثار اختر ایں ہمہ خانہ آفتاب است' بے حد پسند آیا۔ انھیں دلی مبارکباد اور دعائیں۔ وسیم فرحت میرے عزیز دوست علاقے کے معروف شاعر مرحوم خلیل فرحت کے صاحب زادے ہیں۔ خلیل فرحت کے دونوں فرزند شمیم فرحت جو اچھے شاعر اور بہترین ناظم مشاعرہ ہیں، دوسرے وسیم فرحت جو شاعر تو بہت اچھے ہیں لیکن نثر کی پرخار وادی میں سفر کر رہے ہیں، دونوں مجھ سے بے حد قریب ہیں۔ وسیم امراؤتی سے سہ ماہی 'اردو' رسالہ بھی نکالتے ہیں جو ادبی حلقوں میں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

اسی طرح سفیان احمد انصاری کا اودھ کا بابائے صحافت منشی نول کشور سے متعلق مضمون پسند آیا۔ دراصل منشی نول کشور کی اردو ادب اور اردو صحافت کے لیے جو خدمات ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ دعا ہے اردو دنیا خوب ترقی کرتا رہے۔

مصطفیٰ جمیل: مومن پورہ، بالاپور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے میں مظفر اسلام نے 'اردو زبان کی تدریس مقاصد مسائل اور امکانات' پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ پہلے زمانے میں بچوں کو نصابی تعلیم کے ساتھ ان کی شخصیت سازی اور کردار سازی پر بھی زور دیا جاتا تھا لیکن اب درس و تدریس کے ترقی یافتہ ذرائع ہونے کے باوجود نہ کردار سازی پر نہ شخصیت سازی بات ہوتی ہے بلکہ تعلیمی سسٹم مادیت کی ترغیب دے رہا ہے۔ جب تعلیم برائے روزگار کا تصور آ جائے تو کیسے اخلاق و کردار کی تشکیل ہوگی۔ محمود شیخ نے 'عشق کل اور آج' میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کے متعلقات پیش کیے ہیں۔ محسن علی نے 'مقدمہ دیوان فانی گورکھپوری' میں ان کی خصوصیات اور صفات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ فیضان الحق، وسیم فرحت، محمد خوشتر، شکیل احمد وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدر آباد، تلنگانہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔ صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

سید نفیس دسنوی

تنقید نگاری کا فن

تنقیدی شعور کی کارفرمائیاں ہی کسی فن پارے کو نقطۂ عروج تک لے جاتی ہیں۔دراصل تنقید نگار کا فہم و ادراک عام قاری کے مقابلے میں کافی وسیع ہوتا ہے۔اور وہ اپنی پسند اور نا پسند کو دلائل کے سہارے Convincing انداز میں پیش کر سکتا ہے۔اسی تنقیدی شعور نے انسان کوپتھر کے دور سے نکال کر ترقی یافتہ شاہراہوں تک پہنچایا ہے۔

تنقید کسی شے کی خوبی اور خامی کے مابین تفریق کرنے کا شعور ہے۔اسے ادنیٰ واعلیٰ، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا ہنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ایک تنقید نگار نہ صرف یہ کہ کسی فن پارے کے حسن اور قبح کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اس کے تمام مخفی گوشوں کو پرت در پرت اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ ہر سطح سے ایک جہانِ معنی عکس در عکس ابھر نے لگتا ہے۔ یہ تنقیدی شعور انسان کو پسند اور نا پسند کی تمیز بھی عطا کرتا ہے۔تنقیدی شعور کی کارفرمائیاں ہی کسی فن پارے کو نقطۂ عروج تک لے جاتی ہیں۔دراصل تنقید نگار کا فہم وادراک عام قاری کے مقابلے میں کافی وسیع ہوتا ہے۔اور وہ اپنی پسند اور نا پسند کو دلائل کے سہارے Convincing انداز میں پیش کر سکتا ہے۔اسی تنقیدی شعور نے انسان کو پتھر کے دور سے نکال کر ترقی یافتہ شاہراہوں تک پہنچایا ہے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت نے تنقید کی بڑی جامع اور مکمل تعریف بیان کی ہے۔فرماتے ہیں ''دراصل تنقیدی عوامل کے تحت تشریح وتوضیح، فکروفن کے مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں کی نشاندہی، تخلیق کار کے ذہن میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے تخلیقی عوامل کا جائزہ، ان عوامل کے ارتقا میں مختلف داخلی وخارجی اثرات کی دریافت، فنکار کے مختلف فن پاروں نیز ان کے ہم عصر اور پیش رو فن کاروں کی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے فن کار کا اضافی (Relative) مقام متعین کرنا' بین العلومی مطالعے کے ذریعے فن پارے کے اندر پوشیدہ خوبیوں کو اجاگر کرنا، لفظ ومعنی کے رشتوں کی تحلیل، اور متن کی شکست وریخت، سب کچھ شامل ہے۔''

(بحوالہ اردو ادب کا کوہِ نور: پروفیسر کرامت علی کرامت، ص 428)

تنقید نگاری کے فن میں نقاد کا رویہ بہت اہم ہوتا ہے۔دورانِ تنقید مضمون کا متن (Text) پس منظر میں چلا جاتا ہے اور نقاد کا رویہ (Attitude) تنقید نگاری پر حاوی ہونے لگتا ہے۔نقاد اس سے انصاف کرنے کے بجائے تخلیق کار پر اپنی بالا دستی قائم کرنے میں لاشعوری طور پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگتا ہے' جس کے نتیجے میں تنقید کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نقاد کا ذخیرۂ علم وآگہی تخلیق کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں آڑے آنے لگتا ہے اور تنقیدی رویئے پر بھاری پڑنے لگتا ہے جس سے متن کے Under- estimated ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

تنقید نگاری کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ اگر شعری ادب سادہ اور اکہری سطح کا ہوتا ہے تو تنقید کی ضرورت نہیں رہتی، مگر درحقیقت اعلیٰ شعری ادب ایک بہت ہی پیچیدہ اور علامتی (Symbolic) مظہر ہے جس کی تشکیل میں سماجی، نفسیاتی، اور نظریاتی عوامل ہم آمیز ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اساطیری، تمثیلی اور اسطوری (Mythological) روایات بھی شعری ادب تخلیق کرنے کا پس منظر تراشتے ہیں اور اسی عمل میں اشعار پیچیدہ اور علامتی قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔تحقیق اور تنقید دراصل انھیں عوامل کے مفہوم، معنویت اور قدر کے تعین کا عمل ہے۔

تخلیقات کے حوالے سے ہر دور میں تنقید کی کچھ اپنی ترجیحات ہوا کرتی ہیں۔کسی دور میں مفہوم ومعنی اور اندازِ بیاں پر زور دیا جاتا رہا ہے تو کبھی تخلیقی حسن اور فکری اعماق پر بحث ہوتی رہی ہے۔پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ کلاسیکیت کی بازیافت اور عصری حسیت کی آمیزش موضوعِ گفتگو بن گئی۔لیکن ہر دور میں بے لاگ تنقیدی رویہ ان تمام محرکات کو اپنے دامن میں سلیقے سے سمیٹتا رہا، اور وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتی ہوئی لفظی اور معنوی کیفیات، ایجاب وانکار کا مناسب اور قابلِ قبول پیمانہ وضع کرتا رہا۔شرط صرف یہ تھی کہ ایسے تنقیدی رویئے کی بنیاد دیانتداری اور غیر جانب داری کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی تنقیدی رویہ حتمی یا آخری نہیں ہوتا کیونکہ تغیر پذیری ہی ایک زندہ ادب کی علامت ہے۔جب کوئی تنقید نگار تنقید میں حتمی اور حرفِ آخر ہونے کی کوشش میں کوائف اور شماریات کا بیجا استعمال کرنے لگتا ہے تو متن اور تفہیمِ متن کا توازن بگڑ جاتا ہے اور تنقید نگار مروجہ، تسلیم شدہ تنقیدی اصولوں کے پل صراط پر ڈگمگانے لگتا ہے۔متوازن تنقیدی مسلک میں فن کے اسلوب کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔زندگی' ادب اور تنقید ان تینوں میں متوازن اور متمول اسلوب کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو ادب میں باضابطہ تنقید نگاری کی ابتدا مولانا الطاف حسین حالی سے ہوئی۔اس سے قبل اردو شعرا کے تذکروں میں تنقید کے ابتدائی نمونے ضرور مل جاتے ہیں۔ان تذکروں میں تنقید کے اعلیٰ نمونے بھی موجود ہیں۔میر تقی میر کی تصنیف 'نکات الشعرا' میں بے لاگ تنقیدی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔میر کی تنقید میں کہیں کہیں تلخ کلامی نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ مصحفی کی تنقید نگاری میں اعتدال پسندی غالب نظر آتی ہے۔آج جدید تنقید کی

عمارت چاہے جتنی بھی بلند ہو جائے مگر سنگِ بنیاد تو مولانا الطاف حسین حالی اور حضرت شبلی نعمانی کے وضع کردہ تنقیدی اصول پر ہی ہے۔ اردو تنقید نگاری آج بھی عملی تنقیدی اصولوں کی انھیں پٹریوں پر دوڑ رہی ہے۔ ان مسلمہ تنقیدی رویوں سے صرفِ نظر کر کے اردو تنقید آگے نہیں بڑھ سکتی۔ موازنۂ انیس و دبیر اور 'شعر العجم' کے ذریعے حضرت شبلی نعمانی نے اردو ادب کو عملی تنقیدی ماڈل فراہم کیے۔ انھوں نے شاعری کی تنقید کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے تھے وہ صرف عصری تقاضوں پر مبنی نہیں تھے بلکہ ان میں مستقبل کا مزاج بھی جھلکتا تھا۔ انھوں نے مغرب کے محدود اور ناقص تنقیدی رویوں کی پیروی کے بجائے مشرق کی تعمیری اور تخلیقی تنقید کی اپنی بنیاد استوار کی جو کہ گزشتہ نصف صدی کی تقلیدی تنقید کے گرد و غبار کے باوجود اردو کی جدید تنقید کے لیے مشعلِ راہ ہے اور اپنی معنویت کی وجہ سے 'سمت ساز' بھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اردو میں عملی اور تقابلی تنقید نگاروں کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ انھوں نے شاعری کے حوالے سے بھی عملی اور نظریاتی تنقید کے تمام پہلوؤں پر توجہ کی۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انھوں نے شاعری پر عملی تنقید کا سانچہ (Format) بھی پیش کیا۔ اور اپنی معرکتہ الآرا تنقیدی تصنیف 'شعر العجم' میں تنقیدی نظریات بھی پیش کیے اور ان پر بصیرت افروز اور خیال انگیز بحث بھی کی جو قابلِ ستائش بھی ہے۔ ان کے مباحث منطقی اور استدلالی ہیں۔ مہدی افادی نے 'شعر العجم' کو تنقیدِ عالیہ (Higher Criticisim) کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ صرف اردو لٹریچر ہی نہیں بلکہ مشرق کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان میں اس پائے کی تصنیف کا وجود نہیں ہے اور یہ دنیا کی شیریں ترین زبان اردو کے جذباتی ادب کا خوبصورت مرقع ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے علاوہ 'حیاتِ سعدی' اور 'یادگار غالب' میں اپنے تنقید کا ڈھانچہ عربی زبان کے معیارِ نقد کے مطابق وضع کیا مگر اس کی توثیق کے لیے ہمیشہ مغرب کے ادبی تصورات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ اس کے برعکس مولانا شبلی نعمانی نے مغربی ادب کا مطالعہ ضرور کیا مگر اس سے مرعوب کبھی نہ ہوئے اور نہ ہی مشرقی اردو زبان کی کم مائیگی کے احساس کمتری میں مبتلا ہوئے۔ ان کے کشکول میں اردو کا گراں مایہ ادبی سرمایہ موجود تھا۔

پروفیسر مسعود حسین کے عہد میں جو تنقیدی مضامین لکھے جا رہے تھے وہ ''تاثراتی تنقید کے ذیل میں آتے تھے' جس سے وہ خود مطمئن نہ تھے۔ وہ انھیں صرف انشا پردازی تصور کرتے تھے' تنقید نہیں۔ انھیں تنقید کے اس نظریے کی تلاش تھی جس میں داخلی اور تاثراتی انداز کے بجائے معروضیت اور قطعیت پائی جاتی ہو۔ جب امریکہ میں قیام کے دوران انھیں بالڈاے ہل سے جن کا شمار تفہیمِ ادب پر لسانیت کا اطلاق کرنے والوں میں تھا' استفادہ کا موقع ملا تو انھوں نے لسانیت اور ادب کو ہم آمیز کرنے نسخہ دریافت کر لیا۔ ادب کی تنقید کے اس نظریے کو اسلوبیاتی (Stylistic) تنقید کے نام سے موسوم کیا گیا۔ نئی تنقید (New Criticism) بیسویں صدی کے چوتھائی اور پانچویں دہائی میں بے حد مقبول ہوئی۔ ٹی ایس ایلیٹ کے اسی تنقیدی رویے کو آئی اے رچرڈس (I.A.Richards) اور ولیم ایمپسن (William Empson) نے مزید فروغ دیا۔

اردو کلاسیکی تنقید نگاری میں شعر ادب کو آنکنے کے شرقی تنقیدی اصول پوری وضاحت اور جامعیت کے ساتھ موجود ہیں۔ اکابرینِ ادب جیسے مولانا الطاف حسین حالی (مقدمۂ شعر و شاعری): امداد امام اثر (کاشف الحقائق)، (اردو شاعری پر ایک نظر اور اردو تنقید پر ایک نظر)' وزیر آغا (اردو شاعری کا مزاج)' شمس الرحمٰن فاروقی (شعر' غیر شعر اور نظر)' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ساختیات اور پس ساختیات اور مشرقی شعریات)' وہاب اشرفی (مابعد جدیدیت :مضمرات و ممکنات)' پروفیسر کرامت علی کرامت (اضافی تنقید)' آلِ احمد سرور' محمد حسن عسکری' پروفیسر عبد المغنی' پروفیسر احمد سجاد' سلیم احمد' احتشام حسین' محمد حسن وغیرہ کی تنقیدی تصنیفات نے اردو تنقید نگاری کو قابلِ رشک بلندیوں تک پہنچایا۔ پروفیسر کرامت علی کرامت کی تصنیف 'اضافی تنقید' کو اس اعتبار سے ایک اساسی حیثیت حاصل ہے کہ تنقیدی امور پر یہ رہنما کتاب ان کے تنقیدی نظریے اور خد و خال کا ایک جامع تفہیم نامہ فراہم کرتی ہے۔ 'اضافی تنقید' کو ان کے ادبی نظریے کی بنیاد گزار تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ کرامت صاحب کی تنقید نگاری میں فکر و نظر کا ایک مربوط' متوازن اور جامع نظام کارفرما ہے۔ چونکہ موصوف تنقید نگار کے علاوہ ایک اعلیٰ پایہ کے تخلیق کار بھی ہیں' اس لیے ان کی تنقید روایتی تنقید سے ایک منزل آگے ہی چلتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک تخلیق کار جب تنقید نگاری کی ذمے داری سنبھالتا ہے تو دیگر تنقید نگاروں کے مقابلے میں تخلیق کی فنی باریکیوں' لطافتوں اور نزاکتوں اور ان میں مضمر رموز و علائم کا بہتر طور سے جائزہ لے سکتا ہے اور منطقی (Logical) تنقید نگاری کا حق بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ پروفیسر کرامت علی صاحب کے ساتھ عین یہی معاملہ ہے۔

ایک تنقید نگار کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنی تنقید کا ایک ضروری 'فریم ورک' ذہن میں تیار کرے' پھر اس میں کسی تخلیقی نمونے کو فٹ کر کے اسے پرکھے' اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرے۔ یہ دونوں عمل 'اصولی تنقید' اور 'عملی تنقید' کے ایسے مراحل ہیں جن سے گزر کر ہی تنقید نگار حقِ تنقید ادا کر سکتا ہے۔ تنقید کے مختلف دبستانوں میں تقابلی تنقید (Comparative Criticism) اور سائنٹیفک تنقید زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ تقابلی تنقید میں دو فنکاروں کے کسی ایک صنفِ ادب کا موازنہ کیا جاتا ہے جس کی بہترین مثال شبلی نعمانی اور انیس و دبیر کا مقابلہ ہے۔

سائنٹفک تنقید نگاری کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہے جس میں کسی فن پارے کے معائب اور محاسن کا ہر زاویہ نگاہ سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایسی تنقید نگاری میں تحقیق (Research) کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرزِ تنقید میں یہ مانا جاتا ہے کہ کسی تنقیدی رویے کو اس وقت تک درست تسلیم کیا جانا چاہیے جب تک اس کی صحت کے متعلق اتنا مواد فراہم نہ ہو جائے جو اسے غیر درست ثابت کرنے کے لیے کافی ہو۔

آج کے زیادہ تر نقاد مجموعی طور پر اپنے تاثرات کا اظہار تو کر دیتے ہیں، مگر کسی فنکار کے فن پاروں کا لسانی، فنی اور فکری تجزیہ کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ تنقید و تبصرہ میں روز مرہ کے محاورات، لفظی مناسبت، تراکیب کی ندرت اور قوافی کی جدت سے آگے بڑھ کر شعر کے رنگ و آہنگ، اس کے صوتی نظام، اس کی قرأت کے رموز اور اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کی گہرائی اور گیرائی کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اپنی بات کو پوری دیانت داری اور خلوص سے کہی جائے۔ ذو معنی اور گنجلک خیالات سے پوری طرح گریز کیا جائے کیونکہ یہ صحت مند تنقید کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر پر زور پیدا کرنے کی خاطر حقائق کو توڑ مروڑ کر غلط انداز میں پیش کرنا ایماندارانہ تنقیدی اصول کے منافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان و ادب کے ناقدین مستعار، خود ساختہ تنقیدی رویے سے گریز کرتے ہوئے مستند، مشرقی تنقیدی اصولوں کی جانب رخ کریں اور اپنے زاویۂ نظر کو فروغ دیں جو Indigenous ہوں۔ مزید برآں ایسے تنقیدی سانچے وضع کریں جن پر اردو شعر و ادب کو صحیح طور پر پرکھا جا سکے اور اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔

■

Syed Nafees Dasnavi
Plot No:1481/B,Sector-6.C.D.A
Bidanasi
Cuttack-753014(Odisha)
Mob.: 9437067585

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورتِ حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

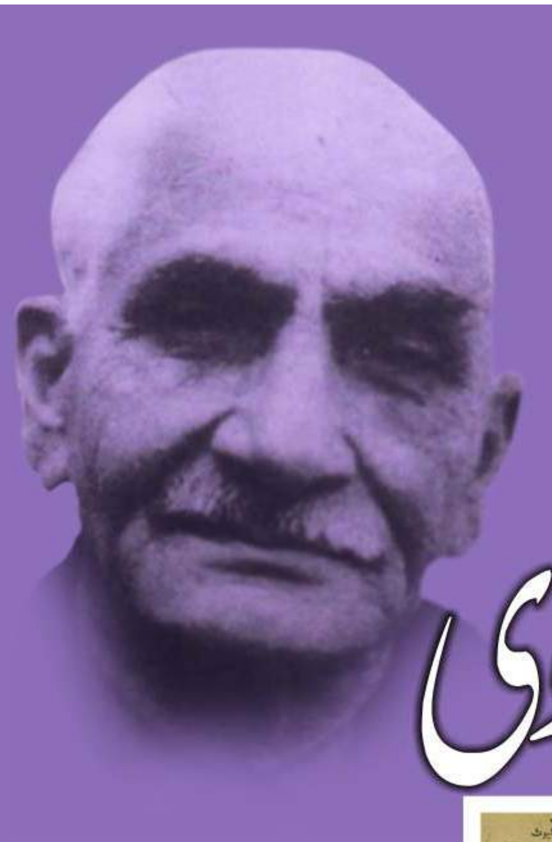

محمد زبیر

ممبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار نجیب اشرف ندوی

نجیب اشرف ندوی کا آبائی وطن دسنہ ضلع پٹنہ ہے، لیکن ان کی پیدائش (یکم نومبر 1900) آرموری ضلع چاندہ (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ دارالعلوم ندوۃ (لکھنؤ) سے تعلیم حاصل کرنے کے سبب ندوی کہلائے۔ 1924 میں کلکتہ یونیورسٹی سے گریجویشن (بی اے) کی ڈگری حاصل کی اور یہیں سے 1926 میں ایم اے (فارسی) کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ ان کا پہلا مضمون 'پان کی کہانی' کے عنوان سے پردہ نشیں آگرہ میں شائع ہوا تھا۔ ان دنوں پورے ملک میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ان تحریکوں سے وہ بے حد متاثر تھے لہٰذا اپنی تعلیم چھوڑ کر ان میں شامل ہوگئے۔ سید سلیمان ندوی، نجیب اشرف ندوی کے چچازاد بھائی ہوتے تھے۔ انھوں نے نجیب اشرف کے جوہر کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا، ان کی علمی صلاحیتوں اور ادبی ذوق وشوق دیکھ کر انھیں دارالمصنفین اعظم گڑھ بلالیا، چنانچہ وہ اس ادارے سے منسلک ہوگئے اور اپنی عمر کے بہترین دس برس یہیں رہ کر علمی وادبی خدمات انجام دیتے رہے۔

دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی وابستگی سے نجیب اشرف ندوی کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھرنے کے خوب مواقع میسر آئے۔ اس ادارے کے بحیثیت رفیق انھوں نے رقعاتِ عالمگیر کی تصحیح وتشریح کا کام بحسن وخوبی سرانجام دیا۔ تقریباً چار سال کی گرانقدر محنت اور ریاضت کے بعد

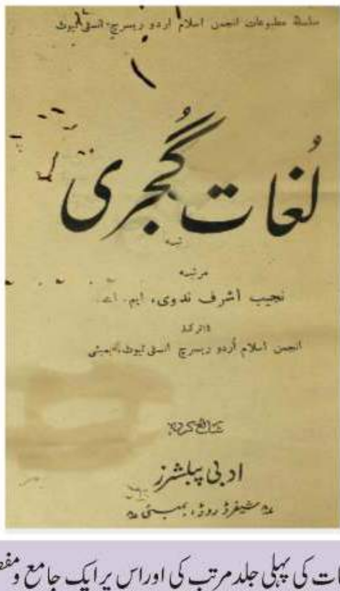
سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

لُغات گُجری

مرتبہ

نجیب اشرف ندوی، ایم۔ اے

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی

ادبی پبلشرز

شیفرڈ روڈ، بمبئی

رقعات کی پہلی جلد مرتب کی اور اس پر ایک جامع ومفصل مقدمہ سپرد قلم کیا۔ ان کی تحقیقی دلچسپی، ذہنی شادابی اور غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت 'مقدمہ رقعاتِ عالمگیر'، 'رقعاتِ عالمگیر' (جلد اول) اور 'لغات گجری' جیسی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔

ان کتابوں کے علاوہ نجیب اشرف ندوی نے کئی اہم اور اعلیٰ پایے کے مقالے سپرد قلم کیے، جن میں بابَر یا بابُر (معارف اگست 1922)، نیاز فتح پوری کی تاریخ الدولتین (معارف اگست 1924)، تبصرہ پنجاب میں اردو (معارف جولائی 1928)، دیوان حافظ اور سلاطین مغلیہ (جون 1933) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے بابَر یا بابُر میں سلطنت مغلیہ کے نامور شہنشاہ ظہیرالدین بابر کے نام کی تصحیح کرنے کی کوشش کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ظہیرالدین بابر کا آخری لفظ بابَر نہیں بلکہ بابُر ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ایک نظم پیش کی ہے جس میں لفظ بابُر قافیہ واقع ہوا ہے۔ پھر انگریزی، فرنچ، جرمنی زبان کے مستشرقین سے استفادہ کیا ہے، جنھوں نے اپنی اپنی زبانوں میں لفظ بابر کو بابُر ہی استعمال کیا ہے۔ ان کے مطابق بریزن (Prezine)، المنسکی (Ilminski) اور ٹیوفل (Tevfal) جیسے مورخ ومستشرق اسے بابُر (Babur) ہی لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں نیاز فتح پوری کی تاریخ الدولتین اور صحابیات وغیرہ پر استدراک لکھ کر نہ صرف ان کے علمی سرقے کا انکشاف کیا بلکہ ان کی عربی دانی کی قلعی بھی کھولی ہے۔ انھوں نے 'تاریخ الدولتین' (مولفہ علامہ نیاز فتح پوری) کا جب بالاستیعاب مطالعہ کیا اور تحقیقی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے بنیادی مآخذ کی تحقیق کی تو پایا کہ اصل تصنیف مصر کے عیسائی مورخ علامہ جرجی زیدان کی ہے جس کا نام 'التمدن الاسلامی' ہے۔ نیاز فتح پوری نے اس کا ترجمہ کرکے اپنے نام شائع کردیا ہے۔ اس ضمن میں شمیم طارق کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"انھوں نے نیاز فتح پوری کے علمی سرقے کی نشاندہی کرنے کے ساتھ جرجی زیدان اور نیاز فتح پوری کی ایسی گرفت کی کہ جرجی زیدان کی علمی خیانت کے ساتھ نیاز کی عربی دانی کا بھرم بھی کھل گیا۔ یہ مضمون جب معارف (اگست 1924) میں شائع ہوا تو دنیائے ادب حیرت میں

ڈوب گئی کیونکہ نجیب اشرف ندوی نے صرف انھیں حقائق سے پردہ نہیں اٹھایا تھا جن سے علمی خیانت ظاہر ہوتی تھی بلکہ نیاز کے ترجموں کی غلطیوں پر بھی گرفت کی تھی۔ عربی الفاظ کی غلط تعبیرات کو ظاہر کیا تھا۔''

(مونوگراف نجیب اشرف ندوی، از شمیم طارق، ص 65)

'مقدمہ رقعات عالمگیر' دراصل اورنگ زیب عالم گیر کے مجموعہ رقعات 'رقعات عالمگیر' پر لکھا ہوا ایک جامع مقدمہ ہے جو نجیب اشرف ندوی کے ہاتھوں زیر ترتیب تھا اور آئندہ اشاعت پذیر ہونے والا تھا۔ انھوں نے اس مقدمے پر مزید 117 صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ لکھ ڈالا جس میں فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغہ انشا کا حال اور انشائے اصول، اور خاص عالمگیر کی انشا پر بحث، اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی پیدائش سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات، خطوط اور رقعات کی روشنی میں جس طرز سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے، بلاشبہ ان کی تحقیق کے میدان میں ژرف نگاہی کا اہم ثبوت ہے۔ مقدمے کی ترتیب میں جس محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر فن انشا کی اجمالی تاریخ، مکاتیب اورنگ زیب اور سیرت اورنگ زیب کے ماخذ کے سلسلے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مقدمہ کے علاوہ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جنھیں شہزادہ اورنگ زیب کے عنوان کے تحت نجیب اشرف ندوی نے اس طرح ترتیب دیا ہے:

1 ولادت، تعلیم و تربیت
2 ابتدائی لڑائیاں اور دکن کی نظامت، بندیل کھنڈ کی جنگ، دکن کی فتح، نظامت دکن
3 اورنگ زیب کی متاہل زندگی اعتزال، گجرات کی صوبہ داری، اورنگ زیب کی معزولی، گجرات کی نظامت
4 بلخ و بدخشاں کی جنگ
5 نظامت ملتان اور قندھار کے محاصرے
6 دوسری بار نظامت دکن
7 گولکنڈہ اور بیجاپور کی جنگ
8 برادرانہ جنگ اور تخت نشینی

رقعات عالمگیر (جلد اول) اورنگ زیب کا تحریر کردہ رقعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں پند و نصائح کے علاوہ ادب و تادیب، زبان دانشا اور علم و حکمت کے رموز بھی موجود ہیں۔

نجیب اشرف ندوی نے اردو کی جائے پیدائش پنجاب کو قرار دینے والے مشہور مصنف حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' (1928) کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں 'پنجاب میں اردو' حافظ محمود شیرانی کی معروف اور اہم کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے لسانیات کے علاوہ لفظ 'اردو' کے استعمال پر بھی بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں لفظ اردو کا استعمال بابر کے عہد سے ہوا ہے اور اس کے ثبوت میں عبدالرحیم خان خاناں کی تزک بابری کے فارسی ترجمے سے ایک عبارت نقل کی ہے۔ جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو متعدد ناقدین ادب نے اس پر اپنے تبصرے پیش کیے۔ نجیب اشرف ندوی کا ایک علمی و تنقیدی تبصرہ (معارف، اعظم گڑھ، جولائی۔ اگست 1928) شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے غیر جانب دارانہ رویہ اور اصول تحقیق کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف اپنی ناقدانہ آرا پیش کی بلکہ محمود شیرانی کے مغالطوں اور تسامحات پر گرفت بھی کی ہے۔ نجیب اشرف ندوی نے دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ بابر کے عہد سے قبل کی کتاب 'تاریخ فیروز شاہی' (مصنفہ شمس سراج عفیف) میں لفظ اردو کا استعمال دو جگہوں پر ہوا ہے۔ اس ضمن میں اس کتاب کی دونوں عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

(1) ''باواز و بذل و عطا از ہر چہار جانب متوجہ اردوئے او گردید۔'' (تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف ص 4)

(2) ''در ہر دو لشکر اخبار مختلف مذکور می شد کہ خواجہ جہاں برآں قرار دادہ کہ چوں لشکر سلطان بدہلی رسد، امرا کہ در 'اردوے ظفر قرین' اند اتباع آنہا را دیدہ در پلہ تحقیق نہادہ خواہد انداخت۔'' (تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف ص 53)

بعینہ محمود شیرانی کے مطابق زبان کے معنی میں لفظ اردو کا استعمال سب سے پہلے عطا حسین خاں تحسین نے کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں لکھا ہے:

''مگر زبان کے معنوں میں اس کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے۔ اس کو رواج میں آئے سو، سوا سو سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے۔ ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا۔''

(پنجاب میں اردو، از محمود شیرانی، قومی کونسل ایڈیشن 2005، ص 21-22)

لیکن نجیب اشرف ندوی کے مطابق لفظ اردو کا استعمال زبان کے معنوں میں میر تقی میر نے اپنی سوانح 'ذکر میر' (1197ھ) میں عطا حسین خاں تحسین کی کتاب سے تقریباً 15 برس قبل کیا ہے۔ اس ضمن میں 'ذکر میر' کی یہ عبارت پیش ہے:

''بعد از چندے باسعادت علی نام، سیدے کہ از امروہہ بود برخوردم آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلی بادشاہ ہندوستان دوران وقت رواج داشت کرد۔''

(ذکر میر از میر تقی میر، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص 67)

ان حوالوں اور شواہد کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نجیب اشرف ندوی کا مطالعۂ ادبیات اور لسانیاتی شعور کافی پختہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ادبی دنیا نجیب اشرف ندوی کی تحقیق و تنقید اور طرز استدلال کی قائل ہوگئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نجیب اشرف ندوی نے اس کتاب (پنجاب میں اردو) کی صرف خامیاں اجاگر کی ہیں بلکہ انھوں نے پہلے اس کتاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے اور محمود شیرانی کی علمی فضیلت اور کارناموں کا اعتراف کیا ہے اور پھر ان کی خامیوں پر گرفت کی ہے۔

دارالمصنفین کی خدمات سے فراغت کے بعد نجیب اشرف ندوی گجرات اور بمبئی میں اپنی تحقیقی خدمات انجام دیں۔ گجرات کالج (1930) میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے لیکن جلد ہی (1931 میں) بمبئی آگئے اور اسمٰعیل یوسف کالج میں اردو فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کالج سے وابستگی کے بعد بھی ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اسمٰعیل یوسف کالج سے وابستگی کے دوران اگرچہ انھوں نے تحقیقی اور تصنیفی کام کچھ زیادہ نہیں کیا ہے لیکن ان کی رہنمائی میں متعدد محققین نے اہم کارنامے انجام دیے۔ ان محققین میں سید ظہیرالدین مدنی نے 'گجرات کے اردو شعرا' کے موضوع پر 1948 میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ عبدالعلیم نامی نے 'اردو تھیٹر' (1953) اور عقیلہ نذیر احمد خان نے 'اکبر الہ آبادی: حیات اور کارنامے' کے عنوان سے (1957) تحقیقی و تنقیدی مقالہ تحریر کرکے بمبئی یونیورسٹی میں جمع کیا تھا، جن پر یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، ڈاکٹر عالی جعفری، عصمت جاوید اور ڈاکٹر مقبول احمد وغیرہ چند ایسے نام ہیں جنھوں نے براہ راست نجیب اشرف ندوی سے استفادہ کیا ہے۔

انجمن اسلام ممبئی کا ایک قدیم علمی و ادبی ادارہ ہے۔ ابتدا سے ہی اپنی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کے سبب روز افزوں ترقی کی جانب گامزن ہے۔ 1947 میں جب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت سید نجیب اشرف ندوی 'اسمٰعیل یوسف کالج' جوگیشوری بمبئی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ انھیں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا اعزازی ناظم بنایا گیا اور ممتاز حسین

کل وقتی اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنائے گئے۔نجیب اشرف ندوی 1955 میں جب اسمٰعیل یوسف کالج سے سبکدوش ہوئے تو اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر کردیے گئے۔ انھیں کی نگرانی میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی رسالہ 'نوائے ادب' جنوری 1950 سے نکلنا شروع ہوا۔اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی معیار کے سبب اس رسالے نے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کرنے کے ساتھ بہت جلد مقبولیت بھی حاصل کرلی۔اس انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے سلسلے میں شمیم طارق رقم طراز ہیں:

''سید نجیب اشرف ندوی (1947 تا 1968) تقریباً 21 سال 'انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' سے وابستہ رہے اور اس دوران انھوں نے علمی و ادبی مضامین لکھنے کے علاوہ لائبریری کی تنظیم، 'نوائے ادب' کے اجرا اور انسٹی ٹیوٹ کو ایک خاص مزاج عطا کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔'لغاتِ گجری' ان کی وہ واحد تصنیف ہے جو اس دوران منظرِ عام پر آئی۔

(مونوگراف سید نجیب اشرف ندوی، ص 93)

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے بعد نجیب اشرف ندوی نے سب سے پہلے انجمن کی لائبریری کو بہتر بنانے کی بھرپور سعی کی، انھیں کی محنتوں اور کوششوں سے بہت جلد یہ لائبریری تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک کارآمد لائبریری کا عمدہ نمونہ بن گئی۔ علاوہ ازیں متعدد طلبا کو تحقیق کے بنیادی اصول بھی سکھائے اور اس درجہ ان کی رہنمائی فرمائی کہ کئی اہم تحقیقی وتنقیدی مقالے معرضِ وجود میں آئے۔انھیں میں سے ایک مقالہ 'دبستانِ دبیر' ہے جسے ذاکر حسین فاروقی نے 1963 میں مکمل کیا۔نجیب اشرف ندوی کی رہنمائی میں ہی عبدالرزاق قریشی کی دو اہم تحقیقی کتابیں 'مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام' اور 'دیوانِ عزلت' منظر عام پر آئیں۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ دونوں کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

> **'لغات گجری'**
> (1962) **نجیب اشرف ندوی کا ایک اهم تحقیقی کارنامه هے۔ یه ایک نامعلوم مصنف کا لغت هے جسے انهوں نے انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے دوران ترتیب دیا تھا۔ هیئت کے اعتبار سے یه کتاب نصاب نامه قسم کی هے لیکن اسے اردو لغت نویسی کی پهلی کوشش کهه سکتے هیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یه هے که اس میں کوئی لفظ زائد یا بھرتی کے داخل نهیں کیے گئے هیں۔**

'لغات گجری' (1962) نجیب اشرف ندوی کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ ایک نامعلوم مصنف کا لغت ہے جسے انھوں نے انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے دوران ترتیب دیا تھا۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ کتاب نصاب نامہ قسم کی ہے لیکن اسے اردو لغت نویسی کی پہلی کوشش کہہ سکتے ہیں۔اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی لفظ زائد یا بھرتی کے داخل نہیں کیے گئے ہیں۔عہد جہانگیر میں ایک مخصوص شکل نصاب نامہ کی ابتدا 'خالق باری' سے ہوتی ہے۔اس کی زبان فارسی ہے اور اسے پہلا نصاب نامہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے لیکن اردو میں 'لغات گجری' کو لغت نویسی کا پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔اسے نجیب اشرف ندوی نے اپنی برسوں کی ریاضت اور مطالعے کے بعد مرتب کیا ہے۔اس پر انھوں نے ایک طویل اور جامع مقدمہ بھی لکھا جس کے سبب کتاب کی اہمیت مزید افزوں ہوگئی ہے۔مقدمہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل رہا ہے 'لغات گجری' پر نجیب اشرف ندوی کا فاضلانہ مقدمہ ان کی تحقیق وتدوین سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لسانیات کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر عبدالستار دلوی رقم طراز ہیں:

''اتفاق سے ندوی صاحب کو نصاب ناموں کے انداز پر لکھا ہوا ایک قدیم مخطوطہ دستیاب ہوا جو داخلی شہادتوں اور اپنی زبان اور بیان کی خصوصیات کی بنا پر گجرات کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ندوی صاحب علم لغت اور اس مخطوطے کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مخطوطہ نصاب نامہ سے کہیں زیادہ قدیم اردو (گجری) کا لغت ہے۔ چنانچہ کئی سالوں کی محنت کے بعد انھوں نے اس مخطوطے کے متن کو اپنے چند احباب کی مدد سے مرتب کیا اور ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا۔اس کتاب کی طباعت سے ہمیں پہلی مرتبہ قدیم اردو کا پہلا لغت ملا جسے اردو کے لسانیات ادب میں ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہے۔''

(بمبئی کی بزم علمیہ، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص 307)

نجیب اشرف ندوی نے کئی اہم کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔چونکہ ندوی کو اردو اور فارسی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے دارالمصنّفین سے وابستگی کے دوران تصنیف وترتیب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ کیا ہے:

1: History of Arabic literature (تاریخ ادب عربی)، مصنفہ: Clement Huart

ترجمے کے علاوہ انھوں نے اس پر تنقیدی حاشیے لکھے، غلط بیانات کی تصحیح کی اور اقتباسات اصل ماخذ سے دیے۔لیکن افسوس کہ یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔

2: Political System of British India (برطانوی ہند کا نظامِ سیاسی)، مصنفہ: E.A. Horne، یہ کتاب جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) کے بی۔اے کے نصاب میں داخل تھی۔

3: Home Rule (سوراج) مصنفہ گاندھی جی۔

4: A Guide of Health (رہنمائے صحت) مصنفہ گاندھی جی

علاوہ ازیں انھوں نے بڑی تعداد میں تاریخی و ادبی مقالات ومضامین بھی سپرد قلم کیے جو ہند و پاک کے مختلف علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ان میں بیشتر مضامین تاریخ اور ادب کے حوالے سے ہیں۔اِنھیں میں سے چند مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں 2013 میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے 'مقالاتِ پروفیسر نجیب اشرف ندوی' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ابتدائیہ اور مقدمہ کے علاوہ کل بیس مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

ممبئی میں اردو تحقیق کا سرا جب ہم تلاش کرتے ہیں تو نجیب اشرف ندوی سے قبل باضابطہ کوئی اردو تحقیق دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ممبئی کے اداروں اور کالجوں سے وابستگی کے دوران انھوں نے اس صنف ادب پر نہ صرف خصوصی توجہ کی بلکہ طلبہ اور محققین کو تحقیق کی رغبت بھی دلائی اور اس خوبی کے ساتھ اس صنف ادب کی طرف مائل کیا کہ ان کے اندر ذوق وشوق کے جذبے نے تحقیق کی راہ ہموار کردی اور ممبئی میں اردو تحقیق کا کارواں چل پڑا۔لہٰذا ممبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار نجیب اشرف ندوی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Mohammad Zubair
403, Rimsha Tower
Shibli Nagar, Mumbra
Thane-400612, Mumbai (MS)
Mob: 9022951081

مصحفی اور اس کا امروہپن

رئیس احمد فراہی

مصحفی کی تعلیم وتربیت اور عنفوان شباب تک کا زمانہ اپنے آبائی وطن امروہے میں ہی گزرا۔ پھر رہین ستم ہائے روزگار ہوکر دہلی، لکھنؤ، ٹانڈہ اور دیگر مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ دہلی سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ یہاں کے ادبی اور شعری ماحول سے انھیں گہری انسیت تھی۔ زبان دہلی کو وہ معتبر اور معیاری زبان سمجھتے تھے مگر کلام مصحفی کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان دہلی کے ساتھ ساتھ قصباتی، دیہاتی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں اور محاوروں کو بھی اپنے شعری سرمایے میں بے ساختہ کھپایا ہے۔

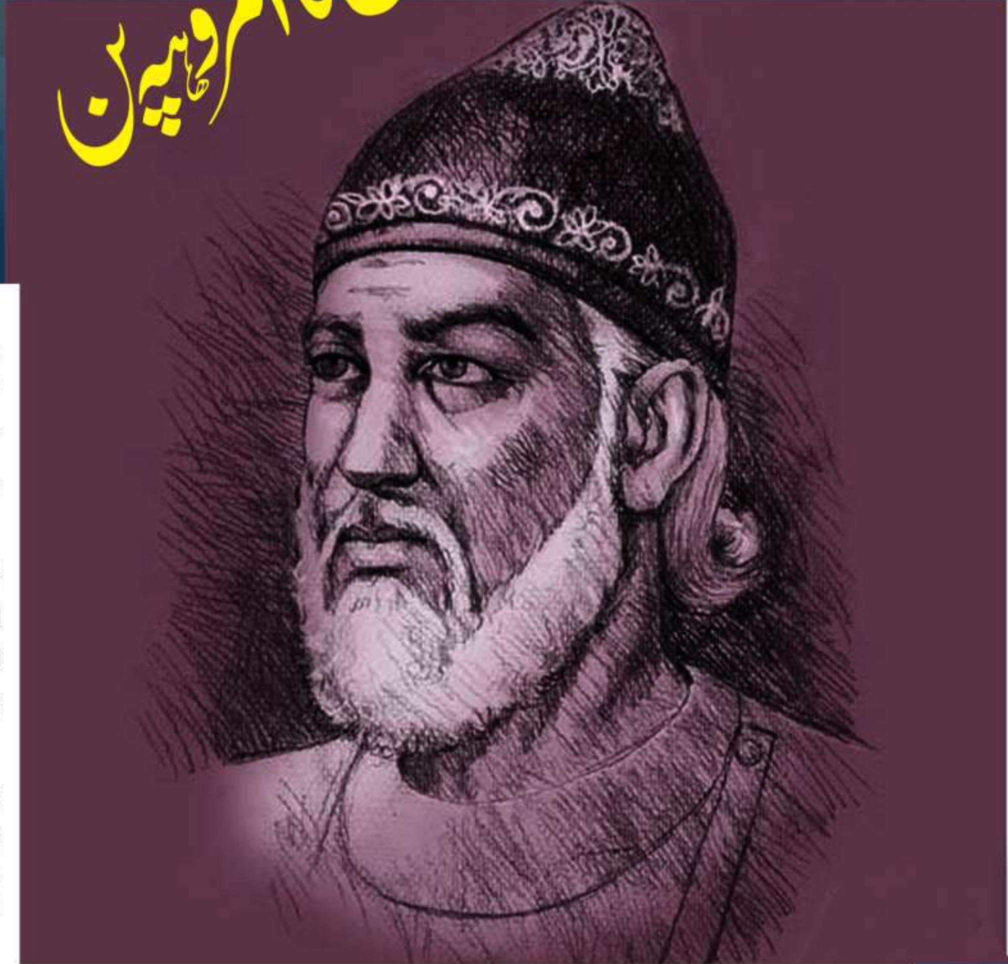

مصحفی کی تعلیم وتربیت اور عنفوان شباب تک کا زمانہ اپنے آبائی وطن امروہے میں ہی گزرا۔ پھر رہین ستم ہائے روزگار ہوکر دہلی، لکھنؤ، ٹانڈہ اور دیگر مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ دہلی سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ یہاں کے ادبی اور شعری ماحول سے انھیں گہری انسیت تھی۔ زبان دہلی کو وہ معتبر اور معیاری زبان سمجھتے تھے مگر کلام مصحفی کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان دہلی کے ساتھ ساتھ قصباتی، دیہاتی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں اور محاوروں کو بھی اپنے شعری سرمایے میں بے ساختہ کھپایا ہے۔ بلاشبہ بعض جگہ یہ الفاظ اپنی غرابت اور نامانوسی کی وجہ سے گرانی کا باعث بنتے ہیں لیکن اکثر جگہوں پر یہی ہندی اور عوامی زبان کے الفاظ اپنی سلاست و شستگی کی وجہ سے شعر کے حسن کو نکھارتے اور اردو کے دامن کو وسیع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مصحفی کی شاعری پر مولانا محمد حسین آزاد کا ایک بڑا اعتراض ان کے کلام میں علاقائی رنگ و آہنگ کا ہونا ہے۔ وہ مصحفی کی مشاقی، ہنرمندی اور استادی کا اعتراف تو کرتے ہیں مگر ان کے نزدیک مصحفی کا 'امروہہ پن' اس قدر قبیح چیز ہے کہ یہ ساری خوبیاں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''دیوان ان کی استادی کو مسلم الثبوت کرتے ہیں۔ انواع واقسام کی صدہا غزلیں ہیں۔ الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کرکے اس دروبست کے ساتھ کھپایا ہے کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہوگیا ہے، ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔'' مزید لکھتے ہیں:

''غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں اور بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر پھسر پھسر برابر کہتے چلے گئے ہیں اس کا سبب یا تو پرگوئی ہے یا دلی اور امروہہ کا فرق ہے۔''

دوسری جگہ انشا اور مصحفی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''سید انشا ہمیشہ قواعد کے رستے سے ترچھے ہوکر چلتے ہیں مگر وہ ان کا ترچھا پن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے یہ بھی (مصحفی) مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ وہ امروہہ پن نہیں جاتا۔''

ایک اور جگہ انشا اور مصحفی کی چشمک دکھاتے ہوئے مصحفی کے حوالے سے لکھتے ہیں ''وہ پرانا مشاق لکھنؤ بھر کا استاد کوئی چھوٹا آدمی نہ تھا۔ باوجود بڑھاپے کے بگڑ کھڑا ہوا اور یہ غزلیہ فخریہ کہی۔ اب خواہ اسے بڑھاپے کی سستی کہو، خواہ طبیعت کا امروہہ پن کہو، خواہ آئین متانت کی پابندی سمجھو۔''

محمد حسین آزاد نے جگہ جگہ 'امروہہ پن' کی پھبتی تو کسی ہے مگر اس امروہہ پن سے ان کی مراد کیا ہے واضح طور پر کہیں اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ جہاں جہاں بھی وہ مصحفی کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں ساتھ ہی امروہہ پن کا دم چھلہ لگا کر ان کی شعری خوبیوں کو حسن بے نمک کر

دیتے ہیں۔ اکثر جگہوں پر وہ جانب داری سے کام لیتے ہوئے عیوب کو بشکل خوبی یا ہنر کے تبدیل کر دیتے ہیں مثلاً سید انشا کا قواعد سے روگردانی کرنا اور ترچھے ہو کر چلنا بھی انھیں عجب بانکپن نظر آتا ہے یا یوں ہی استاد ذوق کا چیچک زدہ سانولا چہرہ چمکدار اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کی جانب داری اور رائے زنی اپنی جگہ درست سہی مگر مصحفی اور ان جیسے دیگر شعرا کی خوبیاں آزاد کے خود ساختہ امروہہ پن جیسے شگوفے میں ہوا ہو کر رہ گئی ہیں جو کہ ادبی دیانتداری کے منافی ہے۔ آزاد نے مصحفی کے بیان میں مندرجہ ذیل اشعار پر انگشت نمائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں۔

تیغ نے اس کی کلیجہ کھا لیا
اس نے آتے ہی مجھے سنگوا لیا

چمن میں چل کے کرے مصحفی تو نالہ و آہ
جو جی چلا ہو تیرا امتحان بلبل کو

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں نکل جاؤں گا
خوگر شہر ہوں یاں خاک میں رَل جاؤں گا

ان اشعار میں سنگوانا، جی چلنا اور رل جانا آزاد کو امروہہ کے محاورے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کو بنیاد بنا کر آزاد نے یہاں بھی اپنا امروہہ پن والا فقرہ چست کر دیا ہے مگر نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون 'مصحفی کی زبان' مشمولہ 'دراسات' میں ان الفاظ کو خالص دہلوی شعرا کے کلام سے ثابت کیا ہے اور اس پر مدلل و مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ کا امروہہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دیگر شعرا کے علاوہ خود آزاد کے ہمعصر دہلوی شعرا نے بھی ان الفاظ کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آزاد کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو۔

خیر، یہ اور اس جیسے الفاظ و محاورات عہد مصحفی اور ماقبل مصحفی میں رائج و مروج تھے جو عہد ناسخ میں منسوخ اور ٹکسال باہر ہوئے۔ چنانچہ ان کی باز پرس صرف مصحفی سے کرنا یا ان کو بنیاد بنا کر مصحفی کے مرتبے کو گھٹانا کہاں کا علمی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ ایمانداری اور دیانتداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ علاقائی رنگ و آہنگ والے الفاظ کی سبک روی، اشعار کے دروبست میں ان کے کھپانے کی ہنرمندی، ان کی غرابت کو دور کر کے اپنانے کا عمل اور انھیں داخل زبان کر کے زبان و بیان کو وسعت دینے کی کوششوں کو سراہا اور ان کی لطافت سے محظوظ ہوا جائے، نہ کہ ان کی جا و بیجا تنقیص کی جائے۔

آیئے اب کلام مصحفی میں پائی جانے والی امروہہ کی زبان اور محاورات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے اور شعری پیکر میں ان کے حسن و قبح اور دروبست پر بھی بات کی جائے تا کہ مصحفی کی فنی مہارت، لفظوں کے برتنے کے سلیقے اور عوامی یا علاقائی زبان کو بے ساختہ کھپا کر اس کی غرابت کو ختم کر دینے کی ہنرمندی کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ پہلے ہم ان چند الفاظ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مصحفی نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔

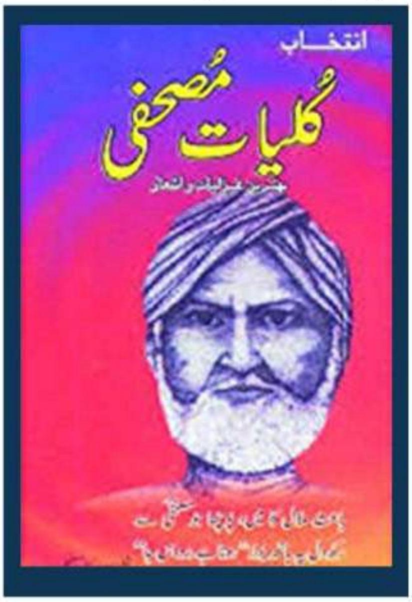

چل بہ چل، بَدّات (بد ذات)، گراں ڈیل، للاہٹ، اُداہٹ، سوندھا، توباہ (توبہ)، سُکنا، گھرسنا، لپیٹ سپیٹ، ڈلک، جھبک، چونا (ٹپکنا)، بسرنا، نگھرے، نیو، ٹکڑ گدا، پوٹ (پوٹلی)، پھٹ (دور ہونا)، بھجوانا، منجھیلے (کشاکش)، اپجنا، ورے اور پرے، ٹھٹھولیاں، چھلنا، نلوٹ، کھکھوڑے، منتر مارنا، دھرنا، رکھائیاں، بیچ دینا، دیوانہ، ٹل کر رہ جانا، چتون، مکھڑا، جھمکڑا، سجنا، کوٹھے (چھت)، رندھنا، کھپنا اور چاہیں نکلنا وغیرہ کے علاوہ محاورات وخیالات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جو مصحفی کے دواوین میں جا بہ جا نظر آتی اور اپنی شان وشوکت کی جلوہ گری دکھلاتی ہے۔ کلیات مصحفی جلد چہارم کے دیباچے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

''مصحفی کی شاعری کے رموز و علائم میں اور زبان وبیان میں امروہہ پوری طرح جھلک رہا ہے..... مصحفی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ امروہے کی زبان اور محاورے کے بہترین نمائندے ہیں۔ عوامی اردو کی مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتیں۔ ان کی زبان اور علامتوں میں طبقہ متوسط کی قصباتی زندگی اور روزمرہ کی جو تصویر مصحفی کے کلام میں ملتی ہے وہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔''

آیئے اب اشعار کے حوالے سے مصحفی کے علاقائی رنگ، امروہہ پن اور ان کی خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

دیکھ کے رنگ حنا ہاتھ پہ تیرے قاتل
رشک کے مارے لہو پنجہ مژگاں سے چوا

اس شعر میں مصحفی نے جو خیال باندھا ہے اس کی خوبصورتی سے زیادہ الفاظ کا انتخاب اس شعر کے حسن کی دوشیزگی کا سبب ہے کہ قاتل (محبوب) کے ہاتھ پر رنگ حنا کو دیکھ کر عاشق کا لہو رشک کے مارے پنجہ مژگاں سے چو گیا۔ محبوب کو قاتل کہنا ایک طرف پیار محبت کا اظہار اور قربت کا احساس ہے تو دوسری طرف قاتل کا تعلق اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں پنجہ مژگاں سے لہو کے چونے سے بھی جڑ جاتا ہے۔ یہاں قاتل، رشک، لہو، حنا، ہاتھ اور پنجہ مژگاں کی رعایت بھی قابل دید ہے۔ ان ساری خوبیوں کے علاوہ ایک عوامی لفظ 'چوا' اس پورے شعری پیکر میں چار چاند لگا رہا ہے۔ اگر اس 'چوا' کی جگہ 'گرا' لفظ استعمال کریں تو مفہوم ادا ہو جائے گا مگر اس کا صوتی اور پیکری دونوں حسن تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح لفظ ٹپکنا چونے کا مترادف تو ہو سکتا ہے مگر اس شعر میں اس کا متبادل نہیں ہو سکتا کیونکہ جو فصاحت و بلاغت اور پیکر چونے میں ہے وہ بھی خصوصاً خون کے، وہ گرنے اور ٹپکنے میں ناپید ہے۔ گویا یہ عوامی یا ہندی لفظ اس شعر کی شعریت کو مجروح کرنے کے بجائے اس کے حسن کو دوبالا کر رہا ہے۔ یہاں اس سے بہتر لفظ کا انتخاب ممکن نہیں تھا۔ دوسرا شعر دیکھیے۔

گورے بدن کا عالم اس کے میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا تھا پیراہن کے اندر

اس شعر میں پیکر تراشی کا ایک بہترین آرٹ پیش کیا گیا ہے۔ بصری پیکر یا تصویر کا حسن اس بات میں ہے کہ اس میں کچھ ابہام ہو۔ سب کچھ واضح اور عیاں نہ ہو بلکہ حسن خود ہی اپنا پردہ ہو جائے اور پھر وہ تصور کی آنکھ کو وا کرنے کا متقاضی ہو۔ یہاں مصحفی نے ایک ہندی یا عوامی اور متروک الاستعمال لفظ جھمکڑا سے محبوب کے حسن کی جلوہ گری کی ہے کہ اس کے گورے بدن کا عالم اور اس کی کیفیت تو میں نے رات دیکھی کہ وہ سراپا اک نور کا جھمکڑا تھا۔ رات اور نور کے تضاد سے حسن میں اضافہ کیا اور گورے بدن کے عالم سے اک نور کا جھمکڑا تیار کیا ہے جو پیراہن کے اندر جلوہ گر تھا۔ گویا اس تصویری کائنات میں نور کا جھمکڑا ہی خاص اہمیت کا حامل ہے جو اپنے اندر ابہام بھی رکھتا ہے اور حسن بھی۔ معنوی وسعت بھی رکھتا ہے اور خوش کن پیکر بھی۔ شاید کہ جھمکڑے کی جگہ دوسرا لفظ

شعری حسن اور روانی کو برقرار رکھنے میں اتنا موثر کردار ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اسی مفہوم، انداز اور روایت کا ایک دوسرا شعر دیکھیے جس میں مصحفی نے تقریباً یہی اسلوب اپنایا ہے۔ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس قبا میں بدن ہے یا کیا ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں، میں نے تو بس شعلہ سا کچھ جھمکتا ہوا دیکھا ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔

یہ جانتے نہیں ہم اس میں بدن ہے کیا ہے
شعلہ سا اک جھمکتا زیرقبا ہے دیکھا

اس شعر کا تمام دارومدار اس تشبیہی پیکر پر ہے جس میں زیر قبا شعلے کے مانند جھمکتا ہوا بدن قابل دید ہے۔ جھمکنے میں جلوہ دینے اور حسن کی بہاریں دکھلانے کا جو مفہوم پنہاں ہے وہ چمکنے اور دمکنے میں بہرصورت ادا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لفظ کو میر تقی میر نے بھی استعمال کیا ہے۔

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

ایک اور شعر دیکھیے۔

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہہ میں
سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہہ میں

یہاں بھی پیرہن کی تہہ میں یا زیرقبا اس کے بدن کی ڈلک یوں ہے جیسے کہ بدن کی سرخی پیرہن میں نہیں بلکہ بدن کی تہہ میں جھلک رہی ہے۔ یہاں بھی تشبیہی عناصر اور لفظوں کے رعایتی نظام سے مصوری کی گئی ہے۔ اس میں سارے لفظ تو عام ہیں مگر ایک لفظ 'ڈلک' عامیانہ ہے جو بدن کے ترکیبی عناصر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ ڈلک سونے اور کندن وغیرہ کی چمک دمک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مصحفی نے یہاں محبوب کے بدن کے لیے استعمال کیا ہے جو محبوب کی رنگت، نزاکت اور چمک دمک کا بھی احساس دلاتا ہے۔ اس لفظ کا ذکر کرتے ہوئے سید حامد صاحب دیوان مصحفی جلد پنجم کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''ڈلک کا لفظ فریاد کررہا ہے کہ میرے جیسے نامعلوم کتنے حسین پر احساس اور معنی آفریں الفاظ لطافت اور طہارت کے نشے میں اردو شاعری کی زبان سے نکال دیے گئے۔''

علاقائی رنگ و آہنگ کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

تو گیا پیارے سفر کو چھوڑ کر میرے تئیں
رفتہ رفتہ میں ترے جی سے بسر کر رہ گیا
خوبی جواب دینے کی ٹک اس کے دیکھیو
گر میں پکارتا ہوں تو کہتا ہے مجھ کو پھوٹ
ہیں اس گلی میں حسن کے تودے لگے ہوئے
خورشید و ماہ لے کے گئے باندھ باندھ پوٹ
مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں جی سے بسر کر رہ گیا، پھوٹ، پوٹ اور نگھرے وغیرہ عوامی یا علاقائی بولیوں میں سے ہیں۔ مصحفی نے جن کو اپنے شعروں میں کھپا کر شعروں کو زینت اور لفظوں کو عزت بخشی ہے۔ جی سے بسر کر رہ گیا میں ہجر کی جو کیفیت، کسک اور بے ساختگی ہے وہ شعر کی سادگی کے باوجود اس کے حسن کو بڑھاتی اور کیفیت و تاثر نیز معنی کی پرتوں کو وا کرتی ہے۔

دوسرے شعر میں کہا کہ محبوب کے جواب دینے کی خوبی یہ ہے کہ اس کو پکارو تو کہتا ہے پھوٹ یعنی پھوٹ لے یا بھاگ لے۔ بالکل ہی عوامی اور علاقائی زبان کا لفظ ہے اور مصحفی نے اس لفظ کے ذریعے محبوب کے جواب دینے کی یہی خوبی بتائی ہے کہ وہ کہتا ہے پھوٹ۔ اس لفظ سے محبوب کی بے تکلفی، اس کا چلبلا پن اور اس کی شوخی ادا کے ساتھ قربت سب کچھ مترشح ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک لفظ کے ساتھ ساتھ اس پوری کیفیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

تیسرے شعر میں محبوب کی گلی میں حسن کے تودے لگے ہوئے ہیں اور یہیں سے خورشید و ماہ لے کے گئے باندھ باندھ پوٹ۔ پوٹ بمعنی پوٹلی یا گٹھری کے ہیں۔ مصحفی نے یہاں صفت مقلوب سے کام لے کے دوسرے مصرعے کے عامیانہ پن سے بات پیدا کی ہے۔ اس کا محبوب اس قدر روشن جبیں اور پرنور ہے کہ اس کے وجود سے اس کی گلی تک منور ہوگئی ہے اور گویا حسن کے تودے لگ گئے ہیں نیز خورشید و ماہ جو خود نور کے منبع ہیں وہ بھی یہیں سے پوٹلی یا گٹھری باندھ باندھ کے لے گئے اور اس سے اپنی روشنی کا سامان پیدا کیا ہے۔ یہاں پوٹ اور خورشید کی رعایت و مناسبت دو وجہوں سے ثابت ہے۔ ایک تو خورشید و ماہ اور پوٹ کی گولائی و مدوری شکل۔ دوسرے خورشید اور ماہ دونوں انسانی ناموں سے متصف ہیں گویا انسان ہیں یعنی حسن کے تودے اور خورشید و ماہ دونوں کو تجسیمی پیکر ادا کرکے انھیں انسانوں کی طرح پوٹ باندھ باندھ کر لے جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ خورشید و ماہ لے گئے کی بجائے خورشید و ماہ 'لے کے' گئے باندھ باندھ پوٹ کہا ہے جس سے لہجے کا بھی عامیانہ پن ظاہر ہے۔ اس شعر میں تجسیمی پیکر، بصری پیکر، حسی پیکر اور رعایتی التزام کے علاوہ پوٹ جیسے علاقائی الفاظ نے شعر کے حسن کو چار چاند لگانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

چوتھے شعر میں محبوب کے گھر کے آگے ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں میں ایک لفظ 'گھر' سے شعر سازی کی گئی ہے کہ محبوب کے پاس تو گھر ہے اور وہ آرام سے اس میں جلوہ فرما ہے اور یہاں اس کے عشق میں یہ عالم ہے کہ خانہ خراب ہوکر اس کے گھر کے آگے نگھرے (بے گھر) بیٹھے ہیں۔ محبوب کے گھر کے آگے نگھرے بیٹھنے میں بھی دو لطیف اشارے پوشیدہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ محبوب کے پاس گھر ہے اور ہمارے پاس گھر نہیں ہے اس لیے اس کے گھر کے سایے میں بیٹھے ہیں کہ کہیں اور ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ محبوب کی بدولت ہم خانہ خراب اور

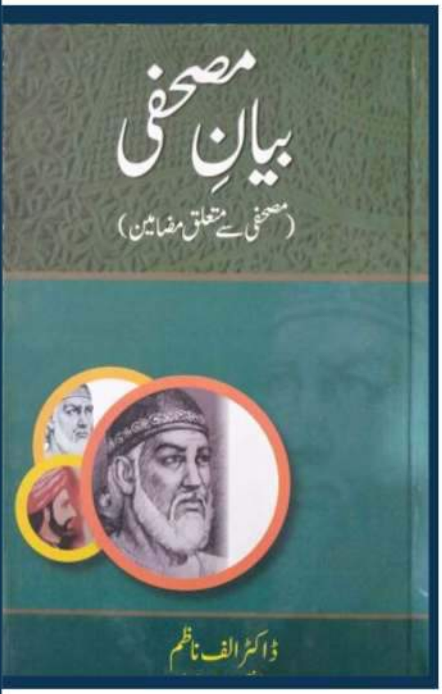

نگھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم انتقاماً اس کے گھر کے آگے بیٹھے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے گھر میں جگہ دے یا کم از کم ہماری طرف نگہ التفات کرے۔ اس شعر میں 'نگھرے' ہی ایک کلیدی لفظ ہے۔ اگر اس ایک لفظ کو ہٹا دیا جائے تو شعر میں کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ مصحفی نے گویا ہندی یا عوامی لفظ نگھرے لا کر گھر سے اس کا تعلق اور تضاد بھی قائم کردیا ہے اور دو ہم صوت الفاظ یکجا ہوجانے کی وجہ سے صوتی سبک روی اور معنوی جہتیں بھی پیدا ہوگئی ہیں گویا یہ لفظ اردو زبان کا نہ ہونے کے باوجود اس طرح سے شعر میں شیر و شکر ہوگیا ہے کہ اس سے شعر کے حسن اور معنوی جہات میں اضافہ ہوا ہے نہ کہ قبح یا گرانی میں۔ یہی ایک بڑے شاعر کی فنکاری اور مرصع سازی کا کمال ہے۔

■

Raees Ahmad Farahi
Room No.: 237, Periyar Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:8802252580

ارشاد قمر

اردو تنقید کے نقوش

اردو میں تنقید کی شروعات تذکروں سے کی جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں خواندہ حضرات خصوصاً وہ لوگ جو شعر و ادب کا مذاق رکھتے تھے، اپنے پسندیدہ کلام کا انتخاب بیاضوں کی شکل میں رکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان بیاضوں میں شاعر کے نام کے ساتھ چند تعارفی جملے لکھنے کا رواج ہوا۔ کبھی کبھار کوئی مختصر سی رائے کا بھی اظہار یا اعتراض کیا جاتا تو وہ فن اور زبان کی حد تک ہوتا تھا۔ شعرائے اردو کے جو تذکرے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں میر تقی میر کا تذکرہ 'نکات الشعرا' تقدم زمانی کی حیثیت سے محققین اور نقاد کے مابین اپنی منفرد شناخت بنائے ہوئے ہے۔ اس میں میر نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر بعض شاعروں پر کچھ فقرے کس دیے ہیں جسے باضابطہ تنقید کہنا تو مناسب نہیں ہے لیکن اتنا ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ ان تذکرہ نگاروں کے مدنظر فن کا احترام رہا ہے۔ انھوں نے شعر کے ظاہری محاسن و معائب، محاورے کی درستگی، الفاظ تازہ کی تلاش، زبان کے استعمال اور فن کی نوک پلک پر توجہ کی۔ میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' سے شیفتہ کے 'گلشن بے خار' تک یہی روایت ملتی ہے۔ عہد وسطی کے تذکرہ نگاروں میں مصحفی نمایاں ہیں جنھوں نے شعرا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اصولوں کی پیروی کی ہے۔

ان تذکروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کی رائے اپنی پسند ناپسند کی حد تک نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ کچھ مسلمہ اصول و ضوابط کے پابند تھے۔ یعنی عروضیوں نے شعر موزوں کرنے کے لیے کچھ اوزان اور اصول بنا دیے ہیں۔ کسی شاعر کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ایک معمولی سے حرف کے سقوط یا سکتے کو بھی جائز رکھ سکے۔ اسی طرح اہل زبان نے محاورہ و زبان کے جو قواعد بنا دیے ہیں ان میں تصرف کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی بنیاد پر تذکرہ نگار مدح و تحسین یا تنقید و تنقیص کرتے تھے اور ان اصولوں کا احترام کرنے والا ہی پورا اور مکمل شاعر سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ تذکرے جس طرح تاریخی و سوانحی اعتبار سے کمزور اور مبہم تھے اسی طرح انتقادی بصیرت بھی ان میں کم ملتی ہے۔ دورِ آخر میں جو تذکرے لکھے گئے جیسے کریم الدین کا تذکرہ طبقات الشعرا یا محمد حسین آزاد کا آب حیات وغیرہ۔ ان میں شاعر کے حالات تاریخی اعتبار سے مفصل و مبسوط پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن تنقید کا فقدان یہاں بھی اسی تناسب سے رہا۔ جس تناسب سے گزشتہ تذکروں میں تھا بلکہ عصبیت میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ حالی پہلے باضابطہ نقاد ہیں۔ ان کا 'مقدمہ شعر و شاعری' اس سلسلے کی پہلی کوشش سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حالی مغربی فکر سے متاثر تھے اور اپنے عہد میں سب سے زیادہ سیاسی اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے ادب اور زندگی کے رشتے کو دریافت کرنے کی ایک شعوری کوشش کی۔ دراصل حالی نے ادب میں افادیت اور مقصدیت پر زور دیا تھا اور بتانا یہ چاہتے تھے کہ اردو میں شاعری غزل تک محدود ہو گئی ہے۔ غزل عاشقانہ مضامین تک اور عاشقانہ مضامین ابتذال تک پہنچ گئے ہیں۔ عاشق کی بے کسی، درماندگی، شکستہ حالی، پریشان خاطری، مظلومیت اور افتادگی کے ساتھ محبوب کی سفاکی، بے دردی، ایذا رسانی اور اس کے خد و خال کا شاعرانہ مبالغے کے ساتھ بیان یا رموز و علائم میں گلشن، قفس، صیاد، بلبل، صہبا، غنچہ، خزاں، بہار، طوفان، دریا، کشتی وغیرہ چند گنے چنے مضامین ہیں جن پر عام طریقے سے طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے۔ اس طرح کی شاعری بیشتر قافیے کی تحریک سے ہوتی ہے۔ مثلاً مصرعہ طرح اگر رکھا جائے۔

کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

تو لامحالہ شاعر کے ذہن میں پہلے قوافی ہی آئیں گے۔ بیقرار، نو بہار، دل بہار، یار، مار، تار وغیرہ اور ان قوافی کی مدد سے مضمون منظر عام پر آئے گا۔ ایسی شاعری واقعیت اور صداقت سے دور ہوگی۔ جس ماحول کا ہم نے مشاہدہ نہیں کیا اس کی عکاسی کیسے کر سکتے ہیں۔ جو جذبہ ہمارے اوپر طاری نہیں ہوا اس کا اظہار کس طرح ہو سکتا ہے اور بغیر فکر و تعمق کے نئی بات جو دل سے نکل کر دل میں سما جائے کس طرح کہی جا سکتی ہے۔ حالی کا اعتراض صحیح تھا۔ معمولی سی مثال یہ ہے کہ ولی دکنی سے اصغر اور جگر وغیرہ تک شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے بلبل اور طوفان، موج و دریا، سنبل و نرگس کا ذکر اپنے اشعار میں نہ کیا ہو اور ان علامتوں کے نئے نئے مضمون نہ تراشے ہوں۔ لیکن ان ہزاروں، لاکھوں شاعروں میں دس فیصدی بھی ایسے نہ ملیں گے جنھوں نے کبھی بلبل دیکھا ہو۔ طوفان میں پھنسنے کا تجربہ کیا ہو، دریائی سفر سے واقفیت رکھتے ہوں یا نرگس و سنبل کا مشاہدہ کر چکے ہوں۔

میں نے ابھی کہا کہ حالی کے اعتراضات صحیح تھے لیکن ان کے بعد ان کی تفسیر وتشریح میں غلط تاویل سے کام لیا گیا اور وہ مقصد پورا نہیں ہوا جو مقدمہ لکھتے وقت حالی کے پیش نظر تھا۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ حالی نے اردو شاعروں کی روایت پرستی کے خلاف جو آواز اٹھائی اور تنقید کے لیے جن اصولوں کی طرف اشارے کیے ان پر خود حالی ہی کاربند نہیں تھے۔ ان کے دیوان میں ستر فیصدی سے زیادہ اشعار ایسے ہیں جو قدیم روایات کے زیر اثر لکھے گئے ہیں اور ان کے مقالات میں ننانوے فیصدی وہ ہیں جن پر تنقید کے اصول وضوابط کی گرفت نہیں ہے۔

حالی نے شاعری کے قدیم اوضاع و اطوار پر اتنی سخت تنقید کی۔ غزل کو ہدف مطعون بنایا۔ اردو شاعری کے عاشق و معشوق کا مضحکہ خیز کارٹون پیش کیا اور صداقت کو شاعری کی روح بتانے میں بعض روایات کے محاسن سے آنکھیں بند کرلیں تو اس میں تعجب کا مقام نہیں ہے۔ دراصل حالی نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ان کی آواز کارگر ثابت ہوئی اور وہ ادب میں جس انقلاب کے متمنی یا داعی تھے وہ رفتہ رفتہ آ گیا۔

حالی کے ہم عصروں میں اور کوئی نہ تھا جو ہندوستان کی تشکیل نو کا اتنا شدید احساس رکھتا ہو۔ ایک شبلی تھے جن کے دل میں اپنی قوم کو طاقت ور، ذہنی اعتبار سے توانا اور فکری اعتبار سے صحت مند دیکھنے کی آرزو تھی۔ وطنیت اور قومیت کا تصور بھی تھا مگر وہ عظمت پارینہ کے احساس سے ایک لمحہ کے لیے دامن نہیں چھڑا سکتے تھے اور مشرقی تہذیب سے ذرا سا نیچے اتر کر بھی کسی دوسرے تصور سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔

شبلی خود اردو کے شاعر تھے۔ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ تاریخی شعور جتنا ان میں تھا حالی میں نہیں تھا۔ لیکن وہ زندانِ روایت سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ تاریخ میں بھی ان کے ذہن کی افتاد انھیں ہیرو پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ حالی و شبلی میں ذہنی مماثلت اتنی نہیں جتنی بیک نظر محسوس ہوتی ہے۔ اگر تفصیل سے دیکھا اور تجزیہ کیا جائے تو دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ لیکن اردو میں تنقید کی ضرورت کا احساس ہمیں انھیں دونوں بزرگوں کے کارناموں سے ہوتا ہے۔ حالی کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اس پر غور کیا گیا، اس کی تائید بھی ہوئی اور مخالفت بھی۔ بحث کے لیے ایک دروازہ کھل گیا جو آج تک بند نہیں ہوا۔ حالی نے جن باتوں کی طرف اشارے کیے تھے وہ اس لیے تھے کہ دیگراں آیند و کارے ہم کنند۔ انھوں نے ایک اسکول بنا دیا جس نے ادب اور اس کے مسائل پر نئے انداز سے سوچا۔ لیکن یہ لوگ بھی افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ حالی نے مغرب سے خوشہ چینی کی تھی۔ انھوں نے مغرب کی تقلید کو فرض بنا لیا۔ حالی نے ادب میں صداقت اور افادیت پر زور دیا۔ انھوں نے سارے ادبی سرمائے کو اندھا دھند مطعون کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ بعض اردو کے نقادوں کی تحریریں مغرب کے مستعار خیالات سے اتنی بوجھل ہو گئیں کہ ان کی تحریروں میں تخلیقی فکر کا مطلق پتہ نہیں۔

حالی کے بعد آنے والے نقادوں میں جو لوگ مغربی علوم اور ادبیات کے حامی یا مداح تھے ان کے دو طبقے تھے۔ ایک وہ جس نے واقعی انگریزی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور تنقید کو جو یورپ میں کئی صدیوں سے ترقی کے قدم بڑھا رہی تھی۔ ایک تھیوری کی شکل میں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ان کی سادگی تھی کہ انگریزی نقد کا مقابلہ وموازنہ اردو سے شروع کر دیا۔ کیوں کہ انگریزی میں تو تنقید باضابطہ فن کی حیثیت سے غور وفکر کا موضوع رہی ہے۔ وہاں عملی اور نظری تنقید کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر خوب غور وفکر نہ کیا گیا ہو۔ یہاں لے دے کے حالی ہیں اور ان کا بھی ایک مقدمہ جسے جدید شاعری کے جواز کا فتویٰ کہنا شاید مناسب ہوگا۔ حالی کے بعد پھر ایسا کوئی بالغ النظر اٹھا بھی نہیں جو ان مسائل پر سنجیدگی سے سوچتا۔ دوسرے طبقے نے اردو کو مالا مال کرنے کا یہ نسخہ اختیار کیا کہ انگریزی شعرا سے موازنہ کریں۔ انگریزی افکار کو اردو میں ترجمہ کریں۔ وہاں سے اقتباسات لیں اور ان شعرا پر ایسے قطعی اور فیصلہ کن انداز میں گفتگو کریں جیسے انگریزی اور اردو ادب کے تمام پہلو آپس میں بے حد مماثل اور متوازن ہیں۔ حالانکہ دونوں زبانوں کی ساخت، مزاج اور ضروریات میں بُعدِ مشرقین واقع ہوا ہے۔

جو لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو گئے انھیں تو جانے دیجیے لیکن قدیم وجدید کے بین بین چلنے والوں نے حالی کی نمائندگی کسی حد تک کی۔ ان میں بھی سب سے زیادہ کامیابی مولوی عبدالحق کو ہوئی۔ مولوی عبدالحق اگرچہ اصولی طور پر ایک نقاد نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت زبان کے ایک عالم اور سربراہ کی سی ہے۔ نہ انھوں نے کوئی اجتہادی راستہ اپنے لیے نکالا ہے، لیکن وہ قدیم وجدید کے درمیان ایک مرکز مفاہمت یا نقطہ اتصال ضرور بن گئے ہیں۔ انھوں نے ادب کو اختلافات کی زد سے بچا کر تعمیر کے راستے پر ڈال دیا۔

مگر 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تنظیم کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے بہت سے مسائل پر غور کیا اور بہت سے مسائل پیدا کر دیے۔ یہ اب تک کسی نے نہیں سوچا تھا کہ مواد اور ہیئت بھی کبھی باہم متصادم ہو سکتے ہیں یا فن کے اصول وقواعد ثانوی درجے میں آسکتے ہیں یا ہنگامی مسائل کی ترجمانی کا نام ادب ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد ایک عجیب سا ہنگامہ اور ہماہمی نظر آنے لگی۔ نئے نئے مسائل پر لکھنے لگے۔ کسی نے کہا کہ ادب میں حقیقت نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ ادب ہی نہیں جو زندگی کا آئینہ نہ ہو جس میں مصنوعی جذبات اور غیر حقیقی احساسات ہوں جو دور از کار تشبیہوں کے خارزار میں الجھا ہوا ہے۔ اس لیے ان لکھنے والوں نے حقیقت کی ترجمانی شروع کی۔ قدیم شعرا کے نزدیک حقیقت اور مجاز کے تصورات بالکل ہی دوسرے مفہوم میں تھے۔

> **حالی نے شاعری کے قدیم اوضاع و اطوار پر اتنی سخت تنقید کی۔ غزل کو ہدف مطعون بنایا۔ اردو شاعری کے عاشق و معشوق کا مضحکہ خیز کارٹون پیش کیا اور صداقت کو شاعری کی روح بتانے میں بعض روایات کے محاسن سے آنکھیں بند کرلیں تو اس میں تعجب کا مقام نہیں ہے۔ دراصل حالی نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ان کی آواز کارگر ثابت ہوئی اور وہ ادب میں جس انقلاب کے متمنی یا داعی تھے وہ رفتہ رفتہ آگیا۔**

یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے شباب اور عروج کا تھا جو 1936 سے شروع ہوا اور 1950 تک رہا۔ اس میں سب سے بلند آہنگ وہ نقاد تھے جو مارکس کے فلسفۂ جدلیات کو بنیادی حیثیت دیتے تھے۔ ادب کا یہ تعلق زندگی سے اتنا گہرا ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنے خارجی ماحول سے اپنے رشتے ہموار رکھے اور ایسا ادب تخلیق کرے جس سے زندگی کو براہ راست فائدہ پہنچتا ہو۔

اگر یہ صحیح ہے کہ ادب اپنے ماحول کی پیداوار ہے اور سماجی عوامل فن کار کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں تو میر، درد، مومن، غالب، ناسخ، آتش، رند، صبا، وزیر، امانت وغیرہ کی شاعری پر چھاپ ان کے تاریخی ماحول اور خارجی دنیا کے محرکات کی ہوگی۔ جدید افکار کا جب اس دور میں وجود ہی نہیں تھا تو میر پر یہ الزام کیوں عائد کیا جائے کہ وہ عطار کے لونڈے سے دوا لیتے تھے۔ قدیم و

جدید کی آویزش نے بہت نقصان پہنچایا۔ اس نے شاعری سے جمالیات کا زیور چھین لیا۔ اس نے شاعر کے قلب کو ٹھنڈا کر کے اس کی زبان کو گرم کر دیا۔ اس نے قدیم کے سارے سرمائے کو بے وقعت بنا دیا اور قدیم شاعری کے فنی اصول و اوضاع، قواعد وضوابط کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اسی سے کچھ لوگوں کو حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ غزل کی مخالفت اور آزاد شاعری کی حمایت کرنے لگے۔ لیکن یہ آزاد شاعری اس طرح نہیں پنپ سکتی تھی کہ غزل سے مطلق انکار کر دیا جائے۔

اس بات پر لکھنے والوں کا اجماع ہے کہ ادب میں صداقت بھی ہونی چاہیے، افادیت بھی، حقیقت اور واقعیت بھی۔ گزشتہ صدیوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کے لکھنے والوں نے ادب برائے زندگی کے نظریے کو قبول کرتے ہوئے اپنے فن پاروں میں پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود دور حاضر کے ادب میں وہ روح نہیں ہے جس کا متقاضی ادب ہے۔ ایک نظم یا افسانے کی عمر مہینہ دو مہینہ ہوتی ہے۔ ایک ناول سال بھر زندہ رہتا ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ ادب کے باقی رہنے یا فنا ہو جانے کا فیصلہ زمانے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جب شام وسحر کی گردشوں کے تھپیڑے سہہ کر بھی فن زندہ رہ جاتا ہے تو اس کی تب وتاب بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے آج جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے اس کی زندگی کا فیصلہ آنے والا دور کرے گا۔

لیکن یہ کلیہ بھی غلط ہے کہ اگر ادب کی زندگی کا فیصلہ زمانہ کرے گا تو اس کی افادیت، صداقت اور واقعیت کا تصفیہ بھی مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آج فن کار سے ایسے مطالبے کرنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر یہ کہ اگر خود فن کار کا عہد اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا تو میر اپنے عہد میں مسلمہ طور پر میر مجلس کیسے تسلیم کر لیے گئے۔ خان آرزو کے 'مجمع النفائس' سے لے کر' آب حیات' تک اور آب حیات سے آج تک کسی نے یہ نہیں لکھا کہ میر دوسرے درجے کا شاعر ہے۔ درآں حالیکہ جس وقت خان آرزو 'مجمع النفائس' لکھ رہے تھے میر کی عمر 28-29 سال اور ان کی شاعری کی عمر صرف 12 سال کی تھی۔ اسی طرح اس عہد میں اقبال وغیرہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ صرف زمانے کا گزر جانا ادب کی قسمت متعین نہیں کر سکتا۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ ہر نسل فن کے بارے میں ایک سا میلان اور مذاق نہیں رکھتی۔ ہر انسان کی طرح ہر نسل بھی جداگانہ ذوق کی مالک ہوتی ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور اپنے معیار محاسن و معائب ہوتے ہیں اور استفادے کا طریقہ بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ اس پر بہت سی شہادتیں دی جا سکتی ہیں۔ پھر ہم ادب کو اپنی ہی نسل اور زمانے تک کیوں محدود رکھیں۔

چونکہ ہمارے لکھنے والے ایک عرصے تک نقادوں کے رحم و کرم پر رہے ہیں اس لیے وہ اپنی تخلیقی فکر کو سنوارنے کے بجائے یہ دیکھنے لگے ہیں کہ نقاد کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ غالب، حالی، سرشار، اکبر، اقبال، چکبست وغیرہ کے زمانے تک نہ اتنی ریل پیل نقادوں کی تھی، نہ اتنے مختلف اصول نقد تھے نہ لکھنے والوں اور نقادوں میں کوئی رشتہ فرق مراتب کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ اس لیے وہ سوچنے میں ہم سے زیادہ آزاد تھے۔ آج نقاد کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے تخلیق کی کون سی خدمت انجام دی ہے؟ کیا انھوں نے ادیبوں کے ذہنوں سے ابہام دور کر دیا ہے؟ کیا انھوں نے کوئی واضح راستہ فکری سفر کے لیے تیار کر دیا ہے۔ انھوں نے کسی دوسرے درجے کی تخلیق میں چار چاند لگا کر اسے شکنتلا، دیوان غالب یا باغ و بہار کے رتبے کو پہنچا دیا؟

نقاد صرف محاسن و معائب بیان کرتا ہے تو یہ کچھ بڑی بات نہیں۔ ذوق سلیم خود اس کا تصفیہ کر لیتا ہے۔ جس بات کو میں پسند کرتا ہوں۔ دوسرا شخص اسی کو ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا یہ نقاد کا کوئی غیر معمولی کارنامہ نہیں کہ وہ کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ صادر کر دے۔ نقاد اگر مطالبے کرتا ہے تو یہ بھی احمقانہ بات ہے اگر لکھنے والا مر چکا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ پھر زندہ ہو کر اپنے تمام پچھلے نوشتوں کو دریا برد کرے اور نئے سرے سے ہدایت ناموں کے مطابق تخلیق کرے اور اگر زندہ ہے تو وہ نقاد کے ذہن سے نہیں سوچتا۔ بلکہ اپنے ذہن سے سوچتا ہے، اپنے الفاظ میں اور اپنے قلم سے لکھتا ہے۔

اب رہا افادیت کا معاملہ تو ہر شاعر کا یہ فرض نہیں کہ طبیب بن جائے۔ یا فلسفے کی موشگافیاں کرے یا دولت مند بننے کے لیے آسان نسخے یا عقل بڑھانے کی ترکیبیں ایجاد کرے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے پاس ایک پیغام ہو۔ اگر ہر شاعر پیغام دینے لگے تو دنیا میں صرف پیغام اور پیغام بر ہی رہ جائیں گے۔ رہا اس کا دوسرا پہلو تو بڑا اچھا اور زندہ جاوید شاعر تو اس زمانے میں بھی ہوا ہے جب کوئی نقاد نہیں تھا، آج بھی پیدا ہوگا اور مستقبل بھی بانجھ نہیں ہے۔

پھر نقاد کیا کرتے ہیں؟ صرف تشریح و توضیح۔

اگر ادب کی زندگی کا فیصلہ زمانہ کرے گا تو اس کی افادیت، صداقت اور واقعیت کا تصفیہ بھی مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آج فن کار سے ایسے مطالبے کرنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر یہ کہ اگر خود فن کار کا عھد اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نھیں کر سکتا تو میر اپنے عھد میں مسلمہ طور پر میر مجلس کیسے تسلیم کر لیے گئے۔ خان آرزو کے مجمع النفائس سے لے کر آب حیات تک اور آب حیات سے آج تک کسی نے یہ نھیں لکھا کہ میر دوسرے درجے کا شاعر ھے۔

مقدمہ نگاری، تعارف وغیرہ۔ نقاد صحیح معنوں میں وہ شخص ہو سکتا ہے جو عام انسانوں سے بلکہ فن کار سے بھی ذہنی سطح سے بہت بلند ہو۔ علوم حاضرہ میں پوری بصیرت رکھتا ہو۔ غیر جانبدار ہو۔ مذاق سلیم اور ذہن رسا کا مالک ہو۔ اصول وقواعد سے نہ صرف باخبر ہو بلکہ ان پر عامل بھی ہو، ماضی کے تمام سرمائے کا اسے اچھی طرح علم ہو۔ حال کی رفتار پر اس کی نظر ہو اور مستقبل کا صحیح خاکہ اس کے ذہن میں ہو۔ وہ نہ ادب کو کسی خانہ میں بند کرے، نہ خود کسی خانے میں بند ہو۔ تخلیق کے لیے اعلیٰ درجے کے جمالیاتی مذاق، لطیف احساس اور شگفتہ انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر تنقید کے لیے انتہائی بلند نظری، راست فکری، بے تعصبی اور غیر جذباتی منطقی انداز درکار ہے۔ جو مجموعی طور پر آج ہمارے ناقدوں میں کسی کے ہاں نہیں ہے۔ اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جو قدیم وضع کے نقاد ہیں انھوں نے جدید سے تعارف حاصل نہیں کیا اور جدیدیت کے علمبردار قدیم سے تعارض کرتے رہے۔

■

Mohd Irshad
R. No: 404, Mansarowar Hostel
Delhi University
Delhi - 110007
Mob: 8826933018
E-mail: notepad198824@gmail.com

عروسہ فاروق

رومانیت اور اردو افسانہ

رومانیت ادب کی وہ تحریک ہے جس میں غیر حقیقی باتیں بیان کی جائیں۔ رومانیت جذبات اور احساسات کی قائل ہے۔اس تحریک نے پرانے اصولوں کے بجائے نئے اصول وضوابط پر زور دے کر خیالی دنیا بسانے کی زیادہ توجہ دی۔ اس تحریک نے زیادہ زورانفرادیت پردیا۔ رومانی مفکروں کے مطابق ایک فردصرف احساسات، خیالات، جذبات کی مدد سے ھی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتا ھے۔

رومانیت کا لفظ رومان سے نکلا ہے۔رومان کو فرانسیسی زبان میں رومانس اور لاطینی زبان میں رومانکا کہتے ہیں۔عربی و فارسی زبان میں اس کے الگ الگ مفاہیم نظر آتے ہیں۔عربی میں رومان سے مراد کوئی قدیم رزمیہ داستان یا ایسا کوئی واقعہ جو انسانی عقل سے پرے ہو۔فارسی زبان میں رومان سے مراد کوئی قصہ یا افسانہ کے ہیں۔متذکرہ مفاہیم سے اندزہ لگایا جاسکتا ہے کہ رومان کے معنی جھوٹی سرگزشت کے ہیں یا ایسا قصہ جو دل کو خوش کرتا ہے اور جس سے انسان حظ حاصل کرتا ہے۔ رومان کے عناصر میں فرضی داستان، داستانِ عشق ومحبت، وارداتِ قلبی شامل ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''رومان کا لفظ 'رومانس' سے نکلا ہے اور رومانس زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا جو انتہائی آراستہ اور پر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق ومحبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دور وسطیٰ کے جنگ جو اور خطر پسند نوجوانوں کی مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اور اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہو گئے۔

1 عشق ومحبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانی کہا جانے لگا۔
2 غیر معمولی آراستگی، شان وشکوہ، آرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانی کہنے لگے اور
3 عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانی کا لقب دیا گیا۔''

(محمد حسن،اردو ادب میں رومانوی تحریک،شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1955 ص 11)

رومانیت ادب کی وہ تحریک ہے جس میں غیر حقیقی باتیں بیان کی جائیں۔ رومانیت جذبات اور احساسات کی قائل ہے۔اس تحریک نے پرانے اصولوں کے بجائے نئے اصول وضوابط پر زور دے کر خیالی دنیا بسانے کی زیادہ توجہ دی۔اس تحریک نے زیادہ زور انفرادیت پر دیا۔ رومانی مفکروں کے مطابق ایک فرد صرف احساسات، خیالات، جذبات کی مدد سے ہی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ان مفکروں کے مطابق عقل صرف ظاہری شے کو پہچان سکتی ہے لیکن احساسات اور جذبات اس ظاہر کے باطن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

رومانوی تحریک کی شروعات مغرب میں ہوئی۔ جرمن کے رہنے والے ادیب فریڈک شلیگل جس نے سب سے پہلے لفظ رومانیت کو متعارف کرایا۔رومانوی تحریک کے حوالے سے سب سے پہلا نام فرانسیسی مفکر 'روسوؔ' کا ہے جس نے اپنی کتاب The social contract میں کہا ہے:

Man is born free but everywhere he is in chains,

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے۔''

روسو کے اس قول کو رومانیت کا جوہر اور اس کی شروعات سمجھا جاتا ہے۔روسو نے اس دنیا میں انسان کو قید ہوتے دیکھا ان کے مطابق انسان کی مادہ پرستی اس کے احساسات وجذبات پر حاوی ہے۔انسان غیر ضروری طور پر قید ہو گیا ہے، روسو انسان کو اس قید سے آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔انھوں نے ادراک اور جذبات کو الگ الگ نہیں سمجھا بلکہ ان کے نزدیک ادراک اور جذبات ایک ہے۔اس حوالے سے محمد عالم خان رقمطراز ہیں:

''وہ (روسو) جذبات کو سب سے اہم اور افضل مقام پر فائز کرتا تھا اور اس کا اپنا تصور جمالیات جذبات کے اشتراک کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ ادراک اور جذبات میں تضاد نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتے اور حقیقت تک رسائی احساس وجذبات کے توسط سے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔روسو کے یہی خیالات آگے چل کر رومانی ادیبوں کی تحریکوں میں اجاگر ہونا شروع ہوئے اور رومانیت رفتہ رفتہ ایک مکتب فکر کی حیثیت اختیار کرنے لگی۔''

(محمد عالم خان،اردو افسانے میں رومانی رجحانات،علم وعرفان پبلشرز،ص 40)

اٹھارویں صدی میں ادب میں کلاسکیت کی وجہ سے جمود طاری ہو چکا تھا،فرد ظاہر اور باطن کی جکڑ بندیوں میں بند ہو چکا تھا۔روسو نے جذبے اور تخیل کی آزادی کی وجہ سے انسان کو جمود سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ یہی آزادی آگے چل کر رومانیت کا چربہ بن گئی۔اس طرح سے مغرب میں رومانیت کی داغ بیل پڑی جس میں یکے

بعد دیگرے بہت سے ادبا وشعرا نے اپنا لوہا منوایا۔ مغرب میں اس تحریک کے حوالے سے جو اہم نام شامل ہیں۔ ان میں ورڈزورتھ، کالرج، بائرن، شیلے، کیٹس، مسز ریڈ کلف، ولیم بیک فورڈ، ایملی برونٹے، شارٹ برونٹے، والٹر اسکاٹ وغیرہ اہم ہیں۔

ورڈزورتھ بنیادی طور پر فطرت پرست شاعر تھے۔ ان کے مطابق انسان فطرت سے جدا نہیں ہے بلکہ انسان کا سارا وجود ایک قدرتی آئینہ ہے۔ ورڈزورتھ کو فطرت کا سچا عاشق کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ عام فہم زبان کے ساتھ ساتھ انھوں نے فطرت کی سچی عکاسی کی ہے جس سے عام قارئین خوشی اور انبساط حاصل کرتے ہیں۔ ورڈزورتھ کے بعد کالرج کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ کالرج ایک بڑے شاعر، نقاد اور فلسفی تھے۔ انہیں ورڈزورتھ کی طرح فطرت سے کافی لگاؤ تھا۔ ان دونوں کو رومانیت کا دلدادہ کہا جاتا ہے۔ دونوں شاعروں کا ایک مشترکہ کارنامہ lyrical ballad(1798) ہے۔ یہ رومانوی اسکول کے لیے پہلا قابل تحسین کام مانا جاتا ہے۔ کالرج نے اٹھارویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے اوائل میں شاعری، تنقید اور مضامین لکھنے شروع کیے۔ شاعری میں انھوں نے مناظر فطرت کی عکاسی بڑے گہرے انداز میں کی ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادیت سے لے کر مافوق الفطرت عناصر نظر آتے ہیں۔

رومانی تحریک کا ایک اور اہم نام شیلے کا ہے۔ ان کی زیادہ دلچسپی سیاست میں تھی۔ انھوں نے اپنے انقلابی جذبات کا اظہار اپنی شہرہ آفاق تصنیف "Defence of poetry" میں کیا ہے جو 1821 میں لکھی گئی اور 1840 میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف کے اندر تشدد اور ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا جذبہ ملتا ہے۔ انھوں نے حسین مستقبل کا خواب دیکھا تھا۔ محمد عالم خان ان کے بارے میں اظہار خیال یوں کرتے ہیں:

’’شیلے کو تصوریت پسند رومانی شاعر کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ حال سے بیزار ہوکر اس حسین مستقبل کا خواب دیکھتا ہے جہاں افلاطون کے جمہوریہ اور طائس مور کے یوٹوپیا کی سرحدیں ملتی ہیں۔‘‘ (ایضاً ص42)

بائرن کو حال کا شاعر کہا جاتا ہے۔ یہ رومانی تحریک کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ان کی شاعری میں حسن پرستی، غنائیت، فطرت کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں رومانیت کے گہرے اثرات کے ساتھ ساتھ داخلیت کا رنگ نمایاں ہے جو انہیں اپنے معاصرین شعرا سے منفرد کرتا ہے۔

رومانی شعرا میں کیٹس زیادہ حساس شاعر تھے۔ ان کی تخلیق میں مشاہدے کا عمل دخل ہے۔ بعد میں جن ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کو جلا بخشی ان میں مسز ریڈ کلف، بیک فورڈ، ایملی برونٹے، والٹر اسکاٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مسز ریڈ کلف، بیک فورڈ کے یہاں

داستانوں میں حسن و محبت کا قصہ ایک مرکزی خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان قصوں میں رومانیت، تصوریت، ماورائیت پائی جاتی ہے جس سے داستان مکمل ہوجاتی ہے۔ داستان میں تخیل پرواز پر ہوتا ہے اور یہی تخیل رومانوی تحریک کا بنیادی عنصر ہے۔ داستانوں سے گزر کر رومانیت اردو ناولوں اور افسانوں کی طرف رخ کرنے لگی۔ اردو کے تاریخی ناولوں میں بھی رومانیت کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

رومانیت ان کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔ والٹر اسکاٹ کے یہاں اسکاٹ لینڈ کی تاریخ جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ماضی کی یادوں سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول نگاری کے میدان میں انہیں خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے کردار عوامی معاشرت کے بہترین ترجمان ہیں۔ اسکاٹ کے یہاں رومانی عناصر کے ساتھ ساتھ ڈرامائی کیفیات اور تمثیل کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ رومانی تحریک جس کی ابتدا مغرب میں ہوئی، مغرب میں اس کی پذیرائی اتنی ہوئی کہ یہ تحریک ادب کی دوسری زبانوں پر بھی چھا گئی۔ اردو زبان پر بھی اس کے دور رس اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو میں رومانیت کے آغاز کی بات کی جائے تو اس کے ابتدائی نقوش ہمیں داستانوں میں نظر آتے ہیں۔ داستانوں میں موضوعات زیادہ تر خیالی ہوتے ہیں، مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ اس میں ایک مرکزی قصہ ہوتا ہے جس کے ساتھ ساتھ ضمنی قصے بھی ابھرتے ہیں۔ اس طرح داستان میں طوالت پیدا ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری داستانوں میں رومانوی عناصر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’رومانی قصہ دوسرے اقسام قصص کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے اس میں ایک مرکزی قصہ ضرور ہوگا لیکن اس قصے کے ماتحت اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قصے گردش کرنے لگتے ہیں۔ عشق، مذہب اور جنگ رومان کے اہم عناصر ہیں اور کوئی رومانی قصہ ان محوروں سے ہٹ کر وجود میں نہیں آسکتا۔ ان قصوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں مافوق الفطرت عناصر کو غیر معمولی دخل ہوتا ہے۔‘‘

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، 2018، ص148)

داستانوں میں حسن و محبت کا قصہ ایک مرکزی خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان قصوں میں رومانیت، تصوریت، ماورائیت پائی جاتی ہے جس سے داستان مکمل ہوجاتی ہے۔ داستان میں تخیل پرواز پر ہوتا ہے اور یہی تخیل رومانوی تحریک کا بنیادی عنصر ہے۔ داستانوں سے گزر کر رومانیت اردو ناولوں اور افسانوں کی طرف رخ کرنے لگی۔ اردو کے تاریخی ناولوں میں بھی رومانیت کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ، تاریخی ناول نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ماضی پرستی کی جو عمدہ مثالیں مغرب میں اسکاٹ کے یہاں مل جاتی ہیں۔ اردو ادب میں عبدالحلیم شرر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو کا والٹر اسکاٹ بھی کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، منشی سجاد وغیرہ کے یہاں بھی رومانیت کے جلوے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اردو ادب میں رومانیت کو سرسید تحریک کے ردِعمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سرسید نے مقصدی ادب کو فروغ دیا جس کی کھلی مخالفت رسالہ ’مخزن‘ میں ہوئی۔ اردو ادب میں رومانیت 1900 سے 1935 تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اگر چہ اس تحریک کی عمر اردو ادب میں زیادہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس نے ادب پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔

میر ناصر علی دہلوی نے سرسید کی غیر متحرک نثر کا جمود توڑ کر عاشقانہ مضامین کو شاعرانہ انداز میں لکھنے کی روایت ڈالی۔ انھوں نے رومانوی موضوعات کو بنیاد بنا کر شراب، رند، زاہد وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سرسید کی تحریک کے مقابلے میں انھوں نے ’فسانہ ایام‘ اور ’صلائے عام‘ جیسے رسائل نکالے۔ انھوں نے ادب میں فرد کی داخلی رومانیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔

اردو میں اس تحریک کے فروغ میں ادبی رسائل کا اہم رول رہا ہے، جن میں ناصر کے ’فسانہ ایام‘ اور ’صلائے

عامؔ کے ساتھ ساتھ شرر کا 'دلگداز' سرعبدالقادر کا 'مخزن' محمد یوسف خان کا 'نیرنگ خیال' نیاز فتح پوری کا 'ہمایوں' قابل ذکر ہیں۔ رسالہ مخزن نہ صرف سرسید کے خلاف رد عمل تھا بلکہ یہ رسالہ اس وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس رسالہ میں سماجی نقطہ نظر سے فرد واحد کی آزادی کا اعلان بھی تھا۔اس رسالے نے اردو دنیا کو بے شمار ادبا سے متعارف بھی کرایا۔اس رسالے کی اہمیت کے حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں۔

''جب اپریل 1901 میں مخزن کا اجرا ہوا اور اس نے روش عام سے ہٹ کر جذبہ اور تاثر کو ملکوتی زبان میں پیش کرنا شروع کیا تو اس عہد کے بیشتر نوجوان ادبا 'مخزن' کی طرف متوجہ ہوگئے،اس دور میں جو ادیب مخزن کے صفحات سے نمایاں ہوئے ان میں اقبال،،ابو الکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم،آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خان، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، غلام بھیگ نیرنگ،مہدی افادی،لطیف الدین احمد،خواجہ حسن نظامی اور شیخ عبدالقادر کے اسما بے حد اہم ہیں۔ان ادبا نے اردو زبان کو ایک خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور طاقتور متخیلہ کے بل بوتے پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی سعی کی۔''

(ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب کی تحریکیں،انجمن ترقی اردو پاکستان، 2013، ص400)

رسالہ مخزن میں لکھنے والے جو ادبا و شعرا ابھر کر سامنے آئے ان میں اہم نام شاعر مشرق علامہ اقبال کا ہے۔ علامہ اقبال کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔انھوں نے اردو ادب بالخصوص شاعری میں ایسے نت نئے تجربے کیے جن کی پیروی ان کے بعد آنے والے شعرانے کی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انھوں نے مغربی شعرا جن میں ورڈز ورتھ خاص طور پر شامل ہیں کا مطالعہ کیا۔علامہ کے یہاں گرچہ فلسفیانہ نظریہ زیادہ نمایاں ہے پھر بھی فطرت کی جمالیات کی تصاویر جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کی شاعری کو کسی ایک دائرے میں قید کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔اپنی شاعری میں ملی جذبات،سیاسی خدمات،مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ زندگی کے فلسفے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے،جس میں علامہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی رومانیت کے نقش نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں رومانیت کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی حاوی ہے۔ان کی رومانیت ادب لطیف کی رومانیت سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں عورت کا حسن، عشق و عاشقی،تخیلات کے بجائے مقصدی ادب پایا جاتا ہے۔

متذکرہ رسالے نے علامہ اور ابوالکلام جیسے مفکرین کے ساتھ ساتھ رومانی افسانہ نگاروں کو بھی جنم دیا،جن میں اولیت کا سہرا سجاد حیدر یلدرم کے سر جاتا ہے۔سجاد حیدر یلدرم رومانی افسانہ کے بانی قرار دیے جاتے ہیں۔انھوں نے پریم چند کی حقیقت نگاری کے برعکس رومانوی اسکول قائم کیا،جس کی پیروی ان کے معاصرین میں نیاز فتح پوری،حجاب امتیاز علی،مجنوں گورکھپوری، ل احمد،سلطان حیدر جوش وغیرہ نے کی۔

سجاد حیدر نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں افسانے کی شروعات کی۔ان کے متعدد افسانوی مجموعے سامنے آچکے ہیں جن میں رومانوی رنگ نمایاں ہے۔مرد وعورت کے فطری وجود،حسن وعشق،جنسی کیفیات،تخیل کی آمیزش ان کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ خیالستان 1911 میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعے میں شامل پہلا افسانہ 'خارستان و گلستان' میں عورت ومرد کے تئیں فطری میلان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے میں جنسی جبریت کو پیش کر کے اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ مرد وزن ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بھی رکھا جائے تب بھی جنسی الجھنیں ایک دوسرے کو ملنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یلدرم نے افسانے میں جنسی رشتے کو رومانوی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ افسانہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں نسرین نوش کو موضوع بنایا گیا ہے۔نسرین نوش کو ماں نے جنت جیسے جزیرے میں مردوں سے کوسوں دور رکھا ہے لیکن عنفوان شباب میں آتے آتے اسے اس جنت نما جزیرے میں ایک کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔دراصل وہ کمی ایک مرد کی ہے۔وہ اپنی زندگی میں تغیر چاہتی ہے۔افسانے کا دوسرا حصہ خارستان ہے۔ جہاں خارا رہتا ہے۔ خارا بھی نسرین کی طرح زندگی جی رہا تھا۔اس کی زندگی میں بھی کوئی عورت نہیں تھی۔خارا کو اپنی بنجر زندگی میں جس کمی کا احساس ہو رہا تھا وہ عورت تھی۔عورت کا تصور خارا کے یہاں سجاد حیدر کے قلم سے ملاحظہ کیجیے:

''عورت عورت ! ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد سخت دل ہو جاتا ہے،اکھل کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت ونوازش، یہ اُس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رفیق حیات سے منور ہو جاتا ہے۔'' (افسانہ:'خارستان وگلستان'ص66)

افسانے میں ایک دلچسپ بات اس کے عنوان کے حوالے سے دیکھی جاسکتی ہے۔ افسانے کا عنوان 'خارستان و گلستان' ہے جو یلدرم کے فن کی تابناکی کا مظہر ہے۔خارستان جہاں خارا (مرد) رہتا ہے۔خار کے معنی کانٹا کے ہیں جو پھول کے ساتھ ابھرتا ہے۔گلستان جہاں نسرین (عورت) رہتی ہے،جس کے معنی پھول کے ہیں۔کانٹا پھول کو تحفظ فراہم کرتا ہے،جس طرح کانٹا اور پھول ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔افسانے میں یلدرم نے مرد وعورت کے ایک ہونے کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔افسانے کا تیسرا حصہ 'شیرازہ' ہے۔یہ وہ حصہ ہے جہاں خارا اور نسرین ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔تب جاکے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہوجاتے ہیں اور جنسی ملاپ کے بعد نسرین کے ہونٹوں پر پھول کھل جاتے ہیں جو خوشی ومسرت کی علامت ہے۔اس ملاپ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو اس فطری حق سے جتنا دور رکھ جائے وہ اتنا ہی قریب جانے کی سعی کرتا ہے۔اس کی منظر کشی افسانے میں یوں کی گئی ہے۔

''ایک گرد باد آہنگ ورنگ،ایک زمزمہ جوش و خروش نے کل جزیرے کو گھر لیا،اس وقت دونوں (خارا اور نسرین) مدہوش اور بے خبر پڑے ہوئے تھے،خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی جو اس نے تمام عمر اب تک محسوس نہیں کی تھی اور نشے کی حالت میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔آغوش کھلی ہوئی تھی،سینہ سانس کی وجہ سے ابھر رہا تھا اور دل ایک ننھی سی چڑیا کی اڑان کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔''

(سجاد حیدر یلدرم،مجموعہ'خیالستان'،ص60)

خارستان و گلستان یلدرم کا شہکار افسانہ ہے۔ افسانے میں داستانوی رنگ چھایا ہوا ہے۔افسانے میں مافوق الفطرت عناصر،عیش وعشرت،حسن ومحبت،عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی وجنسی کشمکش جابجا نظر آتی ہے۔ اردو افسانے میں جب بھی جنس کی بات آجاتی ہے تو زبان پر بے ساختہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کا نام آجاتا ہے۔اس حوالے سے دونوں کو بدنامی بھی سہنی پڑی۔ جنسی موضوع کے حوالے سے بات کیجیے تو ان دونوں سے پہلے ہی اس موضوع کی شروعات ہوچکی تھی۔ آج بھی لوگ اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ جنسی موضوعات سب سے پہلے منٹو،عصمت کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے البتہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کے یہاں یہ موضوع غالب رہا ہے۔''خارستان وگلستان'' کو ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے۔

اس حوالے سے وہ یوں لکھتے ہیں:

''اردو افسانہ میں جنس کو ایک اہم موضوع کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی بدنامی منٹو،عصمت اور دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے مقدر میں آئی۔یوں جنسی افسانہ کے مخالفین اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور کا ایک بہت ہی اہم افسانہ جنس کے موضوع پر تھا گو اسلوب کی بنا پر'خارستان وگلستان' اردو افسانہ میں جنس کی روایت کے فروغ کا باعث نہ بن سکا لیکن پھر بھی اسے اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ اعزاز کم نہیں۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر،افسانہ حقیقت سے علامت تک،اردو بازار لاہور،ص 34)

سجاد حیدر کی رومانوی تحریک کے نقش قدم پر جو افسانہ نگار اپنا نقش چھوڑ گئے ان میں نیاز فتح پوری کا نام اہم ہے۔انھوں نے افسانوں میں رومانوی طرز فکر کو اپنایا۔ان کے یہاں رومانی اور تاثراتی انداز کے افسانے ملتے ہیں۔ان کے افسانوں کا غالب موضوع عورت ہے۔عورتوں کے حسن کا تذکرہ،عورتوں کی نفسیات ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔بنیادی طور پر وہ رومان پرست اور جمال پسند انسان تھے۔انھوں نے مقصدیت سے زیادہ تخیلات پر زور دیا۔ان کی تخیلاتی دنیا اور رنگین مزاجی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری یوں رقمطراز ہیں:

''نیاز کے افسانے اسی ٹھوس اور سنگین عالم آب و گل سے وابستہ ہوتے ہیں۔وہ جب حسن و عشق کے بیان پر آتے ہیں تو ہم کو ہوا اور بادل میں نہیں لے جاتے بلکہ جسم کی تمام چھپی ہوئی رنگینیوں اور کیفیتوں سے لذت آشنا کرتے ہیں۔''

(احمد صدیق مجنوں، پروفیسر،'نکات مجنوں' کتابستان الہ آباد، 1975،ص 316)

افسانہ 'ایک شاعر کا انجام' میں دو مرکزی کردار ہیں جو ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔دونوں کا انجام ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن کچھ معنوں میں یکساں ہے۔ایک کا انجام پاگل پن اور دوسرے کے خودکشی ہوتا ہے۔افسانہ 'شہاب کی سرگزشت' رومانوی اسلوب کی بہترین مثال ہے۔اس میں نیاز نے ایسے نوجوان کو کردار بنایا ہے جو اپنے دوست محمود کو عورت کی محبت سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔افسانے میں تین اہم کردار ہیں شہاب،محمود اور اختر۔محمود اختر سے عشق کرتا ہے،شہاب اسے عورت اور عشق و عاشقی سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔شہاب خود بھی ایک عورت کے عشق سے دورہ کر ایک بیوہ سے شادی کرتا ہے۔وہ محبت کو جذبہ شہوانی قرار دیتا ہے۔افسانے میں رومانی فضا بدرجہ اتم موجود ہے۔

''شہاب: میرے نزدیک محبت نام ہے ایک بے غرض انہاک کا ایک خود فراموش کیفیت کا جو پیدا ہو حسن کو دیکھ کر خواہ وہ حسن ظاہری ہو یا باطنی' واضح ہو یا غیر واضح' زمین میں ہو یا آسمان میں رہا یہ امر کہ محبت کرنے والا محبوب سے مل جانا چاہتا ہے یا نہیں یہ خواہش فطری ہے یا غیر فطری،اس کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جس کی محبت اس بات پر مجبور کرے حقیقتاً محبت نہیں ہے بلکہ ایک جذبہ شہوانی ہے۔''

(افسانہ'شہاب کی سرگزشت'ص 10)

رومانی افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام حجاب امتیاز علی کا ہے۔ان کی والدہ عباسی بیگم بھی اپنے دور کی ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل تھیں۔حجاب امتیاز کے افسانوں کا تانا بانا رومانیت سے شروع ہو کر رومانیت پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔حجاب نہ صرف افسانہ نگار تھیں بلکہ ایک ناول نگار،ڈراما نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں پہچانی جاتی ہیں۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کم سنی میں ہی کیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ'' میری ناتمام محبت'' کے نام سے منظر عام پر آیا،جس وقت ان کی عمر صرف 11 سال تھی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ'میری نا تمام محبت' کے ہی نام سے 1932 میں شائع ہوا۔اسی مجموعے کی بدولت انھیں اردو افسانوی دنیا میں ایک منفرد پہچان ملی۔خورشید زہرا عابدی اس مجموعے میں شامل افسانہ'میری ناتمام محبت' کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''میری ناتمام محبت ایک نابالغ ذہن، نا تجربہ کار لڑکی کی لکھی ہوئی ایسی کہانی ہے جس کی ساخت میں کئی جگہ خود بت تراشی،نوعمری اور جذبات کی ولولہ انگیز ناہمواری جھلکتی ہے یا یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس بت کی آنکھیں بہت زیادہ نشیلی ہیں اور ابرو بے حد خمدار ہو گئے ہیں۔''

(بحوالہ خورشید زہرہ عابدی، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور، اردو گھر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1987،ص 56)

اس کے علاوہ کئی افسانے ہیں جن میں رومانیت کا موضوع غالب نظر آتا ہے جن میں' لاش'،'ظالم محبت'، 'صنوبر کے سائے' اور' دوسرے رومانی افسانے'(مجموعہ) وغیرہ شامل ہیں۔

افسانہ'صنوبر کے سائے' ان کا ایک خوبصورت افسانہ ہے،جس میں انھوں نے رومانیت کے ذریعے اس وقت کے لوگوں میں پائی جانے والی توہم پرستی کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں راوی اپنی سہیلی کے ساتھ'نہر روحناک' کی سیر کو جاتی ہے، جہاں ان کی ملاقات ایک سو سال کے بوڑھے ملاح سے ہوتی ہے جو نہر روحناک میں ستر سال سے کشتی چلا رہا تھا۔جب دونوں سہیلیاں سیر کو نکلتی ہیں تو راوی جس کا نام'روحی' ہے وہ اس سو سال کے بوڑھے سے سوال پوچھتی ہے، یوں ذیل کا مکالمہ وجود میں آتا ہے:

''تمھارا مکان کہاں ہے؟''

''مکان کہیں نہیں خاتون...'' صنوبر کے ان سایوں تلے پڑا رہتا ہوں...''

''مجھے محسوس ہوا۔یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے ایک آہ بھری ہے۔

''صنوبر کے سایوں تلے''

میں نے حیران ہو کر کہا۔

''بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی،تمہیں زندگی سے بے زار نہیں کرتی۔

اس کا تمھارے پاس کیا علاج ہے؟''

''علاج؟''

اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا:'' میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔جس کے پاس کوئی یاد ہو،اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا'' میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔''تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے''

(افسانہ'صنوبر کا سایہ')

اس افسانے میں حجاب نے رومانیت کے عناصر کا بھرپور طریقے پر استعمال کیا ہے۔انھوں نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کر کے جہاں ایک طرف بوڑھے کے ماضی کی کرب ناکی کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف اس کی محبت بھری زندگی کی داستان پر اثر اُسلوب میں پیش کی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے بوڑھے کی داستان کو اسی کی زبانی سنا کر کہانی کو اور بھی دلچسپ اور پر تاثیر بنایا ہے۔ستر سال قبل کی اس کی زندگی خوبصورت اور رنگ برنگی تھی۔اس وقت اس نے صنوبر کے سائے تلے ایک کم سن لڑکی کو دیکھ کر اپنا دل دیا تھا۔محبت سے لطف اندوز ہو کر ان کی شادی ہو جاتی ہے،شادی کے کچھ مہینے بہت سنہرے گزرتے ہیں لیکن اس وقت کے لوگ توہم پرستی کے مرض میں گرفتار تھے۔بوڑھے کے یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ایک روز اس کی بیوی نے اس سے کہا تھا کہ میں نے ہولناک خواب دیکھا کہ تقدیر کا فرشتہ پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اجڑ جائے گا۔

توہم پرستی کا شکار مانجھی بیوی کا خواب سن کر سہم گیا اور اس نے طرح طرح کی دشواریاں اُٹھا کر بیوی کو کاسنی

رنگ کا گلاب لا کر دیا۔ اسی شام جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس کی ملاقات حمری نام کے ایک دوست سے ہوئی۔ بوڑھے نے اس کے عبا کے کاج پر کاسنی گلاب دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا:

''حمری یہ کاسنی گلاب تمھیں کہاں سے ملا''؟

حمری نے جواب میں کہا میری محبوبہ نے مجھے تحفے میں دیا ہے۔

اس طرح مانجھی غلط فہمی کا شکار ہوگیا اور اس نے غصے میں اپنی بیوی کو قتل کر کے اسے صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا۔ واپسی پر مانجھی کی ملاقات حمری سے پھر ہوجاتی ہے اور وہ اسے مطلع کرتا ہے کہ اب تمہاری محبوبہ نہیں رہی۔ حمری غصے میں چلا کر کہتا ہے:

''کوتاہ اندیش اور جلد باز !تو بد بخت ہے ! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اُٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اُٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے گرا پڑا ہو۔''

توہم پرست زمانے کے بوڑھے نے بیوی کے خواب میں دیکھے فرشتے کا کہنا سچ ثابت کر دیا۔ افسانے کے اختتام میں بوڑھے کی افسوس ناکی اور بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔ افسانے میں آج کا بوڑھا کئی سال پہلے توہم پرستی کا شکار تھا لیکن بوڑھا اب اس زمانے میں جی رہا ہے جہاں توہم پرستی کو عیب جانا جاتا ہے۔ معاشرہ باشعور و بیدار ہو رہا ہے اور اسی بیداری کی طرف افسانہ نگار نے اپنے قارئین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

احمد صدیق جو ادبی دنیا میں مجنوں گورکھپوری کے نام سے جانے جاتے ہیں رومانوی افسانے کا ایک اہم نام ہیں۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کے کہنے پر اردو افسانے کو باضابطہ طور پر اپنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے جیتے جاگتے انسان ہیں یہ کردار بے غرض محبت کرنے کے قائل ہیں۔ محبت مجنوں کے یہاں مختلف انداز میں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے جن میں 'خواب و خیال'،'سمن پوش' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ افسانوں میں لطافت، شعریت، ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ فنی محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے یہاں محبت اور زندگی الگ الگ نہیں بلکہ دونوں کا تصور ایک ہے۔ افسانہ 'سائرہ' جس کا انجام محبت کی کامیابی پر ہوتا ہے، سائرہ اور مشتاق ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مشتاق کے والد کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے اس لیے وہ مشتاق کو ولایت بھیج دیتا ہے اور سائرہ مجبور ہو کر ایک غریب لڑکے نعیم سے شادی کر لیتی ہے۔ ان کے یہاں ایک بیٹی بھی پیدا ہوتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد نعیم کی وفات ہوجاتی ہے اور سائرہ کی جوانی پر بڑھاپا رقص کرنے لگتا ہے۔ مشتاق ولایت سے تعلیم مکمل کر کے آتا ہے اور سائرہ سے اب بھی شادی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

''سائرہ اگرچہ غم سے نڈھال ہو چکی تھی اور جوانی ہی میں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد مشتاق اب بھی اس سے شادی کرے گا وہ اس قدر خوش ہوگئی کہ اسے شادیِ مرگ ہوگئی۔''

اس اقتباس سے مترشح ہوجاتا ہے کہ مجنوں کے یہاں محبت محض رومان پرستی اور جنسی میلان سے لبریز نہیں بلکہ ان کے یہاں زندگی کی حقیقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک گہرا تصور ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی طرح ل۔ احمد کے یہاں بھی نیاز فتح پوری کا اثر رہا ہے۔ ان کے رومانوی افسانوں میں اپنی شکست کی آواز، عورت کا لمحہ حیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سلطان حیدر جوش کا افسانہ 'نرگس خود پرست' اعجاز محبت بھی رومانوی افسانوں کی صف میں شامل ہیں۔

اس طرح سے رومانوی افسانہ نگاروں نے سفر طویل کر کے افسانے کے ارتقا میں ایک نئی جلا بخشی۔ بعد میں افسانہ رومانیت سے گزر کر حقیقت کی اور گامزن ہونے لگا۔ حقیقت پسند افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام کرشن چندر کا ہے جنھوں نے حقیقت کے ساتھ ساتھ رومانیت کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'طلسم خیال' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں رومانیت کا زور صاف دکھائی دے رہا ہے۔ افسانہ 'جہلم میں ناؤ پر' ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں عورت کی خوبصورتی اور حسن نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ افسانہ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے جس میں راوی خوبصورتی اور بدصورتی کا تقابل کرتا ہے۔ راوی خوبصورتی کا متلاشی ہے۔ اسے عورت کا وہ حسن بے حد پسند ہے جو اسے بار ہا اپنی اور کھینچ لیتا ہے:

'' میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں، دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں مگر جو عورت میرے بالکل مقابل میں بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی۔ وہ کبھی بھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں سے بچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا...''

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کرشن چندر کس حد تک حسن کے پرستار تھے۔ پورے افسانے میں رومانی عناصر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی افسانوی دنیا کو Romantic Realistic کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ انھوں نے حقیقت نگاری کا ساتھ بھی دیا ہے اور رومانیت کو بھی ہاتھ سے جانے کا موقع نہیں دیا ہے۔ ایک جگہ اس بات کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''میں حقیقت پسندی کو اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ تھوڑا رومان پسند بھی رہا۔ خوبصورتی اور شاعری کا دامن مکمل طور پر کبھی نہ چھوڑ سکا۔ معاشیات کو میں محض انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا وسیلہ نہیں سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں معاشیات کو خوبصورت بھی ہونا چاہیے۔''

(کرشن چندر: دیباچہ۔ بندگلی کی منزل، مشمولہ عصری ادب، دہلی اپریل 1990)

کرشن چندر نے رومانیت سے ہوتے ہوئے اپنا سفر حقیقت نگاری کی طرف منتقل کیا لیکن جو شعریت اور رومانوی رنگ تھا وہ اسے برقرار رکھنا پڑا۔ اسی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری رومان اور حقیقت کے بیچ کا سنگم ہے جسے بعد میں رومانوی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا۔ اس طرح سے یہ اسلوب ان کی انفرادیت کا سبب بنا۔ ابتدائی افسانوں میں تخیل کی آمیزش کا غلبہ زیادہ تھا لیکن بہت جلد انھوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ کرشن چندر نے اسلوب کے حوالے سے جو بنیادی تجربہ کیا ہے وہ ان کا شعری اسلوب ہے۔ انھوں نے شاعری کی زبان کو اردو فکشن میں استعمال کر کے یہ نیا تجربہ بھی کیا ہے۔

رومانی افسانہ یلدرم سے ہوتے ہوئے کرشن چند تک معنی و مفہوم کی وسعتوں سے ہمکنار ہوا، اور بعد میں رومانوی حقیقت پسند افسانہ نگاروں نے معاشرتی المناکیوں، بے چینی اور اضطراب وغیرہ کو افسانے کا موضوع قرار دیا۔ البتہ کہیں کہیں انھیں بھی جذبات و احساسات، تخیل آفرینی، حسن پرستی اور تلاش حسن کا عمل، روح کی آزادی اور فطرت کی طرف مراجعت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ٹھوس حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں رومانی رنگ بھی چڑھایا ہے تاکہ قاری اکتا نہ جائے اور اسے مسرت و انبساط حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سماج میں پنپنے والی برائیوں پر بھی نظر پڑ سکے۔

■

Orussa Farooq
Lane No.10, House No.130
Natipora Srinagar Kashmir- 190015 (J&K)
Cell.:8082706051

رسم الخط ہی زبان کی شناخت ہے

سجاد احمد نجار

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہو پاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: انسان کے خیالات، جذبات اور احساسات کے اظہار کا سب سے موثر وسیلہ زبان ہے۔ زبان ہی ایک مخصوص قوم کی شناخت کو قائم رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ جس قوم میں زبان کا استعمال ہوتا ہے وہی قوم ترقی کے منازل طے کرتی ہے۔ چین، ترکی، امریکہ اور باقی دوسرے مغربی ممالک اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کسی علاقے، ملک یا کسی ریاست کے لوگ اپنی مخصوص زبان سے نا آشنا ہوتے ہیں تو وہ زبان اور اس زبان سے منسلک تمام عوامل کی موت اپنے آپ واقع ہو جاتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: جس قوم میں زبان کی حفاظت کے نت نئے اقدامات عمل میں لائے جاتے ہوں، وہ قوم ہر لحاظ سے ترقی کر لیتی ہے۔ اس لیے زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے پہلے زبانوں کا تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے کو عام کرنا از حد لازمی ہے۔ اس ضمن میں اسکولوں، کالجوں، سرکاری و غیر سرکاری اداروں کے کام کاج کو اس زبان میں رائج کرنا ہوگا، جس زبان کو فروغ دینا یا حفاظت کرنا ہے۔ اسی طرح اس زبان کے شعری و نثری وسائل کو بھی عام کرنا ہے اور اسی طرح تخلیق کاروں کی مالی مدد کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی لازمی ہے۔

س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبان اور تہذیب و ثقافت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ زبان ہی کے بطن سے تہذیب و ثقافت پنپتی اور پروان چڑھتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو ہی کو لیجیے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے تمام عناصر کی عکاسی ملتی ہے۔ اس زبان میں یہاں کے تمام مذاہب، کلچر و ثقافت اور باقی دوسرے تہذیبی عناصر کی ہیں۔ گویا زبان ایک ایسا درخت ہے، جس کی شاخوں سے تہذیب و ثقافت کے پھل پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: اس بات میں کیا مبالغہ ہوسکتا ہے کہ انسانی وراثت کا سب سے حسین، دیرپا، اور موثر جز زبان ہے۔ اگر اسی زبان کو خطرہ لاحق ہوا تو اس سے سماج کی تمام تر مضبوط اکائیاں لڑکھڑا جائیں گی۔ زبان کی موت نہ صرف ایک سنگین مسئلہ ہے بلکہ اس سے ایک قوم کا نشان تک باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ ادب کی کتابوں میں جگہ جگہ بھری پڑی ہیں۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں کئی قومیں آباد ہوئیں اور جب ان قوموں نے اپنی مخصوص زبان کو ترک کیا تو اس کے ساتھ ہی وہ زبان ایک مدت کے بعد ناپید ہوگئی۔ اس طرح یہی کہا جاسکتا ہے کہ زبانوں کی موت دراصل انسانی وراثت کی موت ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: سماج میں خواندگی یا سائنسی مواد کی عدم موجودگی سے اگر چہ زبانوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ہے، لیکن ان سماجی محرکات کی وجہ سے ایک تو شرح خواندگی میں اضافہ ہوسکتا ہے جس سے آہستہ آہستہ زبانوں پر بھی اثر پڑے گا کیونکہ ایک حساس قوم ہی زبان کو زندہ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے اور اسی کے دم سے تمام علوم معرض وجود میں آتے ہیں۔ ان ہی علوم میں سائنسی علوم کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سائنسی علوم اگر مادری زبان میں ہوں تو زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی اور اگر مسئلہ اس کے برعکس ہو تو زبان مرتو نہیں سکتی البتہ کمی ضرور واقع ہوسکتی ہے۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ عہد انتشار، بدامنی اور استحصال سے دوچار ہے۔ اس سلسلے میں زبانوں کو جو خطرہ لاحق ہے اس سے آنکھیں چرانا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ زبانوں کو مذہب کے ساتھ جوڑا گیا۔ اردو جیسی زبان بھی اس نرغے میں آ گئی۔ اسی طرح اردو کا دم بھرنے والا بھی اردو کو اپنی نئی نسل سے آتا ہے، یعنی اردو سے کمانے والا پروفیسر، کلرک، یا اور کوئی شخص اپنی اولاد کو اردو کی بجائے انگریزی زبان و علوم کو سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح کے اور بھی کئی نقطے ہیں جن کی وجہ سے اردو کو خطرہ درپیش ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا۔ اس وقت اردو کو جتنے بھی مسائل پیش آ رہے ہیں، ان کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا مستقبل کسی نہ کسی طرح تاریکی کی طرف چلا جارہا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح اس زبان میں اب وہ معیاری ادب نہیں لکھا جارہا ہے جو ماضی میں ہمارے یہاں لکھا گیا۔ لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ملک کی کئی ریاستوں میں نئے لکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اگر ان کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے تو یقیناً اردو لکھنے، پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوسکتی ہے۔ اب مطالعہ کا شوق مجموعی طور پر معدوم ہوتا جارہا ہے۔ ڈیجیٹل دنیا نے انسان کی فکر و سوچ کو کہیں سے کہیں دھکیل دیا ہے، جس کا اثر زبان و ادب پر پڑا ہے۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: بالکل اردو کی تمام تنظیمیں اور ادارے زبان سے زیادہ اس کے ادب پر توجہ دے رہے ہیں اسی طرح اس زبان کے تعلق سے کتابوں کی اشاعت تھم سی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ زیادہ تر اپنے مطلب کے صفحے کو آن لائن پڑھنا ہی پسند کرتے ہیں۔ وہ زمانہ چلا گیا جب ایک اردو داں اپنے گھر میں کتب خانے کے لیے جگہ متعین کر کے اس میں اردو کی کتابیں مزین کرتا تھا۔ یہ منظر آج نئی نسل میں بہت کم نظر آرہا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں اگر کچھ لکھا بھی جارہا ہے تو اس کے پس پشت خلوص کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف پیسوں یا ذاتی مفاد کے لیے کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ان کی اشاعت اسی، سو، یا اس سے آگے پیچھے ہوتی ہے۔

س: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ج: کلاسکیت اور جدیدیت وغیرہ ادب کے مباحث ہیں اور زبان کے فروغ میں ان مباحث سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ زبان کو اگر فائدہ پہنچ سکتا ہے تو پھر اس کے لیے الگ طریقہ ہے۔ کلاسکیت نے زبان کا سہارا لے کر اپنا کام کیا اور یہی جدیدیت کا وتیرہ رہا ہے۔ زبان کو ان چیزوں سے کوئی فائدہ ملا یا نہیں ملا اس کا اندازہ لگانا ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔ لہٰذا زبان کا دائرہ کار اور اس کا طرز الگ ہے اور ادب کی اصناف کا ڈسکورس الگ ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: میرے لیے یہ سوال نہایت مایوس کن ہے۔ ہمارے علاقے میں جہاں تک اردو میڈیم اسکولوں کی بات ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ ہر جگہ سرکاری اور نجی اسکول قائم ہیں لیکن وہاں اردو صرف ایک سبجیکٹ کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس باقی تمام کتابیں انگریزی میں ہی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہاں (جموں وکشمیر) میں اگر چہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے تاہم وہ صرف کاغذوں تک ہی محدود ہے اور عملی طور پر اس کا نفاذ کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔

ج: ہمارے علاقے میں ایک ڈسٹرکٹ لائبریری ہے اور وہاں مقامی اخبارات (کشمیر عظمیٰ، خیر خواہ، ہند سماچار، الصفا) وغیرہ تواتر کے ساتھ آتے ہیں۔ اگر اس لائبریری میں اردو رسائل کی بات کی جائے تو یہاں بھی مشاہدہ نفی ہی میں ہے۔ اسی طرح ہمارے علاقے میں جتنی بھی کالج لائبریاں ہیں ان تمام کی حالت بھی بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ الغرض وہاں اردو اخبارات تو پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن اردو رسائل کہیں نظر ہی نہیں آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہیں ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں جتنی بھی اردو انجمنیں قائم ہیں وہ تمام اردو کے فروغ کے سلسلے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ ان انجمنوں سے منسلک ادب دوست حضرات مہینے میں دو یا تین بار ادبی محافل کا انعقاد عمل میں لاتے ہیں اور اسی طرح ان کی کاوشیں مقامی اخبارات میں شائع بھی ہوتی ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی یا قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: پروفیسر نظیر آزاد، پروفیسر جوہر قدوسی، سلیم ساغر، گلزار احمد اور باقی دوسری ادبی شخصیات کو اگر چہ علاقائی سطح پر شہرت حاصل ہے۔ تاہم ان شخصیات کی خدمات کا قومی سطح پر اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کی طرف توجہ دی جائے گی۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: میں اردو زبان و ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ پچھلے بارہ سالوں سے جموں وکشمیر کے کئی اضلاع میں درس وتدریس کے کام سے وابستہ رہا ہوں۔ میری کوشش یہی رہتی ہے کہ طلبہ و طالبات کو اردو زبان و ادب کی طرف مائل کر کے انھیں اس سبجیکٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کروں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو کے فروغ کے لیے یہی تجاویز اور مشورے ہیں کہ اردو طبقہ اس دور میں اپنے آپ کو باقی علوم کے معاملے میں کمزور نہ سمجھیں۔ خسرو سے ولی دکنی اور ولی دکنی سے میر غالب اور مومن اور پھر اس کے بعد ادبی منظر نامے پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔ غیر اردو والے بھی اردو زبان سے محبت کرتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم اس محبت کو عملی طور پر آگے بڑھائیں۔ اپنے بچوں، رشتے داروں اور آس پڑوس کے بچوں کو اردو پڑھنے کے لیے ابھاریں کل یہی بچے اردو کا سرمایہ بن کر سامنے آئیں گے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: ہر زبان اس کے رسم الخط سے پہچانی جاتی ہے اور رسم الخط ہی زبان کی بقا کے لیے اہم ہے۔ ہمیں رسم الخط کی بقا کے لیے نہ صرف خود اس زبان میں لکھنا ہوگا بلکہ باقی احباب کو بھی اردو لکھنے پر زور دینا چاہیے۔ بچوں کو خوش خط کی مشقیں کرانی چاہیے اور کیلی گرافی کے کورسز بھی عمل میں لانے چاہیے۔ اسی طرح سوشل میڈیا پر بھی اسی زبان کو رائج کرنا چاہیے تاکہ دیکھنے اور پڑھنے والے ان الفاظ کے حسن کو اپنے اندر جذب کر کے ان کو عمل میں لاسکیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان ہوتی ہے۔ ان علاقائی زبانوں کے بعد اگر کوئی زبان برصغیر میں رائج ہے تو وہ اردو ہی ہے۔ اس لیے ان علاقوں میں اردو کی ترویج کے تمام وسائل بروئے کار لانے چاہیے۔ مشاعرے، بیت بازی، کتابوں کی اشاعت، اخبارات کی اشاعت، اردو میں علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ بات چیت کرنا وغیرہ اردو کے فروغ کے لیے سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آدھے جانتے ہیں اور آدھے نہیں۔ میرے والد نے پانچوں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے تاہم وہ اردو اچھی طرح پڑھتے ہیں اور اس زبان کے علاوہ انھیں اور کوئی زبان آتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح میری اہلیہ بھی اردو پڑھتی اور لکھتی ہے۔ میرے دو بچے ہیں محمد مستقیم اور محمد تمیم۔ محمد تمیم پانچ سال کی عمر کا ہے وہ خاصی اردو بول لیتا ہے۔ اس کو میں میر، غالب اور ناصر وغیرہ کے کئی اشعار ازبر کرائے ہیں۔ محمد تمیم ابھی ایک سال کی عمر کا ہے۔ ان شاءاللہ اسے بھی اردو کا سپاہی بناؤں گا۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاءاللہ۔ ضرور اور ضرور جب میں نے اردو کی بقا کے لیے اپنے آپ کو پیش پیش رکھا تو پھر اپنی اولاد کو کیسے اس عظیم کام کے لیے پیچھے رکھ سکتا ہوں۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: وہی جو راحت اندوری نے کیا، جو لتا حیا نے کیا، جو بشیر بدر وغیرہ نے کیا۔ شعر سننا اور سنانا ہر کسی کو پسند ہے، بس جہاں کہیں غیر اردو کی محفل ہو وہاں موقع ومحل کی مناسبت سے شعر و شاعری کی محفل کو گرمائیں ماحول اپنے آپ کام کرے گا۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی کالجز یا یونیورسٹیاں ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں یونیورسٹی نہیں ہے البتہ یہاں جتنے بھی کالج ہیں ان میں اردو کو ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے اور وہاں اردو طلبہ و طالبات کی تعداد کافی اطمینان بخش ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: انھیں اردو کی اہمیت اس کی تاریخ اور اس سے جڑی گنگا جمنی تہذیب کے تمام علوم سے آگاہ کرانا ہے اور پھر ان سے اردو کی ترویج کے لیے مدد طلب کرنے کا ہاتھ آگے بڑھانا ہے۔ اگر وہ تنظیمیں مالی مدد کے لیے تیار ہوں گی تو پھر ان سے رشتہ مزید مضبوط کرنے کی ٹھان لینی چاہیے۔

س: کیا سینٹرل اسکولوں اور نو ودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ ایک المیہ ہے کہ ایسے اداروں میں ہندی اور انگریزی بڑے چاؤ سے پڑھائی جارہی ہے مگر اردو کے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ جہاں مسلمان بچے اردو پڑھنا چاہتے ہیں وہاں یہ مضمون ہی نہیں ہے۔ اب اگر کہیں پر اردو پڑھائی بھی جاتی ہے تو اس زبان کو پڑھنے والے بچے بہت کم ہیں۔ جہاں تک ہمارے علاقے کا تعلق ہے تو یہاں چونکہ اردو کا ماحول قدرے بہتر ہے۔ اس ضمن میں یہاں دو نو ودے ودیالیہ اسکول ہیں اور اسی طرح تین سینٹرل اسکول ہیں، دونوں میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اور بچے اس زبان میں دلچسپی بھی لے رہے ہیں۔

■

Sajad Ahmad Najar
Umer Colony Washbug
Pulwama- 192301 (Kashmir)
Cell. No: :9858667464

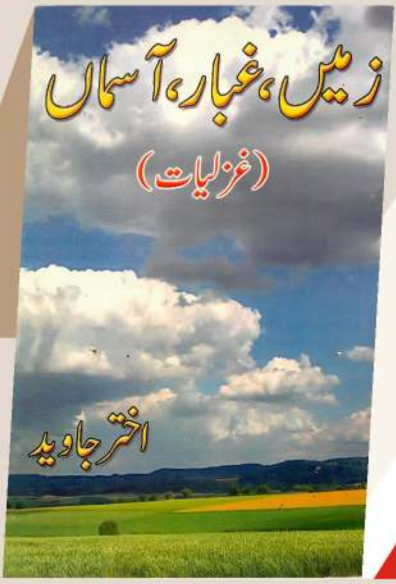

اختر جاوید ایک پانچ سالہ بچہ

غالبًا ستمبر 2014 کی کوئی تاریخ تھی کہ میرے چیمبر میں پیون نے آکر بتایا کہ کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا ان سے کہو میں دو بجے کے بعد لوگوں سے ملتا ہوں تو پیون نے بتایا کہ وہ کولکاتہ سے آئے ہیں اور آپ کے لیے کچھ تحفہ لے کر آئے ہیں، کولکاتہ کا نام سنتے ہی اچانک میری عمر کم ہوگئی اور میں چالیس سال چھوٹا ہوگیا جوانی واپس آگئی۔ میں نے انھیں فوراً لانے کے لیے کہا۔ ذہن پر لاکھ زور دیا لیکن میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ تب انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور اخبار میں لپٹا ہوا وہ تحفہ مجھے دیا جو انھیں اختر جاوید نے دیا تھا۔ تحفہ اختر جاوید کی غزلوں کا انتخاب تھا۔ میں نے لانے والے کا شکریہ ادا کیا اور کتاب کو دراز میں رکھ دیا۔ کلاسیز ختم ہونے کے بعد میں نے اختر جاوید کی کتاب لی اور گھر چلا گیا۔

رات کے وقت کتاب کو اخبار کے پردے سے آزاد کیا تھا۔ سامنے 'زمین، غبار آسماں' تھا۔ جی ہاں یہی عنوان ہے۔ اختر جاوید کی غزلوں کے انتخاب کا، پشت پر ان کی تصویر اور کچھ ذاتی معلومات درج ہیں تصویر دیکھتے ہی بلیلس روڈ (ٹکیہ پاڑہ) ہوڑہ میں اپنی رہائش گاہ یاد آگئی۔ جہاں اختر جاوید میرے چھوٹے بھائی قمر (جنھوں نے قمر کنڈوی کے نام سے شاعری بھی کی لیکن ان کی عمر نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی اور عین جوانی کے عالم میں 1985 میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا) کو ٹیوشن دینے آتے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے گھر کے فرد جیسے ہوگئے میری والدہ ان کے لیے کوئی بھی پکوان ہو سنبھال کر رکھتیں میری بہنیں ان کا خاص خیال رکھتیں اور سب سے چھوٹی بہن کوثر تو ان کا بے چینی سے انتظار کرتی کیونکہ وہ اس کے لیے ٹافیاں لے کر آتے تھے۔ اب اختر جاوید ماسٹر صاحب نہ ہوکر مرے دوست ہوگئے تھے اور آہستہ آہستہ ہم لوگ ایک دوسرے پر کھلنے لگے تھے۔ ان دنوں وہ بی اے میں تھے اور اپنے اخراجات کے لیے کچھ ٹیوشن کرتے تھے۔ ان کے ایک بڑے بھائی انور حسین ایک چھوٹے بھائی اظہر حسین۔ ایک بہن جمیلہ خاتون تھیں۔ ان کے والد محمد عبدالرزاق صاحب نے اپنی اہلیہ حفیظ النسا کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، سوتیلی ماں کے ساتھ ان کی کچھ اچھی نہیں گزرتی تھی۔ وہ اپنے گھر شاذ و نادر ہی جاتے تھے۔ کھانا بھی ادھر ادھر ہی یا ہوٹل میں کھاتے تھے۔ ان کا سونے کا ٹھکانہ زیادہ تر اسمٰعیل صاحب کے یہاں تھا جو پیل خانہ ہوڑہ میں رہا کرتے تھے۔ اختر جاوید اپنے دوستوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کا باتیں کرنے کا ڈھنگ اتنا انوکھا تھا کہ اس کی نقل مشکل ہے۔ خوبصورت چہرہ مگر اس پر اداس رونق جسے ان کی جھوٹی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتی رہتی۔ گھر سے ان کے تعلق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر ہم ایک دوسرے کو ان کے گھر تک پہنچانے میں گزار دیتے ٹکیہ پاڑہ سے پیل خانہ کی دوری شاید ایک کلومیٹر ہوگی لیکن ہم اس پر بیس کلومیٹر کا سفر طے کر کے رات صبح کا دامن پکڑا دیتے تھے۔

ایسی ہی ایک سرد چاندنی رات ہم نے ایک قبرستان میں گزار دی۔ ہوا یوں کہ اس سے پہلے والی رات کو ہمیں ٹکیہ پاڑہ اور پیل خانہ کے درمیان پولس نے پکڑ لیا لیکن بہت پوچھ کے بعد جب اسے پتہ چلا کہ ہم آوارہ گرد نہیں بلکہ شب گرد ہیں تو اس تنبیہ کے ساتھ ہمیں چھوڑا کہ ہم پھر سڑک پر رات کے وقت نظر نہ آئیں۔ لہٰذا اس رات ہم نے قبرستان میں گزارنے کی سوچی۔ ہم دونوں سردی کی وجہ سے سیاہ لباس میں تھے ہم لوگ بڑا قبرستان چلے گئے۔ وہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی اور ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر وہاں کا مجاور یا گورکن سوتا تھا۔ ہم جب قبرستان کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئے تو زمین پر گرے ہوئے سوکھے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے مگر پتے شور مچانے سے باز نہیں آرہے تھے۔ جیسے ہی ہم چبوترے کے قریب پہنچے چبوترے پر سویا ہوا تیزی کے ساتھ عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہوا گیٹ کی طرف بھاگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے مگر وہ اتنی تیزی سے بھاگا کہ ہم اس کا پیچھا نہیں کر سکے۔ ہم لوگ کچھ دیر تک بھاگتے ہوئے شخص کی پھٹی کمبل اوڑھ کر چبوترے پر پڑے رہے کہ شاید کوئی آئے مگر کوئی نہ آیا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ جمعے کے روز ایک آدمی نے اعلان کیا کہ وہ قبرستان میں نہیں سوئے گا چونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے وہاں دو بھوت دیکھے ہیں۔ اگر وہ نہ بھاگتا تو وہ اسے مار ہی دیتے۔ انھوں نے اس کا پیچھا بھی کیا لیکن جب وہ قبرستان کی حدود سے باہر نکل گیا تو بھوتوں نے ان کا پیچھا چھوڑا۔ سب لوگ اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہوا۔ اس پر زور دیتا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دو سیاہ بھوت دیکھے ہیں۔

درج بالا باتوں کا کوئی تعلق اختر جاوید کی شاعری سے نہیں لیکن ان کی نفسیات اور ایڈونچر پسند طبیعت سے ہے جو کہیں نہ کہیں ان کی شاعری میں بھی ضرور نظر آئے گی۔ دیکھیے درج ذیل اشعار ؂

اے رب ذوالجلال وسیع اور کر جہان
رخش خیال کہتا ہے چھوٹا ہے آسمان
کہیں سے کوئی راستہ نہ لوٹ جانے کا رہے
وہ اپنی کشتیوں کے بادباں کاٹ دیتے ہیں
چلنا ہے اپنا کام چلے جارہے ہیں ہم
منزل کا رخ کدھر ہے ہمیں کچھ خبر نہیں
ہم تو سفینہ ڈال چکے
دریا شور انگیز بہت

شاید ان کی ایڈونچر پسند طبیعت کا ہی سبب تھا کہ 'زمین غبار آسمان' کھولتے ہی چونک پڑا۔ جہاں اختر جاوید نے کتاب پر میرا نام لکھا تھا وہیں انھوں نے لکھا تھا ''میری عمر پانچ سال ہے۔ میں اب تک ایک بچہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے بزرگ سمجھا جائے'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تحریر کا کیا مطلب ہے۔ میں نے مزید صفحات الٹے تو اشعار پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بالکل بچوں کی طرح

زندگی اور دنیا کو گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں اور اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ کبھی اسے کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی اسے ہاتھ لگانے میں بھی ڈرتے ہیں۔ کبھی اس کے خلاف بغاوت کا علم بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی اس کے آگے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

صدی کی بات صدی جانتی نہیں ہوگی
اسے خبر بھی نہیں کیا گزرنے والا ہے
بھروسہ ایسے لوگوں پر کریں تو کس طرح کریں
سروں سے جو ہمارے سائبان کاٹ دیتے ہیں
جاوید اسے خونیں منظر نہیں بھاتے تھے
کچھ سوچ کے اس نے بھی شمشیر اٹھالی تھی

درج بالا اشعار کئی طرح کے جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہیں اور بالکل بچے کی نفسیات جیسے ہیں۔ بچہ کبھی کھیل کھیل میں سفینہ دریا میں ڈال دیتا ہے۔ انجام سے بے خبر۔ کبھی اتنا خوف زدہ ہوتا ہے کہ اس کی سانس تک کانپنے لگتی ہے۔ کبھی اسے زندگی بھوت کی طرح ہی نظر آتی ہے۔ کبھی اسے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ کبھی وہ ان لوگوں پر اس قدر خفا ہوتا ہے جو زندگی کے سر سے سایہ چھین لیتے ہیں کہ ان کے خلاف شمشیر تک اٹھالیتا ہے۔ کبھی وہ باغی بن کر کسی بھی ظلم کے آگے سر نہ جھکانے کا تہیہ کرتا ہے لیکن انسانی قدروں کے زندہ رکھنے والوں کے آگے سر بہ سجدہ بھی ہوجاتا ہے۔ الغرض بچہ زندگی کو ایک ایسا کمرہ سمجھتا ہے جس میں مختلف قسم کے کھلونے نہیں ہیں بلکہ ایک ہی کھلونا زندگی ہے جسے وہ مختلف شکلیں دیتا رہتا ہے۔ ان سے کھیلتا ہے اس کے ساتھ روتا ہے، اس کے ساتھ ہنستا ہے، اس کے ساتھ درد وغم میں شریک ہوتا ہے۔ زندگی کو ایک بچہ بن کر دیکھنا کتنا معصوم عمل ہے۔

اپنے آپ کو بچہ سمجھنے والا اختر جاوید دراصل ایسا بچہ تھا جس کے لیے پروین شاکر کہتی ہیں۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
سورج کی روشنی میں بھی جگنو کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

اختر جاوید کی گھریلو الجھنوں میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا اور ان کی اہل خانہ سے دوری بڑھتی جارہی تھی۔ آمدنی تھی نہیں اخراجات اپنی جگہ تھے ماسوا ٹیوشن کے دوسرا کوئی آسرا نہ تھا۔ چہرے پر پریشانی کے نقوش زیادہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ انھیں اپنی تعلیم جاری رکھنے میں بھی دشواری ہورہی تھی۔ ایسے میں ان کے زندہ رہنے اور زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ان کی نگاہ اک پری پیکر پر پڑگئی اور وہ ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگئے لیکن ان کا پیغام محبت ان کے محبوب تک پہنچائے کون؟ وہ کسی کو اس کا پتہ نہیں بتاتے تھے لیکن دوستوں کے سامنے اس کے حسن اور اس کے سراپا کا بیان اس طرح کرتے کہ وہ ان کی قسمت پر عش عش کرتے ان کے رازداروں میں میرے علاوہ اسمٰعیل تھے۔ ہم ان سے کرید کرید کر سوالات کرتے اور وہ جھینپ جھینپ کر ان کے کبھی جوابات دیتے کبھی ٹال جاتے۔ اس درمیان ان کی شاعری میں بھی ایک موڑ آیا۔ وہ اختر جو غیر سنجیدہ شاعری کرتا اکثر پیروڈیاں لکھتا۔ اچانک سنجیدگی کے ساتھ شاعری کرنے لگا۔ اس کی شاعری اب اس کی ذات سے دھیرے دھیرے وابستہ ہونے لگی۔ گرچہ ان میں رومانی پہلو زیادہ تھے، مثلاً

میں جانتا نہ تھا اس درجہ چاہتا ہے مجھے
کوئی مرے لیے چشم براہ ہوتا ہے
ہر شام امیدوں پہ اک اوس ہی پڑتی ہے
امید کی قندیلیں ہر شام جلاتے ہیں
کوئی خوشبو کی طرح آیا تھا دنیا میں مری
جاگتے میں سوچنا اور خواب میں بھی سوچنا

اور اس طرح ان کی شاعری میں درد و کسک کی آمیزش ہونے لگی جو آگے چل کر اور بھی پختہ ہوئی۔ ذات سے سماج کا ٹکراؤ، سماج کا شاعر کی ذات سے مذہب اور خدا پر بھی یقین کامل کبھی تشکیک کی صورت۔ دریں اثنا اختر جاوید صاحب کو ان کا محبوب مل گیا۔ حسن آرا اپنے نام ہی کی طرح اختر صاحب کو اپنے حسن سلیقہ سے ایک ذمے دار شہری بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ انھوں نے تعلیم بھی حاصل کی پھر ملازمت بھی انھیں مل گئی۔ ہمارا ملنا جلنا بھی اب کم ہوگیا تھا۔ وہ اپنی گریلو زندگی میں الجھتے گئے۔ میں بھی بلیلس روڈ ہوڑہ میں اب نہیں تھا بلکہ چاندی چوک اسٹریٹ کلکتہ میں رہنے لگا تھا۔ گاہے گاہے ملاقات ہوجاتی تھی۔

اس دوران زندگی اور دنیا کی حقیقتوں کو سمجھنے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کی اہلیت اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ خارجیت سے داخلیت اور داخلیت سے خارجیت کا سفر طے کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں اور جب اختر جاوید کی یہ صلاحیت اجاگر ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔

مرے پائے سفر کو ہر جگہ صدمات آئے ہیں
کہیں تو کھائی لکھی ہے کہیں گہرائی لکھی ہے
تری دنیا میں شور و شر نہیں سناٹا ہے ہر سو
ترتی قسمت میں تو جاوید بس تنہائی لکھی ہے

ان اشعار کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر جاوید جب اپنی زندگی کے اندر جھانکتے ہیں تو ان کا نظریہ منفی ہوجاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے مثبت خیال کا بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ اظہار کیا ہے، جیسے۔

جاوید مجھے فتح کی امید بہت ہے
اب عزم مصمم و ارادہ بھی بہت ہے
شب ستم کی عمر تھوڑی رہ گئی ہے دوستو!
چلے ہیں اب فصیل شب کی سرحدوں کو کاٹنے

ہم جب کسی تخلیق کار کا تجزیہ کرتے ہیں تو اپنے بنائے ہوئے کچھ اصولوں اور ضابطوں کے تحت اس کی تخلیق کو اپنے بنائے ہوئے، کچھ خانوں میں رکھتے ہیں۔ روایت، ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت ریا رومانس، خمریات، حقیقت پسندی وغیرہ حالانکہ شاعر کب کس جذبے اور احساس کے تحت شعر کہتا ہے۔ اس کا پتہ خود شاعر کو بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب تک تخلیق نہ ہوجائے خود شاعر کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں اس شاعری کے بارے میں قطعی نہیں کہہ رہا ہوں جو سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کی جاتی ہے۔ اختر جاوید ایک ایسے شاعر ہیں جو سوچ سمجھ کر شعر نہیں کہتے بلکہ جیسا وہ محسوس کرتے ہیں ویسا ہی اظہار کرتے ہیں۔ یہ اظہار ناقدین کے لیے کئی در کھولتا ہے لیکن شاعر اس سے بالکل بے پروا کبھی طنز و مزاح کا انداز اختیار کرتا ہے، کبھی ناصح کا کبھی انقلابی کا اور کبھی ایک دوست کا۔ ان کا ڈکشن دوسروں سے قطعی مختلف ہے اور یہی چیز اختر جاوید کو دوسروں کے مقابلے میں ممتاز کرتی ہے۔ ان باتوں کا اندازہ کچھ درج بالا اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

دروازوں پر ٹاٹ کا پردہ اس سے کیا
اپنے گاؤں کا چہرہ چہرہ آنکھ میں ہے
ہمارا حال کسی پر عیاں نہیں ہوتا
اک آگ جلتی ہے لیکن دھواں نہیں ہوتا
شور تو میں بھی سنتا ہوں اختر جاوید
سب روتے ہیں آخر نوحہ کس کا ہے
قلم کی نوک سے الفاظ ڈھلتے رہتے ہیں
صریر خامہ سے بس بت نکلتے رہتے ہیں
وہ ہر اک سے پوچھتے ہیں کھورس ہے اس میں اتنا
مرے شعر مثل پھل ہیں وہ مسل کے دیکھتے ہیں
ہر چند بے ضرر ہیں مگر ہیں ضرر رساں
کاغذ کے شیر بھی تو گرجتے ہیں شہر میں

افسوس کہ اپنی انفرادی سوچ ایک منفرد قوت اظہار کے شاعر بہت زیادہ سنجیدہ شاعری نہیں کرسکے اور دسمبر 2016 میں ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

■

Badnam Nazar
Village: kunda, Post office:Pathraita
District...Sheikhpura, Pin..811105.Bihar
Mob. 9661147635

بدر محمدی

حیرت فرخ آبادی کا شعارِ تغزل

حیرت فرخ آبادی سے حیرت کا تعلق اس قدر ہے کہ ان کا اصل نام جیوتی پرساد مشر تھا۔ وہ عیسائی مذہب کے پیروکار تھے اور انگریزی کے استاد۔ ان سب کے باوجود وہ اردو شاعری کے دلدادہ رہے۔ ان سے وابستہ حیرت کی باتیں اور بھی ہیں جنھیں حیرت نے خود اپنی زبانی پیش کی ہیں کہ ان کی زندگی نشیب و فراز سے دوچار رہی۔ ان کے نام کے ساتھ فرخ آباد کی مناسبت ہے اور میدان عمل شہر رانچی۔ حیرت کی پیدائش 1930 میں بہرائچ میں ہوئی اور تعلیم و تعلم اتر پردیش کے مختلف شہروں میں۔ انھوں نے 1952 میں باقاعدہ شاعری شروع کی۔ 1987 میں ان کا اولین شعری مجموعہ 'نوائے سازِ دل' منظر عام پر آیا اور 21 سال بعد 2008 میں دوسرا مجموعہ 'حسن التماس' شائع ہوا۔ اس طرح حیرت فرخ آبادی نوائے سازِ دل کے شاعر ہوئے اور حسن التماس کے بھی۔ حیرت فرخ آبادی کی شاعری کی ابتدا اور نشو ونما روایتی انداز میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روایت کا پاس و لحاظ، عزت و احترام بالخصوص نمایاں ہے۔ اپنی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کو زود گوئی میں انھوں نے ضائع نہیں کیا۔ وہ زود گو نہیں کم گو شاعر تھے۔ اس کم گوئی کی وجہ ان کے یہاں پختگی اور پرگوئی کا حسن پایا جاتا ہے۔ ان کی شعوری بالیدگی کی وجہ تجربے و مشاہدے سے استفادہ اور اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے۔ انھوں نے انگریزی شعر و ادب کی بھی بیش از بیش ورق گردانی کی اور اپنی شاعری کے لیے خود نقاد بننے کا شرف حاصل کیا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں جہاں روایت کا احترام ہے وہیں عہد حاضر کے تقاضوں اور فنی ضرورتوں کا پاس و لحاظ بھی۔ کلاسیکی مزاج کا یہ شاعر نئے امکانات سے باخبر ہونے اور نئے نشانات کو سمیٹنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ حیرت فرخ آبادی نے نظم، گیت، رباعی اور قطعات بھی لکھے ہیں مگر بنیادی طور پر ان کی حیثیت غزل گو شاعر کی ہے۔

شاعر کی کسی غزل یا غزل کے کسی شعر کا عنوان نہیں ہوتا۔ غزل خود ایک عنوان ہے، جس سے مراد متفرقات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غزل میں کئی موضوع اور مضامین ہوتے ہیں۔ حیرت فرخ آبادی کی غزلوں میں بھی یہ خاصیت ہے۔ ان کی شاعری کے شیڈس مختلف ہیں۔ سارے شیڈس پر روشنی ڈالنا ایک مضمون میں ممکن نہیں لیکن کچھ مضامین کو موضوع کے اعتبار سے یکجا کیا جاسکتا ہے۔ غزل کا اوّلین موضوع اس کے لغوی یا اصطلاحی معنی سے منسوب ہے۔ چنانچہ حیرت فرخ آبادی نے بھی گفتگو بہ زناں کی ہے۔ اس عورت سے گفتگو جو رنگوں کا مرقع اور خوشبوؤں کا پیکر ہے۔ وہ شاعری کا جہان آرزو، متاعِ زندگی ہے۔ وہ اس قدر قریب ہے کہ اسے چھونا ممکن نہیں مگر محسوس کیا جانا ممکن ہے۔ شاعر نے اس کے لب و رخسار کا بھی ذکر کیا ہے اور حسن شعار کا بھی۔ وصل کی بھی بات کی ہے اور ہجر کی بھی کہ اس کا وصل گلاب کی شگفتگی ہے اور ہجر راستے میں کھڑی دیوار۔ محبوب کا وعدہ پیار بھرا ہے اور اس سے رشتہ زہر آلود۔ اس کا تن مٹی کا، دل پتھر کا ہے۔ وہ سوزشِ دل بھی ہے اور آرام جاں بھی۔ حیرت نے اپنی تشنہ لبی، بے کلی اور جانکنی کی سی کیفیت کا ذکر کیا ہے تو محبوب کی بے رخی، بے اعتنائی اور تغافل کی بھی بات کی ہے۔ معاملات حسن، احساسات عشق اور ان سے پیدا سوز نہانی کی تصویر اُبھاری ہے۔ رعنائی خیال کی حسین دنیا آباد کی ہے۔ حیرت فرخ آبادی نے محبوب کا رشتہ اپنی غزل سے یوں استوار کیا ہے۔

تمھارے حسن کا چرچا ہے عشق کے دم سے
رہا نہ عشق تو حسن و شباب کیا ہوگا

تمھارے عشق میں ہم کیوں ہوئے ہیں دیوانے
کہ جس کا دل نہ جلا ہو، بھلا وہ کیا جانے

قرب گر مل نہ سکا درد جدائی تو ملا
یہ تو ہے عشق کی سوغات تمھیں کیا معلوم

ہے وہ کتنا خوبصورت ہر ادا بھی دل نشیں
اس کی باتیں میٹھی میٹھی پر، اثر نشتر کا ہے

جادۂ عشق میں سایہ ہے کہاں پیڑ کہاں
رونا روتے ہو ابھی راہ میں ستانے کا

قصۂ مجنوں و فرہاد پہ سر دھنتے ہو
یہ تو میرے ہی فسانے کی کڑی ہے یارو

اسی امید پہ دن زندگی کے کاٹ دیے
شب وصال شب ہجر سے بڑی ہوگی

کاروبارِ شوق میں محبوب کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ اگرچہ عاشق یار کی مہربانیوں کا طلبگار ہوتا ہے مگر اسے نامہربانیاں عزیز ہوتی ہیں۔ اس کی کم نگاہی بھی باعث لطف لگتی ہے۔ دنیائے عشق میں برباد ہونا، آباد ہونے کے مترادف ہے۔ اسی بربادی سے افسانوں میں سرخی ہے۔ غم یار زندگی کا حاصل ہے۔ جہانِ محبت میں عقل نہیں دل کی چلتی ہے۔ دل جو کہتا ہے وہی معتبر ہوتا ہے۔ عقل محو تماشا رہتی ہے۔ دل عاشق اپنوں کا ستایا ہوتا ہے۔ غیر کی ستم رسانی بے معنی ہوتی ہے۔ وحشت دل کے اضافے سے ہوک سی اٹھتی ہے اور اسی سے دھڑکن قائم رہتی ہے۔ تن کو ٹھنڈی ہوا جلاتی ہے۔ جلتے ہوئے پتھر میں سلگتی ہوئی تنہائی رہتی ہے۔ عاشق کی طبیعت وہ صحرا ہے جس کی پیاس بادل کے برس جانے سے بھی نہیں

بجھتی۔ عاشق رنج کا خوگر ہوجاتا ہے اور پھر اس کا رنج جاتا رہتا ہے۔ المختصر محبوب کی ستم رسانی عاشق کے لیے لذت آمیز ہوتی ہے۔

غیروں کی دشمنی بجا یاروں کی کیا کہوں
یارب ترے جہان میں، میں جی لیا بہت
شکوہ جائز تھا اگر غیر ستاتے مجھ کو
مجھ کو اپنوں نے ستایا ہے کوئی بات نہیں
فسانہ اپنی بربادی کا کب تک کس طرح لاؤں
مرے ہی مہربانوں کی مہربانی ہوئی ہوگی
یہ مری فطرتِ دل تھی کہ مری نا سمجھی
مل گیا جو بھی اسے یار سمجھ بیٹھا ہوں
وہی ہوتا نہیں جو ہم چاہیں
ورنہ ہونے کو کیا نہیں ہوتا
ہم سے کچھ بدگمان ہے یہ دل
آج کل دشمنوں سے یاری ہے

ایسا ممکن نہیں کہ شاعر، وہ بھی عاشق شاعر، دل و دماغ کی بات کرے، دوست و دشمن کا ذکر چھیڑے اور اپنی بات نہ کرے۔ وہ خود پر فریفتہ ہوتا ہے۔ اسے خودی سے عشق ہوتا ہے۔ محبوب کے حصول میں محو ہونے کے ساتھ وہ خود سے بھی محبت کرتا ہے۔ وہ بے خود ہو کر خودی کی بات کرتا ہے۔ انا کی رہنمائی پاتا ہے۔ حسن اسے بے خودی کی راہ دکھاتا ہے تو عشق خودی کی۔ خوبصورت احساس سے وہ زندگی کو خوبصورت بناتا ہے۔ ذکر خودی سے خودداری کا اظہار کرتا ہے۔ شاعر خود سے خوش ہوتا ہے اور خود سے خفا بھی رہتا ہے۔ اپنی آواز وہ خود سنتا ہے۔ جب خود کو بہ نظرِ غائر دیکھتا ہے تو آپ کو سب سے برا پاتا ہے۔ یہ برائی اس کے لیے بھلائی کی بات ہوتی ہے اور اس میں دوسروں کے لیے سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔

مجھے عشق ہے خودی سے میں فریفتہ ہوں خود پر
نہیں جو قریب میرے وہ میرا خدا نہیں ہے
یہ کیا کم ہے کہ حیرت اس جہاں میں
نہیں ہے کچھ کہ جب تک ہم نہیں ہیں
کون دیتا ہے صدا تنہائی میں
کچھ نہیں یہ خود مری آواز ہے
اپنی آواز خود ہی سنتا ہوں
میں نے جب جب تجھے پکارا ہے
ہم نے حیرت مٹا لیا خود کو
آدمی ہے کوئی برا ہم سے
جانے کیا ہوگیا ہے حیرت کو
خود سے خود ہی خفا سا رہتا ہے
پیچھے پیچھے کوئی خنجر سا لیے آتا ہے
یہ تو خود ہی مرا سایہ ہے کوئی بات نہیں

زندگی کی سب سے بڑی پونجی غم زندگی ہے۔ شمع زندگی روغن غم سے ہی روشن رہتی ہے۔ گریۂ غم سے شاعر کا سینہ بھرا ہوتا ہے۔ حیرت فرخ آبادی کی شاعری میں غم جذب و پیوست ہے۔ اس میں غم کی روانی، حزن و یاس کی دھیمی آنچ، خستگی و نرمی اور درد و کرب کا ارتعاش ہے، حیرت کو شعورِ غم، تفہیم غم ہے۔ دل حیرت میں غم اس قدر جاگزیں ہے جیسے کوزے میں سمندر سمویا ہو۔ عام طور پر غم زندگی کو نڈھال کر دیتا ہے مگر کبھی غم زندگی کو سنوارتا بھی ہے۔ آدمی کو سنبھالتا بھی ہے۔ غم ایک دوست کی طرح ہے جو ہمیشہ پاس رہتا ہے۔ غم نصیب ہونا بھی قسمت کی بات ہے۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہیں کہ احساس غم ہی احساسِ زندگی ہے۔ غم کے بغیر زندگی بے لطف ہے۔

سب کی قسمت میں غم کہاں یارو
اہل تقدیر اس کو پاتے ہیں
وقت شام جب آیا غم ہر ایک جانب سے
جمع ہو گئے دل میں، وقت ہے بسیرے کا
ہے غم عشق کبھی یا غم دنیا ہے کبھی
میں وہ دیپک ہوں جو بجھ بجھ کے جلا ہے یارو
آہوں کو سنوارا ہے زخموں کو سجایا ہے
ہم نے یہ شعور غم اک عمر میں پایا ہے

غم، انتشارِ احساس کا نام ہے اور انتشارِ احساس کا تعلق وقت کے بدلتے منظر نامے سے ہے۔ آدمی کو صرف غم عشق نہیں غم روزگار سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر اپنے زمانے کی تبدیلیوں سے علاحدہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے دور کی تلخیوں اور کرب ناکیوں سے اس کی علاحدگی ممکن نہیں۔ شاعر حیرت فرخ آبادی گرد و پیش کی ویران اور تاریک ہوتی زندگی سے دل برداشتہ دکھائی دیتا ہے کہ بے رحم دنیا میں جینا مشکل ہے۔ صدق دلی عنقا ہوگئی ہے۔ ناانصافی، استحصال، جور و ظلم کا غلبہ ہے۔ تہذیب برباد ہوتی جارہی ہے۔ ہر سو خاموشی مسلط ہے۔ یہ خاموشی، راز غم دل میں چھپانے کے لیے ہے۔ تمام رشتے نمائشی ہوگئے ہیں۔ مطلب اور غرض کے یہ رشتے دہک رہے ہیں۔ انسانی آبادی جھلس رہی ہے۔ دل کے نازک پھول کمہلائے ہیں۔ احساس پہ تھکن چھائی ہے۔ چاند کی ٹھنڈی کرن تیر سی چبھتی ہے۔ چھاؤں میں دھوپ کی گرمی ہے۔ زندگی درد کا منظر ہوگئی ہے۔ آدمی اندر سے سسک رہا ہے۔ سانسوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ ہر سانس بھاری ہوگئی ہے۔ حیرت فرخ آبادی نے ان مکانوں کی نبض بھی ٹٹولی ہے۔ جن کی سانس گھٹی گھٹی سی ہے۔

زندگی پر نکھار تھا کل تک
آج ہر سانس ہم پہ بھاری ہے
پیاس صحرا کی بجھ سکے کیونکر
اب کے بادل میں بس نمی سی ہے
اب کوئی بھی وہاں نہیں رہتا
ساری بستی میں خامشی سی ہے
چار سو لگ گئی ہے چپ سی کیوں
دم نہ گھٹ جائے کچھ کلام کرو
چار سو جلتی ہوئی خاموشیاں پھیلی ہوئیں
راستے مسدود ہیں ویرانیاں پھیلی ہوئیں
تشنگی ہی تشنگی چاروں طرف بس تشنگی
جانب صحرا اڑے جاتے ہیں وہ آبی پرندے
بدلی ہوئی ہے اب کے جہاں کی فضا بہت
آتی ہے اب تو دھوپ میں جل کر ہوا بہت

نامساعد حالات میں محصور ہونے کے باوجود شاعر حیرت فرخ آبادی کا عزم و حوصلہ جوان ہے۔ اس شاعر کا خاندانی پس منظر بھی جانفشانی سے بھرا ہے۔ یہ ندی باڑھ کے پانی سے چڑھی ہے۔ چنانچہ حیرت فرخ آبادی نے سعیِ پیہم کا درس دیا ہے کہ للکار کے جو آگے بڑھتا ہے وہی موتی پروتا ہے۔ دل میں اک ذرا دیوانے کی خو چاہیے۔ حیرت نے طوفان کا رخ موڑنے کی خاطر جوانوں کو اٹھ کھڑے ہونے کی ہدایت دی ہے کہ تو غم سے گھبرانے والا نہیں، مجبور نہیں، چاہے تو سینۂ افلاک چیر دے۔

حوصلۂ جنوں کا کیا کہنا
اب تو منجدھار بھی کنارہ ہے
منزلیں سب راستہ بنتی گئیں
طائر دل مائل پرواز ہے
ہر جگہ رکنا مناسب ہے کہاں
یوں تو رستے میں بہت آتے ہیں گھر
ذرا گھر کی ہوا ہی کے مقابل ہو لیں
حوصلہ ہے جنھیں طوفان سے ٹکرانے کا
غم دوست در حقیقت ترا رہنمائے منزل
وہی کم نگاہ نکلا جسے حوصلہ نہیں ہے
ملی تحسین دل کے حوصلوں کو خود ہی طوفاں سے
وہی ڈوبے کہ جن کو چاہ تھی طوفاں میں ساحل کی
زندہ رہنے کا لو سبق ہم سے
حوصلہ دل میں ہے ابال تو ہے

عزم و حوصلہ کم ہو تو وہ عزم و حوصلہ نہیں لہٰذا انھیں اس قدر ہونا چاہیے کہ ان کا شمار جنوں یا دیوانگی میں ہو۔ حیرت

فرخ آبادی کو عقل وخرد کے عوض دیوانگی عزیز ہے۔ یہ دیوانگی سے مانوس شاعر ہے۔ حیرت کی شاعری دیوانگی کی دین ہے۔ وہ دیوانگی جس کا جادو قیس، فرہاد، میرا اور منصور پر چلا۔ جن منزلوں سے ڈر کر فرشتے واپس آگئے۔ ان منزلوں پر صرف دیوانے گئے۔ حیرت کے پاؤں میں کوئی نہ کوئی زنجیر پڑی ہے۔ اس شاعر کا جنوں لائق تحسین ہے کہ اس جنوں نے ریگ زاروں کو گلزار بنا رکھا ہے۔ یہ شاعر رکا نہیں ہے بلکہ جنون آوارگی سے اس کا سفر رواں ہے۔

کل شب مجھے اک شخص نے آئینے میں گھورا بہت
پوچھا بتا تو کون ہے اس نے کہا دیوانگی
وہ دیر ہو کہ جرم ہو یا ہو تری محفل
کہاں کہاں نہ گئے ہیں جنوں میں دیوانے
نہ جنوں کی حد ہے کوئی نہ ہے عشق میں مقید
کہاں جا رہا ہوں یارو مجھے خود پتہ نہیں ہے

ہمت و حوصلے سے کام لیا جائے تو کار دشوار انجام دینا آسان ہو جائے۔ عزم محکم کا تعاون لے کر دل کو دل سے ملایا جائے۔ سبھوں کو اپنا بنایا جائے۔ اخوت کا چلن یاد کیا جائے۔ محبت کا چمن آباد کیا جائے۔ خود غرض نہ بن کر دوسروں سے غرض رکھی جائے۔ اوروں کی پیاس بجھانے کے لیے سمندر نہیں دریا بنا جائے۔ وہ آدمی بھی کیا جو کسی کے کام نہ آئے، دوسروں کے دکھ درد کو نہ اپنائے۔ یہی پیام انسانیت ہے یہی پیغام وقت ہے۔ حیرت فرخ آبادی نے بنی نوع انسان سے محبت، رواداری اور درد مندی و ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کی حمایت کی ہے۔

یونہی گزار دی جو زندگی تو کیا حاصل
کسی کے کام جو آئے تو کوئی بات بنے
رہِ خلق میں لٹا دے جو متاعِ زندگانی
وہی بندۂ خدا ہے وہ اگر خدا نہیں ہے
کوئی لاشوں پہ نہ روئے نہ بستیاں اجڑیں
اتنا سوچیں کہ سبھی ہم اسی گھربار کے ہیں
چلنا پڑتا ہے وقت کے ہمراہ
وقت کب کس کے ساتھ چلتا ہے
ہے وہی بندۂ خدا حیرت
جس کو غم بے کسوں کا پیارا ہے

حیرت فرخ آبادی نے نہ صرف انسان کو انسان کے کام آنے کی بات کہی ہے بلکہ باہمی اتفاق و اتحاد پر بھی زور دیا ہے۔ مذہب کی تعلیم سے نیک بننے اور آپسی اختلاف کو مٹا کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر خوش گوار زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی طرفداری کی ہے تاکہ ساری دنیا خوشحالی اور بھائی چارے کی خوشبو کی طرح

حیرت فرخ آبادی نے نہ صرف انسان کو انسان کے کام آنے کی بات کہی ہے بلکہ باہمی اتفاق و اتحاد پر بھی زور دیا ہے۔ مذہب کی تعلیم سے نیک بننے اورآپسی اختلاف کو مٹا کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر خوش گوار زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی طرفداری کی ہے تاکہ ساری دنیا خوشحالی اور بھائی چارے کی خوشبو کی طرح پھیل جائے اور امن و سکون قائم ہو۔ حیرت کو دیرو حرم کی تفریق پسند نہیں۔

پھیل جائے اور امن وسکون قائم ہو۔ حیرت کو دیر و حرم کی تفریق پسند نہیں۔ مشترکہ تہذیب کے علمبردار حیرت فرخ آبادی نے ظاہر داری کی مخالفت کی ہے۔ مشترکہ ثقافت، اخوت و محبت، رواداری اور باہمی یکجہتی کی ہدایت دی ہے۔ ہندو مسلمان اور عیسائی کی نہیں انسان کی بات کی ہے۔ انھوں نے اقبال کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ توازن پسند طبیعت کے مالک حیرت فرخ آبادی دیر و حرم کے منکر نہیں بلکہ دونوں میں اتحاد چاہتے ہیں۔ انھوں نے دیر و حرم کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔

تری جستجو کے صدقے یہ کھلا ہے راز مجھ پر
کہ میانِ دیر و کعبہ کوئی فاصلہ نہیں ہے
تم ہی تم ہو ہر ایک شے میں عیاں
کس لیے پھر یہ پردہ داری ہے
ہم نے نزدیک سے دیکھا ہے یہی سمجھا ہے
رنگ کعبہ کا وہی ہے جو ہے بت خانے کا

اشعار حیرت میں حساس اور درد مند وجود کا جوہر ہے۔ ان میں درد میں ڈوبے ہوئے دل کی صدا ہے۔ خونِ دل سے شاعری کو سینچنے کی بات ہے۔ اندر اور باہر سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے کے بعد سمیٹ لینے کی کوشش ہے۔ زخموں کو زباں دینے کا عمل ہے۔ حیرت نے دل بہلانے کے لیے شاعری کی ہے مگر ہر شعر میں فکر کی گہرائی بھی ہے۔ اس لیے ان اشعار میں کسک ہے۔ کسی کا غم حیرت کی شاعری کا روح رواں ہے۔ اس لیے تاثیر کا عنصر غالب ہے۔ حیرت کا تخلیقی شعور بالیدہ ہے۔ طرز بیاں سادہ اور سلیس ہے۔ انھیں رموز وعلائم کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ لفظوں کو موتیوں کی طرح پرونے پر وہ قادر تھے۔ حیرت کی شاعری دل اور دماغ کی شاعری ہے۔ اس شاعری میں روشنی ہے، زندگی ہے۔ شاعر نے زیست کا ترانہ سنایا ہے۔ آوارہ خیال کو شائستگی بخشی ہے۔ زخم کرید کر جی بہلایا ہے۔ زخموں سے دل میں چراغاں کیا ہے۔ شاعر کے دل کا زخم ہرا ہے۔ حیرت کی شاعری احساس کا سرمایہ ہے۔ پرانے درد کی نئی پیش کش ہے۔ حیرت نے شبنم سے آنچ نکلتے دیکھی ہے۔ ضمیر کی ملامت برداشت کی ہے۔ آہ کو سلگتے پایا ہے۔ حیرت کی شاعری میں روایت بھی ہے ترقی پسندی بھی۔ جدیدیت بھی ہے اور مابعد جدیدیت بھی۔ حال بھی ہے، ماضی اور مستقبل بھی۔ کلاسیکی مضامین بھی ہیں اور جدید موضوعات بھی۔ سایۂ دیوار بھی ہے اور سرابوں کی فصیل بھی۔ حیرت نے زمین پر زمین کی بات کی ہے اور آسماں کو بھی یاد کیا ہے۔ رہبر کا بھی ذکر کیا ہے اور رہزن کا بھی۔ بھائی چارے کی بات کی ہے اور فساد کی بھی۔ دوست کو بھی یاد کیا ہے اور دشمن کو بھی۔ مذہب اور نیکی کی بات بھی کی ہے اور شراب و گناہ کو بھی قافیہ بند کیا ہے۔ چنانچہ بیاض حیرت میں ہر طرح کی تخلیق ہے۔ ذہن کو چھونے والے اور دل میں اترنے والے اشعار ہیں۔ البتہ کوئی شعر اتنا معیاری ہے کہ تہہ بہ تہہ پرتوں کا احساس ہو، اور کوئی شعر اس قدر عامیانہ کہ تشبیہ و استعارہ پس پشت پڑ جائے۔ دریا اور قطرے کا یہ فرق باعث حیرت ہے۔ ویسے حیرت نے حیرت یعنی تعجب کے تناظر میں بھی اپنے تخلص کا استعمال بخوبی کیا ہے۔

جس کے شعروں میں ہے غضب کی کسک
اور کوئی نہیں ہے حیرت ہے
دور حیرت تمہاری ہے منزل
درد کو اور تیز گام کرو
زخم سب دل کے بھر گئے حیرت
چوٹ کھاؤ کہ جی نہیں لگتا
مست آنکھوں نے پلا دی کچھ ایسی حیرت
رنگ پھیکا سا نظر آتا ہے میخانے کا
بے حسی اتنی چھائی ہے حیرت
لو بھی لگتی ہے اب تو ٹھنڈی سی
اپنی ہستی کا بھی کچھ مجھ کو پتہ ملتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ ہیں حیرانیاں پھیلی ہوئیں

■

Dr. Badr Mohammadi
AT.: Chandpur Fatah
P.O..: Bariarpur - 843102
Distt.: Vaishali (Bihar)
Cell.: 9939311612
E-mail: badrmohammadi1963@gmail.com

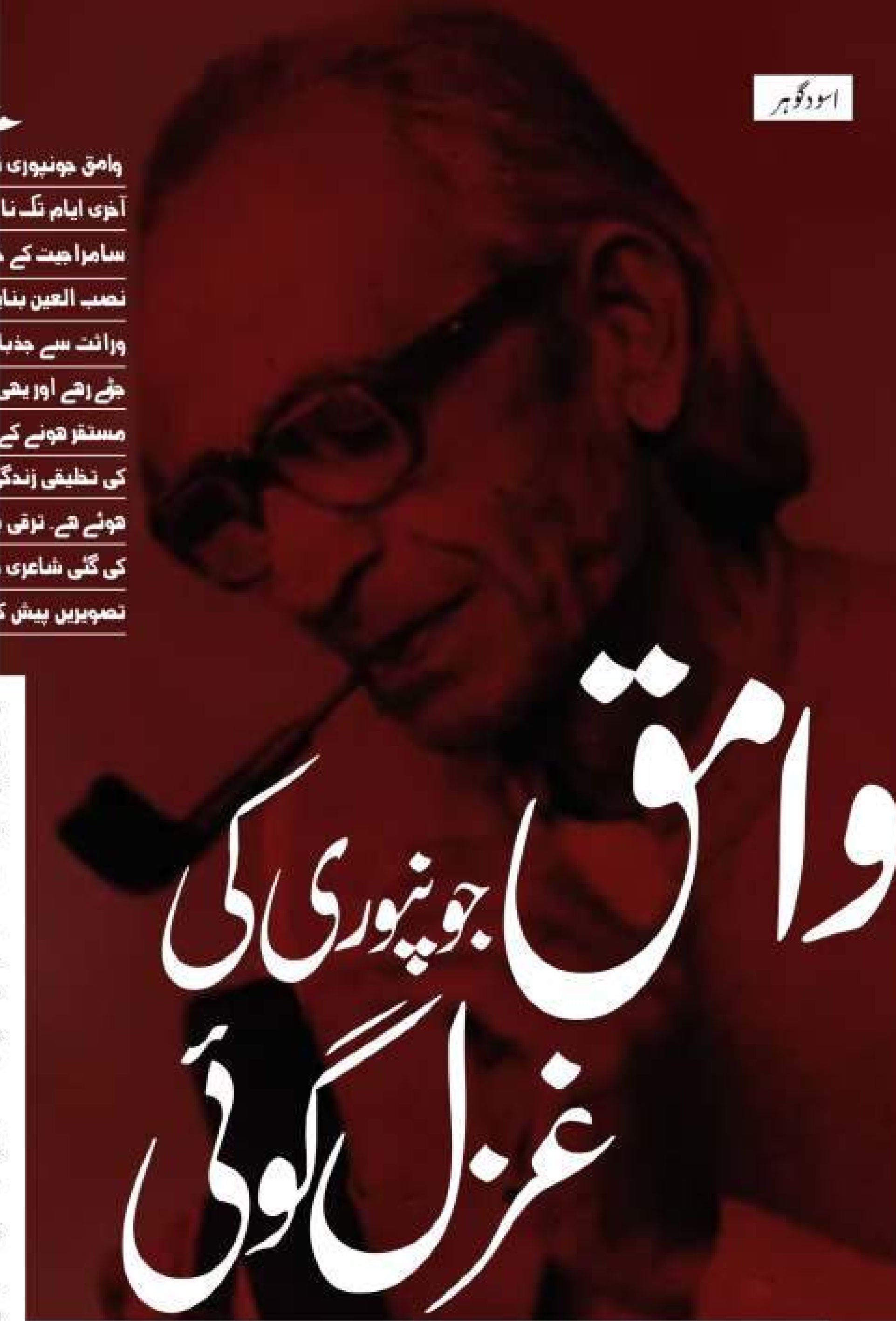

وامق جونپوری کی غزل گوئی

اسود گوہر

وامق جونپوری نے زمانہ طالب علمی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک نا انصافی، ظلم و استحصال، جبر و استبداد اور سامراجیت کے خلاف آواز اٹھائی اور انسانیت و مساوات کو اپنا نصب العین بنایا۔ تہذیبی و ثقافتی وابستگی اور خاندانی وراثت سے جذباتی لگاؤ کے سبب وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ جڑے رہے اور یہی وجہ رہی کہ انھوں نے کسی بڑے شہر میں مستقر ہونے کے بجائے اپنے گاؤں کی کوٹھی ہی میں پناہ لی۔ ان کی تخلیقی زندگی کی داستان اپنے اندر پون صدی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک اور جنگ آزادی کے پس منظر میں کی گئی شاعری میں انھوں نے بیسویں صدی کی منہ بولتی تصویریں پیش کی ہیں۔

میں فن ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر

وامق جونپوری کا اصل نام سید احمد مجتبیٰ تھا۔ 23 اکتوبر 1909 کو موضع کجگاؤں ضلع جون پور میں ان کی پیدائش ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی بعد میں بارہ بنکی سے 1926 میں ہائی اسکول اور گورنمنٹ کالج فیض آباد سے 1929 میں سائنس میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے 1935 میں بی اے پاس کیا اور بعد میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے کلام کے مجموعے چیخیں، جرس، شب چراغ اور سفرنا تمام ایسے مجموعے ہیں جنھوں نے ادب میں اپنی افادیت وانفرادیت کے سبب بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک نا انصافی، ظلم واستحصال، جبر و استبداد اور سامراجیت کے خلاف آواز اٹھائی اور انسانیت ومساوات کو اپنا نصب العین بنایا۔ تہذیبی وثقافتی وابستگی اور خاندانی وراثت سے جذباتی لگاؤ کے سبب وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ جڑے رہے اور یہی وجہ رہی کہ انھوں نے کسی بڑے شہر میں مستقر ہونے کے بجائے اپنے گاؤں کی کوٹھی ہی میں پناہ لی۔ ان کی تخلیقی زندگی کی داستان اپنے اندر پون صدی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک اور جنگِ آزادی کے پس منظر میں کی گئی شاعری میں انھوں نے بیسویں صدی کی منہ بولتی تصویریں پیش کی ہیں۔ شیرازِ ہند جون پور کے اس قد آور شاعر کا 21 نومبر 1998 کو انتقال ہوگیا۔

جس ماحول میں وامق نے آنکھ کھولی اس وقت ان کے خاندانی دبدبے کا یہ حال تھا کہ دو چار ضلعے میں کوئی سرکشی بھی کرتا تو اس کی گرفت سے پہلے اس سے سوال کیا جاتا تھا کہ کیا اپنے کوڑھواں (عرف عام میں کجگاؤں کو کوڑھواں کہا جاتا ہے) کا سید سمجھتا ہے۔ ان کی حویلی سے باہر نکل کر عوام الناس سے ملنا جلنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں وامق کا اپنے ماحول سے بغاوت کرنا عوام الناس سے ملنا، ان کے مسائل کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ سماج بھی اکثر اس روپ کو سمجھ نہیں پاتا اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس بات کا ذکر وامق نے اپنی ڈائری میں اس طرح کیا ہے:

''ہمارے ساتھی (جو زیادہ تر سینئر تھے) کہا کرتے تھے ارے بھائی! جانتا ہوں یہ لوگ جونپور کے زمیندار خاندان کے ہیں... یہ لوگ کمیونسٹ تحریک... یہ اور ترقی پسند تحریک... یہ کچھ نہیں... یہ عین وقت پر دھوکہ دینے والے ہیں۔ انھیں کسی خفیہ میٹنگ میں نہیں بلانا چاہیے۔ یہ کسانوں میں سے نہیں ہیں۔ یہ مزدوروں کے خاندان کا لڑکا نہیں ہے۔ اس لیے اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے ان باتوں سے بڑی تکلیف ہوتی...''

بداعتمادی کے اس ماحول نے وامق کو ڈگمگانے نہیں دیا بلکہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں و

عقیدے کو گلے لگائے رہے اور کبھی سمجھوتا نہیں کیا جوان کی فطرت صالحہ کا بڑا ثبوت ہے۔ انسان حالات زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے تغیرات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی سوچ کو بدل کر نئی فکر کو اپناتا ہے چونکہ ادیب و شاعر زیادہ ہی ذکی الحس ہوتے ہیں اس لیے بدلتے ہوئے حالات سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اپنی ڈائری میں اپنے احساسات کا بیان وانق اس طرح کرتے ہیں:

''میری ذات سے وابستہ دو حادثوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک یہ کہ میں 1909 کو پیدا ہوا کہ زندگی بھر اپنے وجود کا خمیازہ بھگتا کروں دوسرا حادثہ 1940 میں یہ ہوا کہ میں ایک دم شاعر بن گیا۔''

1940 یعنی وامق کی جوانی کا دور جہاں ایک طرف جوانی کے تقاضے انھیں روایتی شاعری کے لیے مجبور کر رہے تھے تو وہیں دوسری طرف ترقی پسند تحریک، جنگ، جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام لوٹ کھسوٹ کر رہا تھا اور یہ معاشرتی مسائل وامق کو اپنی جانب مراجعت پر اکسا رہے تھے۔ ان کی ابتدائی دور کی غزلوں کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

عقدہ نہ آج تک کھلا چشم مست کا
ساغر میں ہے شراب کہ ساغر شراب میں
وامق برائے کیف بدلتا ہوں کروٹیں
کچھ زندگی کا لطف تو ہے اضطراب میں

کھویا کھویا سا پا کے ہمیں وہ دل کی باتیں جان گئے
اور ان کا تجاہل دیکھتے ہی ہم ان کی نظر پہچان گئے

اس وقت وامق کے جو احساسات تھے ان کے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''اس وقت جنگ پورے شباب پر تھی سارے ملک میں بھوک اور برہنگی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ فرنگی اور امریکی سپاہی سڑکوں اور گلیوں کو روندتے پھر رہے تھے پست متوسط طبقے اور غریبوں کے گھر ویران اور چکلے خانے آباد ہو رہے تھے۔ مذہبی رہنما جنت اور دوسرے جہنم کی بشارت دے دے کر صبر وشکر کی تلقین فرما رہے تھے۔ یہ حال دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ جس قسم کی روایتی شاعری میں کر رہا ہوں وہ ایک نا قابل معافی اخلاقی جرم ہے۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ملک کے رجعت پسند ادیب ادب برائے زندگی کے مقابلے میں اپنے آخری مورچے سے جنگ کر رہے تھے اس جنگ سے مجھ کو بڑا فائدہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں، میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے اب میں محض اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات سے کام لے رہا تھا اور اس طرح میرے صحیح وجدانِ مقصد کے دور کا آغاز ہوا اور جیسے مجھ کو کچھ تسکین بھی ہونے لگی 'جرس' اسی دور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔'' (جرس از وامق جونپوری ص14)

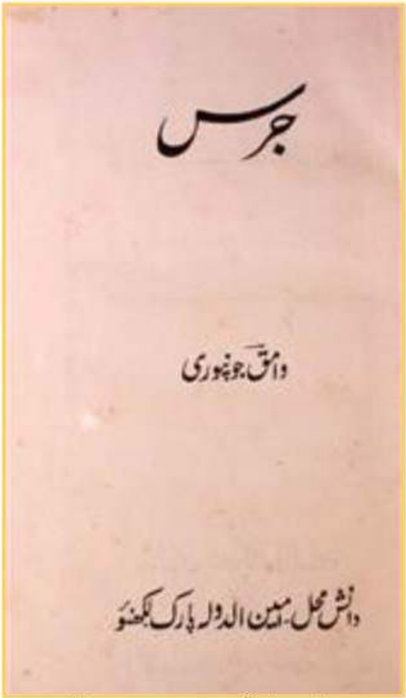

انسانی ذہن کی تعمیر دراصل خارجی اور داخلی اثرات کے زیر اثر ہوتی ہے۔ داخلی اس کی سرشت فطرت وذہانت ہے جو اسے پیدائشی طور پر قدرت عطا کرتی ہے۔ جبکہ خارجی اثرات انسان کی تربیت کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان اپنے خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر بچ کر نکل جائے۔ اپنے احساسات کی ترجمانی کے لیے وامق کو ایک وسیع میدان کی ضرورت تھی جس کے لیے انھوں نے اپنے جذبات، احساسات کو نظم کے قالب میں ڈھالا۔ یہی وجہ رہی کہ دنیائے ادب میں وامق کو نظم نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انھوں نے غزل کی زمین کو ترک کر دیا تھا۔ اوائل دو سال کے علاوہ بھی انھوں نے اچھی خاصی غزلیں کہیں جو اپنے فنی حسن کے ساتھ ساتھ جمہوری مزاج سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ وامق نے غزل کے محدود دائرے میں بھی عصر حاضر کے تمام مسائل اور اس میں موجود بے اعتدالیوں، پیچیدگیوں ونفسیاتی کشمکش کو نہایت خوبی سے موضوع بنایا۔ ملاحظہ کیجیے:

طلسم خواب غفلت توڑ کر بیدار ہوتے ہیں
سنبھل جا تشنۂ دولت کہ ہم بیدار ہوتے ہیں
زمیں لرزاں، زماں لرزاں، نگاہ اہرمن لرزاں
کہ اب تیوری ہمارے انقلاب آثار ہوتے ہیں

دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی اور پوری دنیا اس کے مہلک اثرات سے جوجھ رہی تھی۔ اسی دور میں ہندوستان میں بھی تحریکِ آزادی اپنے پورے شباب پر تھی اور بلاتفریق مذہب وملّت ہر ہندوستانی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس جنگ میں حصہ لے رہا تھا۔ دوسری طرف جنگ آزادی کے متوالوں کو کچلنے کے لیے انگریز سامراج نے اپنی پوری طاقت جھونک دی تھی۔ ایسے حالات میں وامق اس طرح نعرہ بلند کرتے ہیں:

ادھر دی جا رہی ہیں رفعتیں دیوار زنداں کو
ادھر آزادیوں کی فکر کامل ہوتی جاتی ہے
ہواؤں کو ادھر ضد ہے کہ اک تنکا نہ رہ جائے
ادھر فکر نشیمن اور محکم ہوتی جاتی ہے

ہمارے میکدے کا اب نظام بدلے گا
ہم اپنا ساقی بدل دیں گے جام بدلے گا
ابھی تو چند ہی میکش ہیں باقی سب تشنہ
وہ وقت آ گیا جب تشنہ کام بدلے گا
بدلتی رہتی ہیں قدریں رحیل وقت کے ساتھ
زمانہ بدلے گا ہر شے کا نام بدلے گا
یہ عرش و فرش کی تفریق کچھ نہیں وامق
بلند پست کا معیار خام بدلے گا

انتہائی جد وجہد اور کئی جانوں کی قربانی دے کر ہندوستان نے آزادی تو حاصل کر لی لیکن مذہبی، نسلی اور لسانی عصبیت کی وجہ سے یہاں دو قومی نظریہ پروان چڑھنے لگا۔ جس کے باعث ملک پہلے دو اور بعد میں تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس تقسیم میں لاکھوں انسان بے وطن ہوئے اور گھر کے گھر برباد ہوئے۔ خاندان ٹوٹ گئے، احباب بچھڑ گئے۔ گلی، کوچے، سڑکیں اور بازار لہولہان ہو گئے گویا انسانیت زندہ درگور ہو گئی۔ اس کرب کا کھل کر اظہار وامق نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔ لیکن غزلیں بھی اس کرب سے خالی نہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

جبیں پہ خون، جگر خوں، ہاتھ پاؤں پر خوں
تمام خوں سے عبارت یہ خواب یاد رہے
ہر اک لہو میں نہیں انقلاب کی تاثیر
ہر اک چمن نہیں شہر گلاب یاد رہے

آزادیِ ملک اور تقسیم ہند نے ہر کسی کو نیا اندازِ فکر اور سوچنے کا نیا نظریہ دیا۔ ملک میں نئے تعلیمی، اقتصادی، سماجی اور فنی تبدیلیوں کا احساس پیدا ہوا۔ ادیبوں، دانشوروں

اور شاعروں نے بھی نئی جہت کی تلاش شروع کی۔ اس مرتبہ نعرۂ انقلاب کی جگہ دلِ درد آشنا نے لے لی مگر اعتدال کے ساتھ ادب اور سماج کے رشتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا اثر وامق پر بھی پڑا اور انھوں نے فیض، علی سردار جعفری، ساحر، کیفی، سلام، اختر اور مخدوم محی الدین کی طرح نئے اسالیب سے اپنی شاعری کو مزین کیا اور اردو غزل گوئی کو ایک نیا روپ دیا۔ درج ذیل اشعار پر غور کیجیے۔

وقت آگیا انڈیلیے ساغر میں آفتاب
پھر اپنے جوڑے کھول رہی ہے غموں کی رات

وعدہ خلافی کر کے صفائی نہ دیجیے
اس شرط پر ہمیں شب ہجراں قبول ہے

عنایات مخصوص رہنے دے ساقی
ہمیں اک نہیں ہیں، یہاں اور بھی ہیں

دنیا میں انسانی زندگی کا جب سے وجود ہوا کشمکشِ حیات اور مسائل حیات سے وہ ہمیشہ ہی دوچار رہی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جاگیردارانہ، زمیندارانہ و آمرانہ نظام کا بول بالا تھا جس میں کئی خرابیاں آچکی تھیں۔ اس کے خلاف سماج میں بغاوت کی ہمت نہیں تھی۔ روحانیت مادہ پرستی پر غالب تھی۔ وہیں سماج میں کچھ اچھائیاں بھی موجود تھیں، اخلاقی قدریں زندہ تھیں۔ سماج کا کوئی فرد خود کو تنہا نہیں محسوس کرتا تھا۔ مگر نصف صدی میں یہ ڈھانچہ چرمرا گیا۔ سائنس، تکنالوجی نے بے پناہ ترقی کر لی، رسل و رسائل ذرائع ابلاغ، تعلیم وصحت کی بے پناہ ترقی کے باوجود بھی سماج منتشر ہو گیا اور اخلاقی قدریں پائمال ہو گئیں۔ مادیت کا بول بالا ہو گیا اور بھرے بازار میں ہر شخص اکیلا ہو کر ذہنی انتشار وخوف کا شکار ہو گیا۔ ان تمام حالات کی عکاسی وامق کے کلام میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

موم ہو جاتا تھا جن کے ہاتھ میں آکر پتھر
اپنے ہاتھوں سے ہی خود بن گیا آزر پتھر
نرم لہجے میں کڑی بات بھی لگتی ہے بھلی
نہ ہو خوشیوں کا سہارا تو گل تر پتھر

یہ عجب طرح کا دور ہے مگر اپنی رو بھی کچھ اور ہے
میری عمر قابلِ غور ہے میں چلا ہوں جیسے جواں چلے
جو کھلے نشاں تو قدم اٹھے جو لکھے زباں تو قلم چلے
جو چلے قلم تو رکے ستم کہ نظام امن و اماں چلے

سماج اور ادب کے بدلتے ہوئے انداز کا بلاشبہ وامق جونپوری نے خیر مقدم کیا اور اسے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے کلام میں برتا۔ انھوں نے فن اور زندگی کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا اس لیے ان کے کلام میں زندگی اور ادب میں در آئی تبدیلیوں کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وامق کشمکش حیات سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ایک پر امن، پرعزم اور خوش آئند زندگی کا خواب ہمیشہ ان کی آنکھوں میں رہا۔ زندگی کی ناہمواریوں سے وہ مایوس کبھی نہیں ہوئے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ آج نہیں تو کل زمانہ ضرور بدلے گا۔

غرض یہ کہ وامق زمانے کی صورت نہیں آج، تو کل بدل کر رہے گی
جو ہونا ہے وہ آج ہی ہو بھی جاتا، یہ دل چاہتا ہے مگر ہو تو کیسے

وامق تقلید کے قائل بالکل نہیں تھے اور نا ہی تقلید جامد کے۔ دوسروں کے افکار و خیالات سے جلد مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی راہ خود متعین کی اور اسی پر چلتے رہے۔ ان کے مزاج میں والہانہ پن، بے خوفی و بیباکی بہت نمایاں ہے۔ صاف گوئی ان کی سرشت میں سموئی تھی۔ وامق خود احتسابی کے قائل تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔

مجھے اس جنوں کی ہے جستجو جو چمن کو بخش دے رنگ و بو
جو نوید وصل بہار ہو مجھے اس نظر کی تلاش ہے
مجھے عشق حسن حیات سے مجھے ربط فکر و نشاط سے
مرا شعر نغمۂ زندگی مجھے نوحہ گر کی تلاش ہے

انھوں نے عوامی مسائل، جبر و استداد، جاگیردارانہ نظام، سرمایہ داری، فرقہ پرستی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف بنا کسی مصلحت سامراج سے ٹکر لی۔ باوجود اس کے کہ وہ خود جاگیرادارنہ نظام کے پروردہ تھے مگر جس طرح انھوں نے خود اس نظام سے بغاوت کر کے اپنی عیش و عشرت سے بھرپور زندگی سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنے عمل، اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعے نفرت کا اظہار بھی کیا۔ بلا شبہ وامق کے قول و عمل میں یکسانیت کی دلیل تھی۔ انھوں نے اپنے نظریہ فن کی عکاسی اس طرح کی ہے:

''ادب کو انسان دوستی کا روشن مینارہ ہونا چاہیے، قومی یکجہتی، ملکی سالمیت اور آزادی ضمیر کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور حسن محبت کا لالہ زار جو ادیب باطل اور قاتل سے نفرت نہیں کر سکتا (خواہ اس کا مرکز اندرونی ہو یا بیرونی) وہ حسن و عشق سے نہ محبت کر سکتا ہے نہ آزادی ملک و قوم اس کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو اس کی تخلیقات قابلِ اعتبار نہیں۔'' (مقدمہ شب درد، ص 14)

وامق کی غزلوں میں الفاظ کا انتخاب اور اس کا برمحل استعمال ان کے کلام میں اس طرح جان ڈال دیتا ہے کہ اس کے بہت سے معنی اور مہمل الفاظ بھی خوبصورت اور بامعنی ہو جاتے ہیں۔ ایسے تجربات انھوں نے اپنے کلام میں بغیر کسی کی پرواہ کیے کیا۔ انھیں اپنی متعین راہ پر چلنے پر فخر تھا جس کو انھوں نے بتایا بھی اور برتا بھی۔ شاعری کے نشیب و فراز سے وامق بخوبی واقف تھے۔ اپنے کلام میں انھوں نے جذبات کی ترجمانی اس انداز سے کی کہ سننے والا متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ انھوں نے چھوٹی بحر میں بھی غزلیں کہی۔ انھوں نے زبان و قلم کو کبھی بسیار گوئی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کم بولنا اور حق گوئی ان کا مسلک تھا اس لیے انھوں نے کبھی مصالحت سے کام نہ لیا۔ ان کے مزاج میں عزت اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خوشامد پسندی اور چاپلوسی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیا ضروری ہے کہ دیوان پر دیوان لکھوں
ایک شعر ایسا کہو زندۂ جاوید رہو

آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجیے

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وامق کی ابتدائی غزلوں میں انھوں نے بھلے ہی کوئی نیا تجربہ نہ کیا ہو لیکن آزادیِ ملک کے بعد تحریر کردہ غزلوں میں انھوں نے بہت جلد اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کر لی اور یہی لہجہ ان کی انفرادیت کا ضامن بنا۔ انھوں نے بھلے ہی پیرایۂ بیان اور طرزِ ادا میں کوئی نیا تجربہ نہ کیا ہو مگر ان کے یہاں غزل، کلاسیکی انداز میں زندگی کی حرارت اور عصری مسائل وحقائق کی تصویر بن کر ابھرتی ہے۔

وامق کی ابتدائی غزلوں میں انھوں نے بھلے ہی کوئی نیا تجربہ نہ کیا ہو لیکن آزادیِ ملک کے بعد تحریر کردہ غزلوں میں انھوں نے بہت جلد اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کر لی اور یہی لہجہ ان کی انفرادیت کا ضامن بنا۔ انھوں نے بھلے ہی پیرایۂ بیان اور طرزِ ادا میں کوئی نیا تجربہ نہ کیا ہو مگر ان کے یہاں غزل، کلاسیکی انداز میں زندگی کی حرارت اور عصری مسائل و حقائق کی تصویر بن کر ابھرتی ہے۔

■

Dr. Aswad Gowher
Assistant Professor
MGM University,
Aurangabad- 431001 (MS)
Email.: aswadgowher@gmail.com
Mob:9156469099

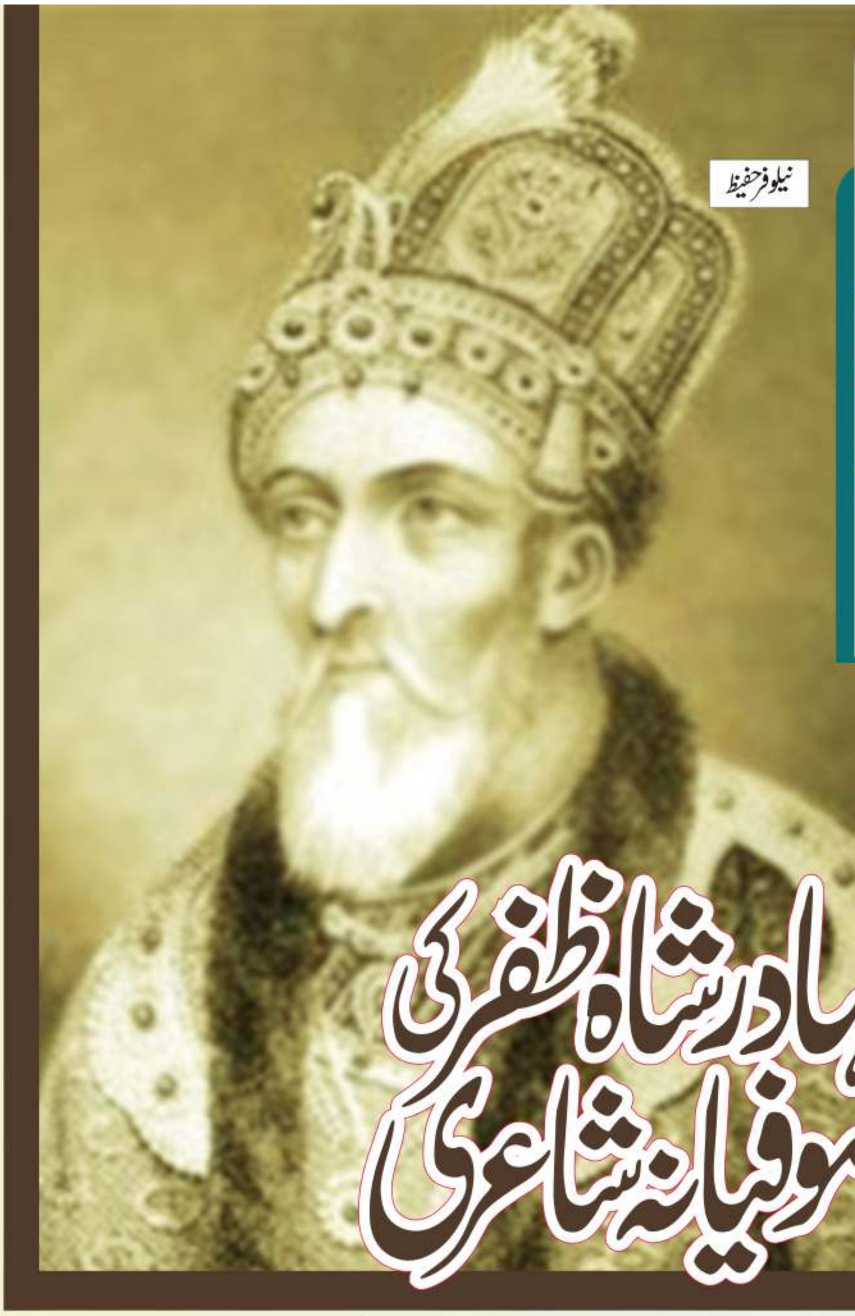

بہادر شاہ ظفر کی صوفیانہ شاعری

نیلوفر حفیظ

بہادر شاہ ظفر کی صوفیانہ شاعری کے سلسلے میں کوئی رائے قائم کرنے سے قبل اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر کوئی بلند مرتبہ صوفی، معرفت کے امین یا شریعت کے شارح نہیں تھے لیکن مسلسل ملنے والے مصائب ومسائل نے ان کی ذات کو تسلیم و رضا کا خوگر اور صبر و استقامت کا پیکر ضرور بنا دیا تھا جو ایک صوفی کی لازمی صفات تصور کی جاتی ہیں، ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کے اس شاہ کم نصیب نے اپنی ہمہ عمر راضی بہ رضا میں صرف کر دی ناسازگاری حالات، نامساعدی روزگار اور سانحات ناگوار نے ان کی ذات ناتواں پر ظلم وستم اور رنج والم کے جو کوہ گراں مسلط کیے ان سے صرف اہل وطن ہی نہیں بلکہ پوری دنیا واقف ہے یہ ستم ظریفی قسمت نہیں تو اور کیا ہے کہ کشور ہندوستان کے شہنشاہ اعظم ہونے کے باوجود بھی وہ ایک ادنیٰ اور حقیر خادم کی طرح زندگی گزارنے پر بے بس و مجبور کر دیے گئے اس فولادی جگر شخصیت نے کس طرح زندگی کے بار کو ڈھویا ہوگا اس کا تصور ہی انسانی رگوں میں خون کو منجمد کر دینے والا ہے ظفر کے پر انتشار، حوصلہ شکن، مایوس کن اور پر آشوب دور نے ان کو محاورۃً نہیں بلکہ واقعتاً خون کے آنسو رلایا تھا ایسے مشکل واقعات اور دل برداشتہ حالات میں وہ صبر و قناعت کا شیوہ اختیار نہ کرتے اور درویشانہ وفقیرانہ زندگی بسر کرنے کی جانب مائل نہ ہوئے ہوتے تو شاید غموں کے اس بحر لامتناہی میں ان کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا لہٰذا اگر وقت کی ستم ظریفی، حالات کی تلخی اور قسمت کی بازیگری نے انھیں صوفی، درویش اور ہمہ لوازمات زندگی سے بے نیاز کر دیا تو اس میں جائے تعجب نیست بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آخر کس طرح اس مرد باہمت نے زمانے کے مسائل ومصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف خود زندگی گزاری بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک نظیر چھوڑ گئے کہ حالات ومعاملات کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہوں انسان کو ان سے نبرد آزما ضرور ہونا چاہیے تھک ہار کر حالات نامساعد سے ہار مان لینا انسانی عظمت پر داغ لگانے کے مترادف ہے لہٰذا ہمہ وقت انسان کو اپنی قسمت کو بدلتے رہنے کی جہد پیہم اور کوشش مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔

شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی صوفیانہ عقائد و درویشانہ رجحانات سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے وہ ایام طفلی سے ہی عارفانہ اور متصوفانہ اسرار و رموز کو جاننے وسمجھنے کے لیے بڑے مضطرب اور بے چین رہا کرتے تھے جب لڑکپن کی عمر میں تھے تب بھی گھنٹوں گھنٹوں معرفت اور عبادت الٰہی میں مستغرک ومنہمک رہتے تھے اور اسرار الٰہی کو کشف کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، از طرف کاتب ازل ان کے مزاج میں تصوف کی شیرینی اور عذوبت کو بڑی گہرائی وگیرائی کے ساتھ ودیعت کیا گیا تھا زمانۂ شہزادگی میں مولانا فخر الدین چشتی جو سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک مشہور ومعروف بزرگ صوفی تھے بادشاہ، امرا، وزرا اور عوام کو ان کی ذات سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ لگاؤ تھا ان صوفی بزرگ کی ذات بابرکات سے مستفیض ہونے کا شرف انھیں بہت ہی کم عمر ہی میں حاصل ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کم سنی میں ہی صوفیانہ افکار کی جانب نہ صرف مائل ہو گئے بلکہ شریعت ومعرفت کے وہ باریک نکات وجہات جن کی عقدہ کشائی کے لیے لوگوں کو طول وطویل وقت درکار ہوتا ہے، لیکن بہادر شاہ ظفر اپنی ذہانت وزیرکی کے سبب بہت ہی کم عمر ہی سے سمجھنے اور سمجھانے لگے تھے آقائے امیر احمد علوی کاکوروی نے بہادر شاہ کی کم عمری کا ایک واقعہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلک صوفیانہ کے ایک ستارۂ روشن کی حیثیت سے انھوں نے عمر کے ابتدائی حصے میں ہی خصوصی شناسائی اور اہمیت حاصل کر لی تھی اور اس دور کے بڑے بڑے صوفیا اور عرفا نے بھی ان کی صوفیانہ زندگی کی عظمت اور آفاقیت کے متعلق پیشن گوئی ان کے بچپن ہی میں کر دی تھی:

''مرزا ابوظفر حصول فیض و برکت کے لیے ان کی خدمت میں پیش کیے گئے اور حضرت مولانا فخر الدین نے شفقت سے ان کی پیشانی پر آثار ہوشمندی اور ستارۂ بلندی ملاحظہ فرما کر دستار بندی سے مشرف فرمایا''

(بہادر شاہ ظفر، امیر احمد علوی کاکوروی، لکھنؤ، 1955، ص22)

تاریخ وتذکروں کی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے سیاسی معاملات کیسے بھی

ناسازگار رہے ہوں لیکن ان کا اپنے عہد کے صوفیوں، عارفوں، درویشوں اور فقیروں سے بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ استوار رہا تھا خود ان کے کلام سے بھی میرے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے یعنی ان کی کلیات میں بھی بکثرت ایسے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جو اس دور کے صوفی بزرگوں یا مشائخ وغیرہ کی شان میں کہے گئے ہیں اپنے عہد کے صوفیوں میں ظفر کو شیخ مولانا فخر الدین کی ذات گرامی سے بے پناہ لگاؤ تھا جو ابتدائی عمر سے لے کر ان کی وفات تک باقی رہا ان کے یہاں ایک دو نہیں بلکہ دہا اشعار ان صوفی بزرگ کی شان میں ملتے ہیں مثلاً ایک شعر میں مولانا فخر الدین کی ذات بابرکات کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ اس طرح نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

ظفر دشوار ہے ہر چند اہل معرفت ہونا
مگر صدقے میں فخر الدین کے ہاں ہوسکتا ہے سب کچھ

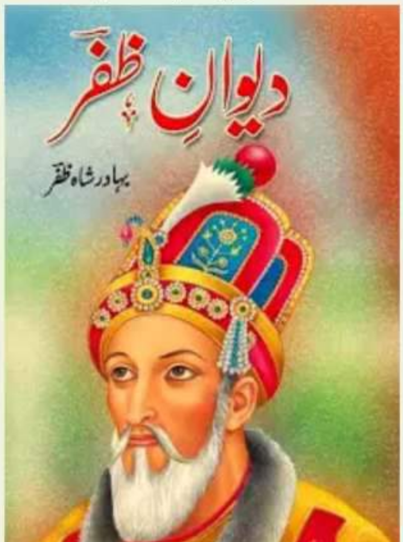

شیخ فخر الدین کی ذات گرامی سے بہادر شاہ ظفر کی عقیدت بڑھتے بڑھتے پرستش کے مرحلے تک پہنچ گئی تھی گو کہ جب ان صوفی بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی عمر محض گیارہ سال یا اس سے کچھ ہی متجاوز تھی لیکن ان کی ذات مبارک کے کچھ ایسے گہرے اور ہمہ گیر اثرات ظفر کے ذہن و دل پر نقش ہوگئے تھے جو تا عمر محو نہ ہوسکے ان کے کلام میں ان گنت اشعار مل جائیں گے جو ثابت کرتے ہیں کہ وہ اس ذات گرامی کو اپنی زندگی کے درد بے پایاں کا درماں سمجھتے ہیں جو کچھ انھیں حاصل ہوا ہے وہ انھیں کے فیوض بابرکات کا ثمرہ تھا اور ان کے بغیر وہ اپنی ذات کو نامکمل تصور کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت میں
اے فخر جہاں سب وہ تیری ہی عنایت ہے

17 محرم 1200 ہجری میں فخر الدین کی وفات ہوگئی ان کی وفات کے بعد غلام الدین جو کہ ان صوفی بزرگ کے جا نشین و پسر عزیز تھے اور مانند پدر، خود بھی علوم معنوی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے ظفر ان سے شرف بیعت کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے مولانا قطب الدین سے بھی ظفر کو خصوصی وابستگی و محبت رہی اور انھیں تا عمر اس بات پر فخر رہا کہ وہ اس خانوادۂ باسعادت سے منسلک رہے ہیں ان کے علاوہ ظفر کے کلام میں مولانا قطب الدین کی شان میں کہے گئے اشعار بھی بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں جو اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ وہ مولانا قطب الدین کی ذات گرامی سے بھی والہانہ لگاؤ رکھتے تھے بلکہ وہ ان کے عاشقین خاص کی فہرست میں سب سے بلند مقام پر فائز تھے قطب الدین کی عظمت و شان میں کہے گئے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے جن سے ان کے بے پناہ عشق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مرید قطب الدین ہوں خاک پائے فخر الدین ہوں میں
اگر چہ شاہ ہوں ان کا غلام کمتر ہوں میں
انہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم میں
وگرنہ یوں تو بالکل روسیہ ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

قطب الدین کی وفات کے بعد بھی بہادر شاہ ظفر اس خاندان سے اسی طرح وابستہ رہے اور ان کے فرزند عزیز نصیر الدین عرف کالے صاحب کے ساتھ بھی اپنے عقیدت مندانہ مراسم اسی طرح برقرار رکھے حالانکہ نصیر الدین عرف کالے صاحب عمر میں ان سے کافی چھوٹے تھے لیکن ان کی عقیدت و محبت ان کے ساتھ بھی اسی طرح قائم رہی جس طرح فخر الدین صاحب اور مولانا قطب الدین سے تھی ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تا عمر اس بات پر نازاں رہے کہ وہ اس خاندان باسعادت سے روابط قریبی رکھتے ہیں نصیر الدین عرف کالے صاحب کی تعریف و توصیف میں بھی اشعار کہے ہیں جن میں دعائیہ انداز اختیار کیا گیا ہے مگر عقیدت وانسیت کا جو دریا دل میں موجزن ہے اس کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

نظام خانہ فخر جہاں تم ہی تو ہو
قیام سلسلہ و خاندان تم ہی تو ہو
نہ کیوں تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تم ہی ان کا نشاں تم ہی تو ہو
ظفر کو چاہیے نصرت تمھیں نصیر الدین
کہ اس کے یار و مددگار ہاں تم ہی تو ہو

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کا جذبہ ایمانی حد درجہ راسخ و پختہ ہو چکا تھا انھیں صرف اس خانوادے سے ہی نہیں بلکہ دیگر صوفیائے کرام، اولیاء اللہ اور بزرگان دین سے بھی خاص لگاؤ تھا ان کا عقیدہ تھا کہ ان بزرگان دین کی ہی محنت کا ثمرہ ہے، جن کی وجہ سے انھیں اپنی ہستی حقیر کو تسلیم و رضا کا خوگر بنانے کی استعداد حاصل ہوسکی ہے انھیں حضرت معین الدین چشتیؒ کی ذات مبارکہ سے بھی والہانہ لگاؤ تھا اور اکثر مواقع پر ان کے تقوے و پرہیزگاری کی تعریف و تمجید بڑے ہی پرشکوہ انداز میں کی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ مسلسل بڑھتے ہوئے مصائب نے انھیں شہنشاہ کے بجائے صوفی بنا دیا تھا اور متصوفانہ جذبات ان کی شخصیت پر اس قدر غالب آگئے کہ تخت سلطنت پر سریرآرا ہونے کے باوجود بھی انھوں نے پیری مریدی کی رسم کو فروغ دیا اور تخت وتاج کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرف راغب ہوگئے بلکہ رعایا کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرنے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا چونکہ بادشاہ سلامت خود پیری مریدی کے عقائد پر بہت زیادہ سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے چنانچہ رعایا کا رجحان اس طرف ہوجانا عین فطری تھا لہٰذا ان سے وابستہ لوگ بھی اس راہ پر گامزن ہونے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار عام و خاص ان کے حلقۂ مریدی میں داخل ہوکر اپنی تکالیف و مصائب کا حل تلاشنے لگے عملی طور پر کچھ کرنے کے بجائے بے عملی فروغ پانے لگی، خود بہادر شاہ ظفر نہایت ذوق وشوق اور زور و شور سے لوگوں کو متصوفانہ رمز سے آگاہ و آشنا کراتے اور اپنے اعتبار سے ان کے مصائب ومسائل کا مداوا کرنے کی کوشش بھی کرتے، لوگ جوق در جوق ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے اور جب ان کا یہ حلقہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وسیع ہونے لگا تو حیلہ پرور اور دور اندیش انگریزی حکومت کو کچھ خوف لاحق ہوا اور انگریزی افسران کی جانب سے ان کے بیان کردہ عقائد کی عام تشہیر پر پابندی عائد کر دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کو سخت تاکید و تنبیہ بھی کی گئی، وہ اس رسم کو کلی طور پر ختم کردیں ورنہ انگریزی حکومت کی جانب سے ان کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے گی اور ایسا اس لیے بھی کیا گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملک کے لوگ متحد ہوکر انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کردیں اس سلسلے میں احمد علوی کاکوروی نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہادر شاہ پر فقر و درویشی کا رنگ ایام ولی عہدی سے چڑھا ہوا تھا لیکن اب حوادث گوناگوں نے یہ نشہ اور تیز کردیا تخت پر بیٹھے تو اسرار و نکات تصوف بیان فرماتے...

رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ دیسی سپاہی بادشاہ کے مرید ہونے لگے ایک جمعدار حمید خاں نام کا بھی اس نعمت سے مشرف ہوا تھا ریزیڈنٹ کو اندیشہ ہوا کہ فوج کے سپاہی اگر بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوئے تو بوقت ضرورت حق نمک فراموش کریں گے لہٰذا اہلکاران فوج کو بہادر شاہ سے بیعت کرنے کی حکماً ممانعت کی گئی لیکن دہلی کے دوسرے باشندے اس خوان کرم سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔''

(بہادر شاہ ظفر، امیر احمد علوی کاکوروی، لکھنؤ 1955، ص 19-118)

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ظفر کے صوفیانہ خیال و افکار میں مزید کشادگی و وسعت پیدا ہوتی چلی گئی بلکہ انگریزی حکومت کی پابندی عائد ہو جانے کے بعد تو اس میں اور زیادہ شدت اور حدت پیدا ہو گئی تھی اور یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ ملک کی اندرونی و بیرونی افراتفری، اغیار و اعزا کی حیلہ پروری اور حالات و قسمت کی ناداری نے ان کو جذبۂ ایمان و عمل سے ہمکنار کر دیا، بہادر شاہ ظفر کے کلیات میں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جو ان کے کامل صوفی ہونے کی بڑی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں ان اشعار کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی بادشاہ کے نہیں بلکہ عارف یا صوفی کے نظم کردہ احساسات کی دلکش ترجمانی ہے جو پڑھنے والے کے اذہان وقلوب کو سیدھے طور پر متاثر کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کے عرفانی نظریات وعقائد اور شریعت کے اصول وضوابط روایتی صوفی شعرا کی طرح دقیق، پیچیدہ، مبہم اور غیر واضح نہیں ہیں اور نہ ہی غیر ضروری فلسفیانہ بوجھل پن ان میں پایا جاتا ہے، اکثر مشاہدے میں آتا ہے کہ بعض بلکہ زیادہ تر صوفی شاعروں نے تصوف کے اس پیارے اور دل کش موضوع کو اس قدر مشکل و پیچیدہ بنا کر عام لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے کہ جس پر عمل کرنا دشوار ترین عمل نظر آتا ہے اور وہ عموماً اس سے راہ گریز اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں لیکن ظفر کے یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس پایا جاتا ہے حالانکہ وہ کوئی فلسفی یا مصلح نہیں مگر انداز بیان سادہ دلکش رواں اور سہل ہے اس شاعر بزرگ کا دل حساس جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اس کا قلم اس کی تابع داری کرتا ہے اور یہی ان کے شاعرانہ کمال کی انفرادی شان ہے جو بے اختیار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے ان کے سامنے تصوف کے اسرار و رموز رازہائے سربستہ نہیں رہ جاتے جن تک عام فہم انسان کی رسائی ممکن نہ ہو بلکہ اس کے بالکل برعکس ایک سیدھا آسان اور خوبصورت راستہ بن جاتا ہے جس کو اختیار کر کے منزل مقصود کو بدون کسی پریشانی کے حاصل کیا جا سکتا ہے یہ ان کا سلیس اور رواں انداز بیان ہی ہے جو ان کو ایک اعلیٰ مرتبہ صوفی شاعر کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے لیکن وہ ایک آزاد طبیعت اور بے نیاز صوفی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں بزم تیموریہ کے مصنف سید صباح الدین نے اس سلسلے میں بڑی متوازن اور معتدل رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ تصوف کا کوئی فلسفی نہیں اس لیے خیالات اور مسائل کے اظہار میں نہ وہ نکتہ آرائی اور جدت طرازی کرتا ہے اور نہ غالب کی طرح تصوف کے عقدہ ہائے سربستہ کی تحلیل اور تشریح میں دقیق اور عسیر الفہم الفاظ استعمال کر کے خیالات کو ادق بناتا ہے، بلکہ اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتا ہے جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لیے غور وفکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بے اختیارانہ طور پر اس کے اثرات خود بہ خود دل پر قائم ہوتے جاتے ہیں۔''

> **بهادر شاه ظفر کے کلیات میں بکثرت ایسے اشعار موجود هیں جو ان کے کامل صوفی هونے کی بڑی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتے هیں ان اشعار کو پڑھ کر محسوس هوتا هے که یه کسی بادشاه کے نهیں بلکه عارف یا صوفی کے نظم کرده احساسات کی دلکش ترجمانی هے جو پڑهنے والے کے اذهان وقلوب کو سیدهے طور پر متاثر کرتے هیں۔**

(بزم تیموریہ جلد سوم، سید صباح الدین، اعظم گڑھ، 2009، ص 131)

بہادر شاہ ظفر بظاہر تو ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کے شہنشاہ اعظم تھے مگر ان کی زندگی خارجی اور داخلی دونوں ہی اعتبار سے ناکامیوں حسرتوں نامرادیوں اور کلفتوں کا مرقع تھی جہاں سوائے مایوسی کے کچھ اور نہیں تھا ان کی قسمت نے ان سے تیموری شہنشاہوں کا وہ تمام کر و فر، سطوت و حشمت اور جاہ وجلال کو چھین لیا تھا جو دور ماضی میں اس خاندان کی خصوصی پہچان تصور کیا جاتا تھا حالانکہ ان کے سر پر تاج شہنشاہی تو رکھا گیا تھا مگر افسوس کہ وہ تاج طاقت وقوت کا غماز نہیں بلکہ کانٹوں سے بھرا ہوا ایک اذیت ناک اور تکلیف دہ تاج تھا جس نے نہ صرف یہ کہ ان سے ان کی ساری مسرتوں و راحتوں کو چھین لیا تھا بلکہ ان کی روح تک کو بھی گھائل کر دیا تھا وہ مادی و روحانی دونوں ہی اعتبار سے خود کو تہی دست و لاچار محسوس کرتے تھے، نہ تو ملک وحکومت کے موجودہ حالات کو بدل سکتے تھے اور نہ ہی اس بے بسی اور لاچاری سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ ان کے پاس تھا وہ ملک کے بادشاہ ہونے کے باوجود بھی انگریزی حکومت کے ایک ادنیٰ اور معمولی سے ملازم بن کر رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے ایک ایسا ملازم جس کی نہ تو اپنی کوئی مرضی تھی اور نہ ہی خواہش، لیکن اپنی تمام تر بے کسی اور لاچاری کے باوجود وہ شاہانہ سطوت وشوکت کو اپنی ذات میں قائم و دائم رکھنے کے متمنی ضرور تھے لیکن افسوس کہ یہ شہنشاہ کم نصیب اپنے اجداد کی طرح تخت حکومت کو رونق بخشنے میں تو کامران و کامیاب نہیں ہو سکا لیکن فقر و غنا کی سلطنت میں وہ عظمت و بلندی حاصل کی جس کو حاصل کر پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں انھوں نے اپنے دل کے غم کو سبکسار کرنے کے لیے شعر کے دامن میں پناہ ڈھونڈی اور دائمی نہ سہی لیکن وقتی طور پر راحت حاصل کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی اور جب انھوں نے اپنے صوفیانہ جذبات و افکار کو اپنے کلام میں سمویا تو گویا روحانیات کی دنیا میں حیات جاویداں حاصل ہو گئی جب ہمارا یہ شہنشاہ ستم زدہ اپنے ہی عزیز از جان ملک کی باگ ڈور کو اغیار کے ہاتھوں میں جاتا دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے اور اس سے پہلے کہ شدت غم اس کی جان لے لیں اس کے صوفیانہ احساسات اس کو فوراً سنبھال لیتے ہیں اور وہ وقتی تاج وتخت کی تمنا کے بجائے، بے نیازی، درویشی اور فروتنی میں شہنشاہ بزرگ بننے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے:

یا مجھے شاہا نہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنانا تھا مجھے
کاش خاک در جاناناں بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائق صحبت تو مجھے
قابل جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوی ساقی سے مجھے
تو چراغ رہ میخانہ بنایا ہوتا
دل صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلف مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی مستی سے تو نے ویرانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کا ایک بڑا گروہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اگر اپنے دل کو کدورت، بغض اور عناد سے پاک کر لے تو خدا کا جلوہ اس میں نظر آتا ہے ظفر کا بھی یہی ماننا ہے کہ جس نے اپنے دل کے آئینے کو صیقل کر لیا گویا اس نے انسانیت کی معراج کو حاصل کر لیا ایک پاکیزہ دل

پر ہی اسرار الٰہی منکشف ہو سکتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس کائنات کے پوشیدہ اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے انسان اپنے دل کو دنیاوی آلائشوں و آلودگیوں سے الگ کر لے تاکہ معرفت حق اس کو حاصل ہو سکے۔

دل کا آئینہ جب صفا دیکھا
وہ جو پنہاں تھا برملا دیکھا

صفائی قلب کوئی معمولی کام نہیں ہے اس کے لیے شروعات سے ہی بہت ایثار اور قربانی دینا پڑتی ہے اور اس گرد آلودہ آئینہ کو انکساری، عاجزی اور خاکساری کی مدد سے ہی صاف وشفاف بنایا جا سکتا ہے یہ سبب ہے کہ ظفر اس بات پر سب سے زیادہ توجہ دیتے نظر آتے ہیں کہ انسان سب سے پہلے اپنے دل کے دریچوں کو وا کرے اور اس میں موجود گرد و گندگی کو صاف کرے تاکہ اس کی نظر کچھ دیکھنے کی اہل ہو سکے۔

جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر
کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل

اور جب تزکیۂ نفس کی دولت حاصل ہو جاتی ہے اور دل دنیاوی تمام کثافتوں و آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے تو پھر ایک عام بندہ بھی خدا کا قرب حاصل کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے اور جزو سے کل بن جاتا ہے ان کے نزدیک قطرہ سمندر میں مل کر فنا نہیں ہوتا ہے بلکہ خود سمندر بن جاتا ہے ٹھیک اسی طرح انسان جب معرفت الٰہی حاصل کر لیتا ہے تو گویا خدائی میں شریک ہو جاتا ہے اور صفات الٰہی اس میں پیدا ہو جاتی ہیں متعدد صوفی شعرا نے اس مضمون کو بیان کیا ہے لیکن جب ظفر کے نوک قلم سے یہ مضمون ادا ہوتا ہے تو حیرت انگیز طور پر سادہ اور عام فہم ہو جاتا ہے لیکن اس سادگی کے باوجود بھی اس میں بلا کی رعنائی اور اثر آفرینی نظر آتی ہے۔

مل گیا دریا میں جب قطرہ تو دریا ہو گیا
جزو جو کل میں ہوا گم جزو سے کل وہ بنا

یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے انسان اس بے وفا اور بے رحم زندگی کے پیچھے ایسے ہی دوڑتا ہے جیسے کوئی بھوکی بھکارن کسی موٹر کار کے پیچھے حسرت و یاس کی تصویر بنی صرف اس لیے دوڑتی چلی جاتی ہے کہ شاید اس کو کچھ حاصل ہو جائے لیکن آخر میں سوائے ناکامی و نامرادی کے اس کے دامن میں کچھ اور نہیں آتا اسی طرح انسان بھی چاہے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لے لیکن یہ زندگی ایک ایسی بے وفا معشوق کی طرح ہے جو کسی بھی حال میں کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی ہے لہٰذا جب انجام فنا ہی ہے تو پھر زندگی کے لیے اتنی زیادہ محنت کرنے کا کیا فائدہ اس لیے بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد حقیقی کو سمجھے اور زندگی کے فنا ہونے سے پہلے خود کو فنا کر لے تاکہ اس کو بقا حاصل ہو سکے ظفر جب اس خیال کو پیش کرتے ہیں تو بے اختیار اس پر عمل پیرا ہونے کا دل چاہتا ہے۔

فنا ہے ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل
فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل

دیگر صوفی شعرا کی مانند ناپائداری دنیا سے متعلق بھی کلیات ظفر میں بے شمار اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جو اپنی انفرادیت، سادگی، سلاست اور روانی کے سبب عام قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں ظفر اس دنیا کو سراب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں یہ دنیا چند روزہ ہے جس کو ایک نہ ایک دن ہر انسان کو چھوڑ کر چلے ہی جانا ہے لہٰذا فانی اور ناپائیدار چیزوں سے محبت رکھنا بیکار ہے ظفر نے اپنے اطراف و جوانب میں جو ماحول اور حالات دیکھے تھے انہوں نے ان کے دل میں اس یقین کو پختہ کر دیا تھا کہ اس دنیا میں کبھی کسی کو راحت وسکون کے ساتھ جینا نصیب نہیں ہو سکا لہٰذا اس کو جائے خیر و عافیت سمجھنا ایک خیال طفلانہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اس لیے یہاں کی حکومت وسلطنت، طاقت و قوت اور دولت و نعمت پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے ہندوستان ملک کا وہ شخص جو شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی دربدری کی زندگی گزار رہا تھا جو ہزاروں کی تقدیر سنوار سکتا تھا اب خود اغیار کے سامنے بے بس، مجبور اور دست بستہ کھڑا تھا لاچاری و معذوری اس قدر کہ حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتا تھا جب قسمت ایک شہنشاہ کو بھکاری بنا سکتی ہے تو پھر اور کیا نہیں ہو سکتا یہی سبب ہے کہ یہ شاہ کم نصیب اس دنیا میں فقر و قناعت کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے یہ ایک ایسی دولت ہے جس میں کسی چیز کے چھن جانے کا کوئی خوف وڈر نہیں ہے یہ دنیا انسان کو ہمیشہ اپنے دلفریب حسن سے یا حیلہ ومکر وفریب سے خود میں ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے ہمہ وقت فتنہ وفساد کا بازار گرم رہتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو ضائع کر دیا لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا کہ وہ تلافی کر سکے لہٰذا انسان کو اس کی حقیقت سمجھنا چاہیے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرنا چاہیے لہٰذا وہ واعظانہ انداز میں کہتے ہیں۔

بچشم غور جو دیکھا ظفر زمانے میں
تو یا زمین کا یا زن کا یا ہے زر کا فساد
یاں ترقی و تنزل ہے مثال گرد و باد
گہ بلندی میں ہیں ہم اور گاہ پستی میں خراب
انسان کی زندگی ہے تو اک دو نفس تلک
سامان کرے ہے جینے کا لاکھوں برس تلک
کرتے ہو کیا کیا یہاں کے تم مکان آراستہ
غافلوں واں کی بھی تو کچھ خانہ آرائی کرو

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ظفر کی صوفیانہ شاعری کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوع تصوف 'برائے شعر گفتن خوب' نہیں ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ابتدا میں ان کے متصوفانہ رجحانات میں گہرائی و گیرائی تھوڑی کم نظر آتی ہے مگر گزرتے وقت کے ساتھ ان کی آتش دروں اپنی پوری آب وتاب سے روشن ہوتی چلی جاتی ہے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے چنانچہ عمر کے آخری حصے میں ان کی شاعری میں جو متصوفانہ موضوعات قلم بند کیے گئے ہیں ان میں فکر کی گہرائی و گیرائی زیادہ نظر آتی ہے ان کے تصوفانہ رجحانات کی پختگی و صفائی کی بڑی وجہ ان کے مصائب و مسائل کا سلسلۂ لامتناہی بھی تھا جس نے انھیں دنیا سے یکسر بے نیاز کر دیا تھا انھوں اس دنیا کے جنگل میں ظہور پذیر ہونے والے حوادث چھوٹی چھوٹی قمریوں کی طرح محسوس ہونے لگے تھے اور یہ تصوف کے جذبے ہی کی کارفرمائی تھی جس نے ان کو بادشاہ ہونے کے بجائے ایک آزاد اور بے نیاز صوفی بنا دیا تھا سید صباح الدین اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''حوادث زمانہ اور واردات زندگی نے ظفر کے دل میں اپنے مالک حقیقی کی ایسی لگن پیدا کر دی تھی کہ آخر میں وہ بادشاہ وقت ہونے کے بجائے ایک صوفی منش فقیر ہو گیا تھا، اس کی زندگی صبر، توکل اور استغنا کی داستان ہے، طبیعت میں فقر و درویشی کا خمیر موجود تھا ہجوم مصائب نے اس کو اور زیادہ تیز کر دیا''

(بزم تیموریہ جلد سوم، سید صباح الدین، اعظم گڑھ، 2009، ص 128)

یوں تو ظفر نے متعدد موضوعات کو اپنی شاعرانہ زبان میں ادا کیا ہے لیکن اگر ہم صرف ان کی صوفیانہ شاعری کی جانب نگاہ کریں تو پائیں گے کہ وہ ایک صوفی کامل فرشتہ صفت انسان ہیں جو دنیاوی مکر وفریب، آلائش وزشتی اور حرص و ہوس سے مکمل طور پر پاک وصاف ہے اس شاعر اعظم کے جذبات کی صداقت، تجربات کی گرمی، تکالیف کی شدت اور حوادث کی ستم ظریفی نے ان کی صوفیانہ شاعری کو جو رنگینی اور رعنائی عطا کی ہے وہ شاذ و نادر ہی ان کے معاصرین شاعروں کے یہاں کہیں اور دیکھنے کو ملتی ہے۔

■

Dr. Neelofar Hafeez
Asst Prof, Depf of Arabic & Persian
Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)
Email.: neelofarhafeez82@gmail.com

اردو شاعری میں تصوف کی رنگارنگی

نظیر احمد گنائی

یہ مضمون تین ذیلی عنوانات میں منقسم ہوا ہے:
(الف) صوفی اور تصوف کی تعریف (ب) تصوف کے درجے (ج) اردو شاعری میں تصوف کی رنگارنگی

(الف) صوفی اور تصوف کی تعریف:

لفظ 'صوفی' کا اشتقاق و مصدر کیا ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں:

1 صوفی کی نسبت مسجد نبویؐ میں اہل صفہ کی طرف ہے۔ ماہرین لغت کا اس پر اعتراض ہے کہ اگر صوفی کی نسبت اہل صفہ کی طرف ہوتی تو صوفی کی بجائے صفی ہونا چاہیے تھا۔

2 صوفی کی نسبت اللہ تعالیٰ کے سامنے پہلی صف کی طرف ہے۔ اس پر بھی یہی اعتراض کیا گیا کہ لغت کے اعتبار سے صفی ہونا چاہیے تھا نہ کہ صوفی۔

3 ایک قول یہ ہے کہ صوفی 'صفوۃ من الخلق' کی طرف منسوب ہے جو لغوی اعتبار سے غلط ہے کیوں کہ 'صفوۃ' کی طرف نسبت 'صفوی' آتی ہے۔

4 صوفی 'صوفہ بن بشر بن طابخہ' قبیلہ عرب کی طرف منسوب ہے۔

(تذکرۃ الاولیا صابری قلندری کلیامی رنگ)

صوفیا کی نگاہ میں صوفی کی تعریف:

1 حضرت شیخ ابوعلی رودباری "الصوفی ھو ان یکون العبد فی کل وقت بما ھو اولیٰ بہ فی الوقت"
صوفی وہ ہے جو ہر وقت اسی کا ہو کر رہتا ہے جس کا وہ بندہ ہے۔

2 حضرت عمر بن عثمان مکی " الصوفی ساکن الجوارح مطمئن، الجنان مشروح الصدر منور الوجہ عامر الباطن غنیا عن الاشیاء لخالقھا"
صوفی پر سکون جسم دل مطمئن، منور چہرہ، سینہ کشادہ، باطن آباد اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے دنیا کی تمام اشیا سے بے پرواہ ہوتا ہے۔

3 حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی " منقطع عن الخلق و متصل بالحق "
صوفی مخلوق سے آزاد اور خدا سے مربوط ہوتا ہے۔

4 حضرت شیخ ابوبکر شبلی " ھم قوم آثروا اللہ عزوجل علیٰ کل شئی "
صوفیا کرام وہ ہیں جو ہر چیز سے زیادہ اللہ کی رضا کو ترجیح دیتے ہیں۔" (تذکرۃ الاولیاء صابری قلندری کلیامی رنگ)

5 حضرت محمد طیب ابدالیؒ
"اصل صوفیت عین اسلام ہے۔ صوفی وہ ہے جو مومن و مسلم اور خارجی مکارم کے ساتھ باطنی حسن و اخلاق پر بھی نظر رکھے اور وہ زندگی کی اصل فرض داخلی اور روحانی اصلاح کو قرار دے۔ خشیت الٰہی سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہو، اس کی زندگی صاف سادہ اور بے داغ ہو، اس میں دکھاوا بالکل نہ ہو، وہ سختیاں سہنے کا عادی ہو اور دنیا کے عیش و نعم کو مقصد حیات نہ سمجھے، دنیا مطمح نظر نہ ہو، ایک طرف اس میں اگر خدا کا عشق ہو تو دوسری طرف خدا کے بندے کی محبت بھی پائی جائے..."

(اردو میں صوفیانہ شاعری، محمد طیب ابدالی، 1984، الہ آباد، ص 24)

(ب) تصوف کے درجے

صوفیا کے نزدیک اسلامی علوم کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی، ظاہری علم سے مراد شریعت ہے، جو عوام کے لیے ہے۔ باطنی علم وہ ہے جو احمد مختار نبی تاجدار رسول اللہؐ نے اپنے چند صحابہ کو عطا کیا ہے۔ جن میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ، حضرت امیر المومنین علیؓ اور حضرت ابوذرؓ کا نام درج ہے۔ صوفیا کے نزدیک تصوف کے چار درجے ہیں۔ جب تک چاروں درجات اصول و ضوابط کے ساتھ پائے تکمیل کو نہ پہنچ جائیں گے تب تک آدمی صوفی نہیں ہو سکتا ہے۔ ان چاروں درجات کی ترتیب اس طرح سے ہے کہ: شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت

(ج) اردو شاعری میں تصوف کی رنگارنگی

اردو ادب میں صوفیت کا تصور ابتدا ہی سے ہے کیونکہ اردو ادب کے نشو و نما میں اولیاء اللہ اور صوفیوں کا عمل دخل رہا ہے۔ اردو شاعری میں صوفیانہ عناصر فارسی اور عربی کے توسط سے ہی آئے ہیں۔ عربی میں حسان بن ثابتؓ اور فارسی میں مولانا رومی اور جامی وغیرہ جیسے بڑے شاعروں نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے اور صوفی عناصر کو بلند اور اعلیٰ مقام بخشا۔ اردو میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ اکمل، حضرت ابوالحسن امیر خسروؒ

نے پہلی بار اس فن میں طبع آزمائی کی۔حضرت ابوالحسن امیر خسروؒ سے لے کراب تک جتنے بھی اولیاء اللہ اور صوفی بزرگ آئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین محبوب الٰہی سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ان کا قلبی تعلق تصوف سے گہرا تھا اور اس کی تکمیل دربارِ محبوب الٰہی میں ہی ممکن تھی۔ ان کے کلام کا زیادہ تر موضوع تصوف ہی رہا ہے۔صوفیا حضرات کا کہنا ہے کہ راہِ سلوک میں جن منازل سے سالک کو گزرنا پڑتا ہے وہ عشق، کشف اور جذب ہیں۔ جب وہ کشف کی منزل سے گزرتا ہے تو اس پر اسرار الٰہی کا ظہورِ عمل میں آتا ہے۔

حضرت امیر خسرو کے بعد کئی شعرا کا ذہن اس فن کی طرف مائل ہوا، وہ کچھ اس طرح سے ہیں جیسے:

سلطان محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ملک خوشنود، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، حیدر علی آتش، مرزا اسداللہ خاں غالب، میر انیس، مرزا دبیر، امیر مینائی، داغ دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، اسمٰعیل میرٹھی، احمد رضا خان بریلوی، اکبرالہ آبادی، شاعر مشرق علامہ اقبال، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی وغیرہ نے بھی بعد میں اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا۔غرض ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا جو صوفیت سے یا تو متاثر تھا یا خود بھی صوفی رہا۔صوفی شاعری کی طرف کئی لوگوں کا ذہن توجہ کن رہا ہے۔ عارفانہ کلام یا صوفیانہ کلام شاعری کا وہ کام ہے جو صوفیا اور عارفین نے کیا ہے۔اس شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں عشقِ حقیقی کے اسرار و رموز پنہاں ہیں، جس میں صوفیا نے اپنے تجربات اور عشقِ حقیقی میں درپیش رکاوٹوں اور مراحل و مدارج بیان کیے ہیں۔صوفی شاعری کا یہ کام مختلف زبانوں میں ہوا ہے اور ہر زبان میں پیش کیا جانے والا صوفی کلام عوام میں بہت مقبول ہوا ہے۔مختلف صوفیا کا کلام پنجابی، سندھی، اردو، فارسی، عربی و دیگر زبانوں میں موجود ہے۔ یہ کلام نظم اور نثر دونوں صورتوں میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔صوفیانہ کلام کے حوالے سے معروف چنیدہ شخصیات درج ذیل ہیں:

سلطان باہو، وارث شاہ، میاں محمد بخش، بابا بُلھے شاہ، شمس تبرَیزی، مولانا رُومی، مولانا جامی، شیخ سید شیرازی، امام غزالی، ابنِ عربی، شیخ فریدالدین عطار وغیرہ

اردو شاعری میں یہ روایت یا تو نسل در نسل چلی آئی یا تو سلسلہ نسبی سے آئی۔تصوف اور اس کے معاملات اردو شاعری کے اہم ترین موضوعات میں سے ہیں۔عشق میں فنائیت کا تصور دراصل عشقِ حقیقی کا پیدا کردہ ہے۔ساتھ

اردو ادب میں صوفیت کا تصور ابتدا ھی سے ھے کیونکہ اردو ادب کے نشو و نما میں اولیاء اللہ اور صوفیوں کا عمل دخل رہا ھے۔ اردو شاعری میں صوفیانہ عناصرفارسی اور عربی کے توسط سے ھی آئے ھیں۔عربی میں حسان بن ثابتؓ اور فارسی میں مولانا رومی اور جامی وغیرہ جیسے بڑے شاعروں نے اس فن میں اپنے جوھر دکھائے اور صوفی عناصر کو بلند اور اعلیٰ مقام بخشا۔ اردو میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰھیؒ کے خلیفہ اکمل، حضرت ابو الحسن امیر خسروؒ نے پھلی بار اس فن میں طبع آزمائی کی۔حضرت ابو الحسن امیر خسروؒ سے لے کر اب تک جتنے بھی اولیاء اللہ اور صوفی بزرگ آئے ھیں۔

ہی زندگی کی عدم ثباتی انسانوں کے ساتھ رواداری اور مذہبی شدت پسندی کے مقابلے میں ایک بہت لچک دار رویے نے شاعری کی اس جہت کو بہت ثروت مند بنایا ہے۔ دیکھنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تصوف کے مضامین کو شعرا نے کس فنی ہنرمندی اور تخلیقی احساس کے ساتھ خالص شعر کی شکل میں پیش کیا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے تصوف کے موضوع کو اپنے دیوان میں جگہ دے کر یوں کہا ہے کہ

خبر لیایا ہے ہدہد میرے تئیں اس یار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں عشق حقیقی کا بر محل استعمال کی کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں منزلوں کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔نسبت اسلاف کا بھی پرتو ان کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔حکمرانی کے ساتھ ساتھ رب العالمین کی تمام تر وحدت، آزمائش اور جلال کا ذکر کر کے ہر نعمت کا شکر بھی ادا کیا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد وجہی اور غواصی نے بھی تصوف کے مضامین کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان دونوں کے بعد ولی دکنی نے بھی اپنی کلیات میں جابجا تصوف کے باب کھول دیے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں یہ شعر

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہے بلال

دوسری جگہ

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا

ولی دکنی کے بعد سراج اورنگ آبادی نے اس موضوع کو بامِ عروج بخشا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج کے بعد اس شاعر کا دور آتا ہے کہ جس نے صوفی گھرانے میں ہی آنکھ کھولی ہے۔حضرت خواجہ میر درد نام سے ہی اثر پرور ہے۔انھوں نے اپنی شاعری سے تصوف کو ایسی رونق بخشی کہ دنیائے اردو ادب میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ ان کے یہ اشعار اس حوالے سے کافی اہمیت رکھتے ہیں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر
اے درد آ کے بیعت دست سبو کریں

مقام وحدت کے ان اسرار و رموز کو خواجہ میر درد نے شاعری میں بیان کیا ہے جن کو چھونے سے عام آدمی گھبرا جاتا ہے یا ان موضوعات پر بات کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ پرہیزگاری اور تقویٰ کے منصب کو طے کرنے پر جو کیفیت حال ہوتی ہے وہ بھی اشارتاً بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

خواجہ میر درد کے بعد اردو شاعری میں ایک بڑے شاعر کا جنم ہوا جس کا نام میر تقی میر ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں عشق و محبت، درد و غم، ظلم و بے بسی، ہجر و فراق، یاس و تڑپ، وصال و رخصت کے ساتھ ساتھ ہر اس موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جس کا تعلق برائے راست یا بلاواسط خدا کی وحدانیت سے ہو۔ ملاحظہ فرمائیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی ٔرازِ نہاں ہوں

دوسری جگہ میر تقی میر کچھ یوں کہتے ہیں:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

میرتقی میر کے بعد نظیر اکبرآبادی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ نظیر کے ساتھ ہی خواجہ حیدرعلی آتش ایسے شاعر گزرے ہیں کہ جنھوں نے تصوف کی دنیا میں قدم رکھا اور ایسے اشعار کہے جن سے تصوف کی صورتیں واضح ہوئیں۔ ان کے بعد بہادر شاہ ظفر اور شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی۔ پھر اس کے بعد اردو ادب میں وہ درخشاں ستارہ نمودار ہوا کہ جس نے اردو شاعری کو دل والوں کی شاعری بنادی۔ جن کا اسم گرامی مرزا اسداللہ خان غالب۔ مرزا غالب نے اردو شاعری کو ایسی وسعت عطا کی کہ محبّ ادب اردو شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ فارسی شاعری ہو یا اردو شاعری دونوں میں وہ کمال حاصل کیا کہ تادم ادب نواز انھیں یاد کریں گے اور ہر دور میں ان کے کلام کو تر و تازہ قرار دیں گے۔

مرزا اسداللہ خان غالب یوں قلم بند کرتے ہیں کہ:

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ایک اور جگہ کچھ اس طرح کہتے ہیں کہ۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

تصوف بذات خود ایک پیچیدہ موضوع ہر دور میں رہا ہے۔ مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہر دور میں ایسے شاعر بھی گزرے ہیں کہ جنھوں نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے اور اردو شاعری کو تصوف کی دنیا سے مالا مال کردیا۔ ان شاعروں نے عشق و عاشقی کے علاوہ تصوف اور صوفیت کو موضوع بنایا۔

تصوف کوئی سادہ یا عام موضوع نہیں ہے اس کے لیے زاہد یا متقی ہونا لازمی ہے مگر دوسری بات یہ بھی ہے کہ کسی کا حال کبھی کچھ اتنا اچھا رہتا ہے کہ ان کا قلم روانی سے لکھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے ان کے قلم کو الہامی جنبش آگئی ہو۔ وہ کلام صرف اور صرف مرزا غالب کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مرزا غالب کے بعد میرانیس، مرزا دبیر، امیر مینائی اور داغ دہلوی نے اس موضوع پر کلام لکھا ہے۔ داغ دہلوی لکھتے ہیں کہ۔

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

داغ دہلوی کے بعد الطاف حسین حالی، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبرالہ آبادی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی اور تصوف کے حوالے سے بہترین کلام پیش کیا۔ لیکن اسی عہد میں بریلی کی سرزمین سے ایک ایسا گوہر نایاب نمونہ دنیائے اردو ادب پر حاوی ہوا کہ جس کی شہرت نہ صرف ہندو پاک میں ہوئی بلکہ اپنی شاعری سے ان کا نام عرب وعجم میں لیا جاتا ہے یعنی عاشق رسولؐ امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ ایسے صوفی شاعر گزرے ہیں۔ کہ جنھوں نے احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ پیغمبر آخرالزماںؐ کی شان میں ایسی بہترین نعتیں لکھیں اور اہلِ بیت کے نام سے منقبت لکھے۔ انھوں نے تصوف کے ایسے باب کھول دیے جن کا تصور عام قاری کر نہیں سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایسے بیان کیا کہ لگتا ہے ان کا دل معرفتِ الٰہی سے سرشار ہوا ہے۔ وہ عاشق رسولؐ شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنے قلم سے موتی اس طرح پروتے ہیں کہ۔

ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں، چار پھرتے ہیں
نفس یہ کوئی چال ہے ظالم
کیسے خاصے بجار پھرتے ہیں
کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا
تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں

احمد رضا خان بریلوی کے عہد کے بعد جن شعرا نے بہترین کلام لکھا ہے۔ انھوں نے صرف عشق و عاشقی کو ہی محور بنالیا تھا۔ ان شعرا نے ظلم و تشدد، بھوک و افلاس، محکومی، آپسی نابرابری کے موضوعات پر ہی قلم اٹھایا۔ پھر کچھ مدت کے بعد نور وحدت کی ایک جھلک ظاہر ہوئی تو سیالکوٹ کی پاک سرزمین سے ایک ستارہ روشن ہوا جس نے اپنے کلام کے ذریعے انقلاب برپا کردیا۔ میری مراد ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ہے، شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال نے شاعری کی وہ تہیں کھول دی جن پر اردو ادب ناز کرتا ہے اور اپنے کلام میں ایسے موضوعات بھر دیے جن کے ذریعے قوم کی اصلاح اور معاشرے میں سدھا ہوا۔ علامہ اقبال تصوف کی نسبت یوں فرماتے ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہے دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

علامہ اقبال نے تصوف کو اپنے منفرد انداز میں جا بجا پیش کیا ہے کہتے ہیں کہ:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

علامہ اقبال کے بعد فانی بدایونی ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں تصوف کے موضوعات بھر دیے۔ فانی نے سرِ وحدت اور خدا کے ظہور کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

طور تو ہے رب ارنی کہنے والا چاہیے
لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

دوسری جگہ یوں کہتے ہیں کہ۔

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

فانی بدایونی نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں منزلوں کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ ان کے کلام میں صوفی رنگ اچھا خاصا دیکھنے کو ملا۔

فانی بدایونی کے بعد اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی نے عشق حقیقی کے موضوعات اپنے کلام میں بھر دیے ہیں اور رازِ پنہاں کی جھلک ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ تصوف کی رنگا رنگی ان حضرات کے کلام میں بھی موجود ہے۔

اردو شاعری میں ہر اصناف سخن میں صوفیانہ کلام اور تصوف کے نمونے ملتے ہیں۔ جیسے قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ، نظم، رباعی، قطعہ، حمد، نعت، منقبت، دوہے، کہہ مکرنی، گیت اور پہیلی وغیرہ۔

مختصر طور پر ہم یہ کہیں گے کہ متذکرہ شعرا کے یہاں تصوف کے عناصر میں اگر دیکھا جائے تو تصوف بذات خود ایک پیچیدہ موضوع ہر دور میں رہا ہے۔ مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہر دور میں ایسے شاعر بھی گزرے ہیں کہ جنھوں نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے اور اردو شاعری کو تصوف کی دنیا سے مالا مال کردیا۔ ان شاعروں نے عشق و عاشقی کے علاوہ تصوف اور صوفیت کو موضوع بنایا۔

■

Nazir Ahmad Ganai
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007
Cell.: 7889779687

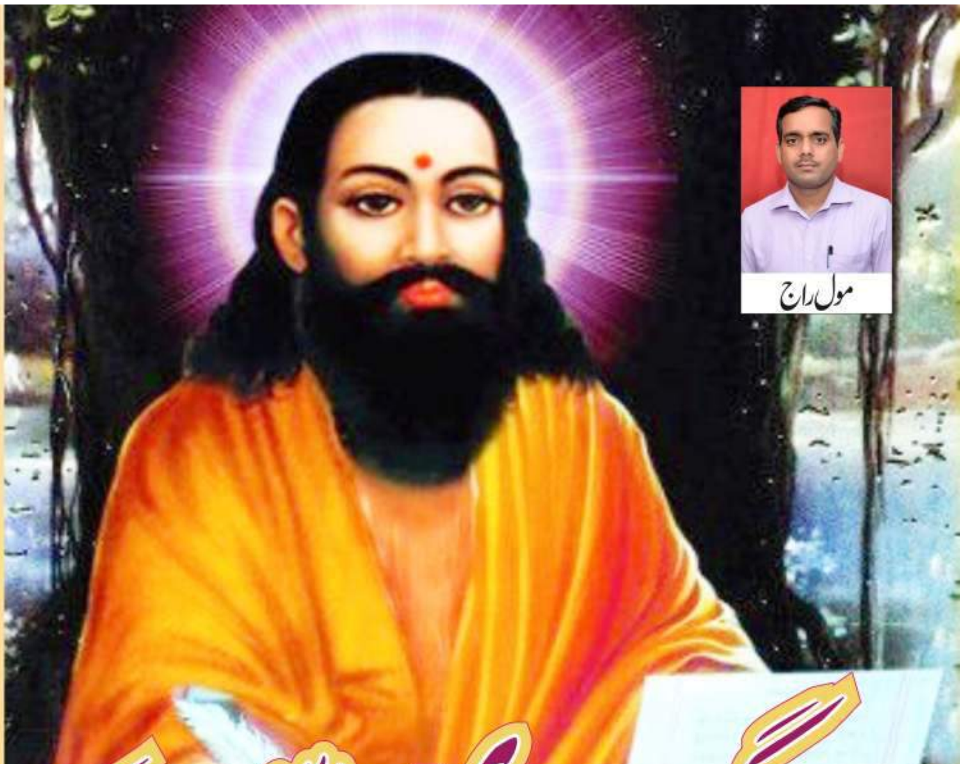

مول راج

گورو روی داس کے افکار و نظریات کی عصری معنویت

دورِ قدیم سے ہی سرزمینِ ہند ایسے صوفی سنتوں کا مسکن رہی ہے جو انسانی تعصّبات و تفریقات کو مٹانے کی غرض سے وقتاً فوقتاً دُنیا میں آتے رہے۔ ان کے قلوب تو انوارِ الٰہی سے منور تھے ہی لیکن اُنھوں نے اپنی تعلیمات و ہدایات کے ذریعے ایسے حیات بخش اسباق و نصائح یادگار چھوڑے جو نہ صرف ہمارے لیے مشعلِ راہ اور مینارِ نور کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ آئندہ بھی رُشد و ہدایت کا وسیلہ بنتے رہیں گے۔ وہ خدا کے مقرب بندے مخلوقِ خدا کی نیک تربیت و اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہوئے خود تو راہیِ ملکِ بقا ہوگئے۔ ہاں جاتے جاتے اس کرۂ ارضی پر اپنے علم و عمل کے ایسے لافانی نقوش چھوڑ گئے جو رہتی دُنیا تک خلقِ خدا کو گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکال کر نہ صرف حقیقت و معرفت کے اسرار و رموز سے آشنا کرنے کا فریضہ انجام دیں گے بلکہ ایک بہتر زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بھی سکھائیں گے۔

ایسی ہی اعلیٰ صفات کے حامل حضرات میں گورُو رویداس کا نام بھی خاص محترم اور اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کا نام بھگتی تحریک کے صوفی شعرا میں ایک نمایاں اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ گورُو رویداس کی پیدائش 1376 میں موضع سیر گوبردھن پور، ضلع بنارس اتر پردیش کے ایک پسماندہ گھرانے میں ہوئی۔ گورو رویداس بچپن سے ہی حد درجہ حساس اور ذہین تھے۔ خدا نے اُن کو اعلیٰ ترین صلاحیات و صفات عطا کی تھیں۔ اس دنیا میں آنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ہر انسان پانچ عناصر کا مجسمہ ہے اور ہر ایک کے اندر ایک سا لہو، مانس ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش کر کے اِنسان نے خود کو الگ الگ فرقوں میں بانٹ لیا ہے۔ سب ایک ہی مٹی کے پتلے ہیں۔ پھر بھی ایک افضل اور دوسرا ہیچ کیسے ہوسکتا ہے۔ غور کرنے پر ان کو سماج کے ٹھیکیداروں کا گورکھ دھندا سمجھ آیا کہ انھوں نے اپنے نجی مفاد کی خاطر سماج کے ایک طبقے کو نہ صرف اپنا غلام بنایا بلکہ اُن سے زندگی کے تمام حقوق چھین کر ان کو اس قدر حاشیے پر دھکیل دیا کہ اُن کا جیون جانوروں سے بھی بدتر ہوگیا۔ چنانچہ گورو رویداس نے سماج سے سماجی غیر برابری، ذات پات اور بھید بھاؤ جیسی تمام بدعتوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور حاشیے پر پڑے سماج کو اس دلدل سے نکالنے اور سماجی استحصال سے نجات دلانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

گورو رویداس کی فکر جب ان کے مشاہدے کے پروں پر سوار ہو کر بیان کی طرف گامزن ہوئی تب ان کا ذہن تلمیحات و تشبیہات کے انتخاب کے لیے کسی دوسری جگہ نہ جا کر ان کے اپنے ماحول ہی میں محدود رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں 'جوتا' جسم انسانی بن کر، 'آر' سحرِ دنیا بن کر اور 'رمی' حرص و ہوس کی علامت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اس دور کے دیگر شعرا نے جن استعارات کو متروک بلکہ مکروہ قرار دے رکھا تھا۔ رویداس نے انھیں کے ذریعے جب اپنے کلام میں تلقین و ہدایت کو نظم کیا تو ہندوستانی بھگتی ادب نے پہلی بار ایک انقلاب سا محسوس کیا۔ چونکہ اُن کی تعلیم لوگوں کو سماج میں رائج رسموں، رواجوں اور مذہبی رسومات میں سے نکال کر مالکِ کل کی باطنی ریاضت کی طرف راغب کرتی تھی۔

گورو رویداس کی کسی انسان، ذات پات، مذہب یا جماعت سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ددسرے کامل سنتوں کی طرح اُنھیں بھی ذات پات کی تفریقات منظور نہیں تھی، چونکہ یہ اِنسان کے بنائے ہوئے تھے خدا کے نہیں۔ مالک نے تو سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ بقول سنت کبیر؎

اِک جوت سے سب اُتپنا، کون باہمن کون سودا

اسی امر کو بابا نانک اپنے کلام میں یوں فرماتے ہیں:

اول اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے
اک نور سے سب جگ اُپجیا کون بھلے کو مندے

گورُو رویداس نے بھی کبھی کسی اِنسان کو اس کی ذات کی وجہ سے اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں مانا۔ اُن کا قول تھا کہ جنم سے کوئی بھی شخص افضل یا ہیچ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اعمال ہی اس کو چھوٹا یا بڑا بناتے ہیں۔ بقول آپ کے؎

رویداس جنم کے کارنے ہوت نہ کوئی نیچ
نر کو نیچ کر دیت ہے اوچھے کرم کو کیچ
جنم جات مت پوچھیئے، کا جات اور پات
رویداس پوت سب پربھ کے، کوؤ نہیں جات کُجات
رویداس اُپجے سب اِک نور تیں، باہمن مُلا سیخ
سبھ کو کرتا ایک ہے، سبھ کوں ایک ہی پیکھ

گورو رویداس کا فرمان ہے کہ واحد خدا کی اولاد ہونے کے ناطے ہم سبھی اِنسان برابر ہیں۔ ہم اپنے اعمال کے سبب برتر یا بدتر بنتے ہیں، کسی مخصوص ذات، خاندان یا مذہب میں پیدا ہونے سے نہیں۔ اس آفاقی سچائی کو انھوں نے بڑے ہی صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گورو رویداس نے کسی اسکول میں کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے نزدیک تعلیم کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ تعلیم ایک ایسی شے ہے جو صدیوں سے کند ذہنوں کو تیز کر کے اُن

کی کایا پلٹ سکتی ہے۔گور رویداس نے چودھویں صدی میں یہ محسوس کرلیا تھا کہ تعلیم کے حصول کے بغیر ہمارا شعور گردآلود رہ جاتا ہے۔نیز ہماری نجات کا وحد ذریعہ تعلیم ہے اسی کے طُفیل ہم غلامی کی زندگی سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔گورؤ رویداس اپنے کلام میں تعلیم کی اشد ضرورت اوراہمیت وافادیت پرزوردیتے ہوئے فرماتے ہیں:

چل من ہری چٹسال پڑھاؤں
مادھوابیدھاہت کین　　وبیک دیپ ملین

عصر حاضر میں ہوا اور پانی کی آلودگی پوری انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بنا ہے،جس سے نجات پانے کے لیے پوری دنیا طرح طرح کی کوششوں میں مصروف ہے، لیکن ابھی تک اس مسئلے کا کوئی مکمل حل تلاش کرنے میں ہم ناکام ہیں۔ماحولیاتی آلودگی کے سبب آئے دن مختلف نوعیت کے جان لیوا امراض سراُٹھا رہے ہیں اور انسانی وجود کے لیے ایک سنگین چیلنج کے طور پر ابھر رہے ہیں، لیکن گورورویداس نے آج سے سات سو برس قبل بنی نوع انسان کو اس حقیقت سے روشناس کروا دیا تھا کہ ہماری زندگی کی بنیاد ہوا اور پانی پر ہے۔زندگی میں ہوا اور پانی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

جل کی بھیت پون کا تھنبھا رکت بُوند کا گارا
ہاڈ ماس ناڑی کو پنجر پنکھی بسئے بچارا

گویا انسان کا جسم پانی کی دیوار، ہوا کا کھمبا (ستون) اور خون اور ویریہ کے گارا سے بنا ہے۔جو ہڈی، چمڑے، گوشت و ناڑیوں کا پنجرہ ہے جس میں ہوا اور پانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ان کے بغیر اس کی حرکت قلب کا چلنا ممکن نہیں۔

گورو رویداس کے کلام کے عمیق مطالعے سے یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ آپ بہت بڑے سماجی وسیاسی مفکر تھے اور دوراندیش بھی۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے سات سو سال قبل ایک ایسے وطن کا تصور پیش کیا اور ایک ایسے ملک کا خواب دیکھا جو بےغم ہو۔آپ کے عقیدے کی رو سے بے غم پور وہ مقام ہے۔جہاں کوئی غم یا دکھ نہیں اور نہ کوئی فکر و پریشانی ہے۔یہ ایسا وطن ہے جہاں خوشی اور مسرت کے سوا کچھ نہیں۔جہاں پر کوئی پابندی عائد نہیں۔یہاں ہر کوئی پرسکون اور پرامن زندگی بسر کرسکتا ہے۔بقول آپ کے:

بیگم پورہ شہر کو ناؤ　دُکھ اندہو نہیں تہہ ٹھاؤ
ناں تشویش خراج نہ مال　خوف نہ خطا نہ ترس زوال
قائم دائم سدا پادشاہی　دوم نہ سیم ایک سے آہی
آبادان سدا مشہور　اوہاں گنی بسے مامور

’بیگم پورہ‘ کی اصل خوبی یہ ہے کہ یہاں کسی قسم کے تعصب اور بھید بھاؤ کو قطعی جگہ نہیں ہو۔یہاں سب برابر ہوں، نہ کوئی لگان دیتا ہو اور نہ کوئی لیتا ہو۔یہاں کا حاکم سب کو یکساں دیکھتا ہو۔یہاں ہر کسی کو ایک پرسکون اور بہتر زندگی بسر کرنے کی تمام سہولیات میسر ہوں۔سماج میں بےغم پور کی طرز کے وطن کا ہر کوئی خواہش مند ہے۔ ہمارے دور کا اِنسان بھی اس طرح کے ملک کا متلاشی ہے یہاں کوئی سماجی درجہ بندی اور طبقاتی نظام نہ ہو۔اگر آج کا اِنسان اپنی محدود سوچ کے حصار سے نکل کر گورو رویداس کے کلام کا غائرمطالعہ کرے اور ان کی تعلیم کو عملی طور پر اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے تو یقیناً وہ ایک ایسے گھر، شہر اور ملک کی تشکیل کرسکتا ہے یہاں کوئی بھی غم نہ ہو۔لیکن یہ بےغم پورے تبھی بن سکتا ہے جب ہم آپس میں امن و ایمان، بھائی چارہ اور قومی اتحاد کو قائم کرکے تمام طرح کے تعصّبات کو ترک کردیں۔

گورورویداس نے مذہبی اتحاد کے فروغ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔آپ نے انتہائی صدق دلی سے خدائے واحد کے پیغام کو عوام میں پھیلانے اور قومی و مذہبی یکجہتی کو مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔آپ فرماتے ہیں۔

ہندوں سے کردوستی مسلمان سے پریت
رویداس پوت سب رام کے سب ہیں اپنے میت
سادھ سنگت مل رہیے مادھو
جیسے مدھپ مکھیرا
رویداس پیکھیا سودھ کر، آدم سبھی سمان
ہندو مسلمان کو، سرِشٹا اِک بھگوان
ہنڈ وتُرک منہہ نہیں کچھ بھیدا، دُوئے آییہ اِک دوار
پران پنڈ لوہہ مانس ایکے، کہہ رویداس بچار

ہر کوئی جانتا ہے کہ نشہ ایک لعنت ہے جو فرد کی بربادی کا دوسرا نام ہے۔اس کو ہر مذہب میں حرام قرار دیا گیا ہے۔’’اللہ کے رسول صلی اللہ وسلم نے فرمایا‘‘ لعنت ہے شراب پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، کشید کرنے والے اور اس پر مزدوری کرنے والے پر۔چنان چہ ایسے گھر، گاؤں، شہر اور ملک جو نشے کی لت میں گرفتار ہو جاتے ہیں وہاں کا ماحول ہمیشہ کشیدا ہی رہتا ہے اور آئے دن جھگڑے اور فساد سر اٹھاتے رہتے ہیں۔وہاں کے عوام اخلاقی گراوٹ کے شکار ہوجاتے ہیں۔گورؤ رویداس نے بھی اپنے کلام میں نشے کی پرزور مذمت کی ہے۔اور کسی بھی قسم کی منشیات کے استعمال سے پرہیز کرنے کا درس دیا ہے۔بقول آپ کے:

رویداس مدرامت پیجیے جو چڑے چڑے اُترائے
نام مہا رس پیجیے جو چڑے نہ اُترائے
سرسری سلل کرت بارنی رے
سنت جن کرت نہیں پانن

آپ فرماتے ہیں کہ شراب چاہے گنگا جل کی بھی کیوں نہ ہو خدا کے بندے اس کا استعمال نہیں کرتے۔وہ شراب کا نشہ کرنے کے بجائے خدا کی عبادت کے نشے کو اہمیت دیتے ہیں کیونکہ شراب کا نشہ چڑھ کر اتر جاتا ہے لیکن عبادت کا نشہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

گورورویداس کا دین مساوات، برادری، غمگساری اور ہمدردی کا دین ہے۔ان کی تعلیم کسی ایک فرقے، ذات یا مذہب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ پوری انسانیت کے مصلح تھے اور سب کی بھلائی وبہتری کے خواہاں:

ایسا چاہوں راج میں جہاں ملے سبن کو اَن
چھوٹ، بڑؤ سب سم بسے رویداس رہے پرَسن

غرض گورورویداس جہاں ایک اعلیٰ صفات عابد اور صوفی سنت ہوئے ہیں وہیں وہ ایک عظیم مصلح ومفکر اور سماج سدھارک کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔آپ کی تعلیمات میں انکساری اور خودسپردگی کا جذبہ واضح ملتا ہے۔آپ کے کلام میں گہرائی اور گیرائی ہے۔آپ کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہندی، اُردو، فارسی، گورمکھی اور ہندوستان کی بیشتر علاقائی زبانوں کا خاصا علم رکھتے تھے۔آپ کے کلام کے چالیس شبد اور ایک شلوک سِکھ دھرم کی مقدس کتاب ’شری گورؤ گرنتھ صاحب‘ میں درج ہیں۔گورو رویداس جیسے عابد، عالم اور مفکر صدیوں بعد اس دھرتی پر آتے ہیں۔بقول ڈاکٹر محمد اقبال۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گورو رویداس کے افکار ونظریات کا لب لباب یہ ہے کہ انھوں نے سماجی پاکھنڈ، غلط رسومات اور سماجی واخلاقی بدعتوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اُن کا قلع قمع کرنے اور ایک نئے اور ان تمام بدعتوں سے پاک سماج کی تشکیل کا صرف خواب ہی نہیں دیکھا بلکہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اس کا طریقہ بھی سمجھایا۔انھوں نے ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لیے فرد کی سیاسی، سماجی و اخلاقی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ روحانی ترقی پر بھی زور دیا۔ظاہر ہے آج کے دور میں بھی ان کے افکار ونظریات کی وہی اہمیت ومعنویت ہے جو پہلے تھی۔

■

Dr. Mool Raj
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt. College for Women Udhampur,
U.T. of J&K.
Mob: 9419950551
Email.: prof.moolraj2@gmail.com

محمد منور عالم

کبیر اور ان کے نظریات

تیرہویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد شمالی ہند میں بھکتی کے لیے اور بھی سازگار ماحول پیدا ہوا۔ رامانج کے سلسلے کے مشہور ومعروف بھکت رامانند کی بدولت جن کا زمانہ چودہویں صدی کے اواخر سے پندرھویں صدی کے وسط تک کا تھا۔ بھکتی کا مسلک شمالی ہند میں بڑے زور سے پھیلا۔

رامانند کے ہی شاگردوں میں ایک ممتاز شاگرد سنت کبیر بھی ہیں جن کا زمانہ پندرھویں صدی کی ابتدا سے اس صدی کے اواخر یا سولہویں صدی کے آغاز تک کا ہے، جس نے بھکتی کی ایک نئی راہ کھولی، جس پر ہندوؤں کے ساتھ بہت سے مسلمان بھی چلنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ معرفت کے اس نئے راگ میں جسے کبیر نے چھیڑا عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات سموئے ہوئے ہیں۔ اس میں عاشقانہ ذوق وشوق، سوز وساز، تسلیم ورضا کے ساتھ ساتھ مصلحانہ بلکہ مجاہدانہ جوش وخروش بھی ہے۔ ایک طرف وہ نغمۂ عشق ہے جو ذاتِ الٰہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور اور دوسری طرف ظاہری رسوم و روایات سے بغاوت یا فرسودہ افکار ونظریات کے خلاف ایک ابھرتی ہوئی آواز ہے۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں کہ:

''صحیح معنوں میں کبیر کی شخصیت ایسی تھی جس پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ متحد کلچر و تہذیب کے نمائندہ تھے۔ کبیر کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال کا یہ شعر ذہن پر نمودار ہوتا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا۔

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ فطرت کو بھی ہے ناز وہ انسان ہوں میں

بہر حال رامانند نے کبیر کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کبیر ان کی صحبت میں ایک عرصے تک رہے لیکن بعض یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان کی صحبت بہت مختصر تھی اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ کبیر کے تصورات پر رامانند کے اثرات بہت آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رامانند سے ملنے سے پہلے کبیر ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے اسی طرح ان کی شاگردی اختیار کر لینے کے بعد بھی دوسرے سنیاسیوں اور بھکتوں کے علاوہ مسلم صوفیا کی صحبت میں وقت گزارتے رہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ کبیر کی مذہبی معلومات جو حیرت انگیز حد تک وافر ہیں سوامی رامانند کی گوشٹیوں (مجلسوں) کی بھی دین ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان گوشٹیوں میں بھی شریک ہوئے جو مسلم صوفیوں اور ہندو سنتوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ اور اسرار و رموز بیان کیے جاتے تھے۔ ہندو دھرم کے علاوہ ان کی تصوف اور اسلام سے گہری واقفیت اور رغبت یہ قیاس آرائی کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود جس کا خود انھوں نے اعتراف کیا ہے، انھیں اچھی صحبت ملی تھی۔''

(پیغمبران سخن، علی سردار جعفری، ص 27-12)

غرض کبیر اسلام اور ہندو مت دونوں کی روحانی بنیاد کو ایک سمجھتے ہیں تصورات اور اصطلاحات سے یکساں کام لیتے ہیں۔ ذات پات اور رنگ ونسل سے وہ سخت متنفر ہیں اور انسانوں میں مساوات و برابری کے قائل ہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیم کو بھکتی کے دیگر علمبرداروں کی طرح نہ تو کوئی منظّم شکل دی اور نہ ہی قلم بند کیا۔ بلکہ اپنے خیالات و جذبات کو متفرق گیتوں میں ظاہر کیا جو ان کی زندگی میں برابر زبانی گائے جاتے تھے اور آگے چل کر 'وانی' اور 'بیجک' نام کی کتابوں میں جمع کیے گئے۔ اس عہد کے بہت سارے ہندو اور مسلمان ان پیروں میں داخل ہوئے جو کبیر پنتھی کہلاتے تھے۔ آج بھی ان کی تعداد خاصی ہے جو نہ تو عام ہندوؤں کی طرح مذہبی رسوم وقیود کے پابند ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کی طرح صوم وصلاۃ کے۔ ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب 'تمدن ہند پر اسلامی اثرات' میں لکھتے ہیں کہ:

''کبیر کے تعلیمات کے انداز بیان کی صورت گری صوفی اولیا اور صوفیاؤں نے کی ہے۔ ہندی زبان کا انھیں کوئی پیش رو نہ ملا۔ اس لیے وہ جن غولوں کی پیروی کر سکتے تھے وہ مسلمانوں سے ہی مل سکتے تھے۔ مثلاً فریدالدین عطار کا پند نامہ، بابا فرید اور کبیر کی نظموں کے عنوانوں کے تقابل سے امر باوضاحت معلوم ہوتا ہے۔ کبیر نے دوسرے صوفیا کے علاوہ جلال الدین رومی اور شیخ سعدی کا کلام بھی

یقیناً سنا ہوگا کیونکہ ان کے کلام میں ان صوفی شعرا کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔"

(اردو ترجمہ محمد مسعود احمد، مطبوعہ مجلس ادب لاہور)

کبیر کی شاعری کا پیرہن مذہبی ہے۔ جبکہ بھکتی اور تصوف کے امتزاج کا دوسرا نمونہ میر اور غالب کی شاعری کا پیرہن غیر مذہبی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر نہ صرف شاعر تھے بلکہ صوفی اور بھکت بھی تھے۔ اور میر و غالب محض ایک شاعر، لیکن اس پیرہن کے باوجود کبیر کا مزاج سیکولر تھا۔ یہی مزاج 'رومی' اور 'نانک' کا بھی ہے۔

کبیر نے اپنی ذات کے لیے زیادہ تر 'جولاہے' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور کبھی کبھی 'کوری' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ کبیر کے عہد کے آس پاس ہی 'کوریوں' کی ذات کے ایک بڑے حصے نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ 'کوریوں' اور 'جولاہوں' کی بستیاں جو پنجاب سے بنگال تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں پورے پورے قصبے ان سے آباد ہیں۔ کبیر پنتھیوں نے کبیر کی پیدائش کو ان حسین و جمیل لفظوں میں بیان کیا ہے۔

دھن گرجے، دامنی دمکے، بوندیں برسیں، جھر لاگ گئے
لہر تالاب میں کمل کھلے، تہاں بھانو پر گٹا بھئے

(بادل گرج رہے تھے بجلی چمک رہی تھی، بوندیں پڑ رہی تھیں اور مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس طوفان میں جب کبیر سورج کی طرح ظاہر ہوئے تو تالاب میں کمل کے پھول کھلے ہوئے تھے۔)

ممکن ہے اس دوہے کے الفاظ حقیقت کے ترجمان ہوں لیکن اگر استعارے کی زبان سمجھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنگوں کی گھن گرج میں قتل و غارت کی بجلیوں میں جہاں خون کی بارش ہو رہی تھی کبیر کی پیدائش سے یکا یک منظر پرسکون ہو گیا اور آسمان پر سورج نکل آیا اور تالابوں میں کمل کے پھول کھل گئے۔

چونکہ کبیر نے اپنے آپ کو بار بار جولاہا کہا ہے اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلام کو ترک نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کی سج دھج ہندوؤں کی سی تھی ماتھے پر تلک لگاتے اور جنؤ پہنتے تھے اس کے باوجود جرأت اتنی تھی کہ برہمنوں پر طنز کرتے تھے۔

تو بھامن میں کاشی جولاہا، بوجھو مور گیانا

کبیر نے اپنی شاعری میں ہندو تلمیحات و استعارات کا استعمال کیا اور اقبال نے اسلامی روایات سے اپنے تشبیہات و استعارات لیے۔ حالانکہ ان کا فلسفۂ خودی پر اپنشد اور ویدانیت کا اچھا خاصا اثر ہے۔ کبیر نے منصور کی طرح اناالحق نہیں کہا۔ لیکن اناالحق کا سارا جذبہ ان مصرعوں میں موجود ہے:

"نرگن آگے سرگن ناچے باجے سوہنگ تورا"

یعنی ذات کے سامنے صفات ناچ رہی ہے اور اناالحق کا راگ بج رہا ہے۔

کبیر کا بنیادی فلسفہ صلح کل ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

" کبیرا کھڑا بجار میں سب کی مانگے کھیر
نا کیہو سے دوستی نا کیہو سے بیر"

دوسری جگہ انھوں نے ذات پات کی نفرتوں پر شدت سے ضرب لگاتے ہوئے لکھا کہ:

"ہندو کہو تو میں نہیں مسلمان بھی ناہی
پانچ تتو کا پوتلا گیبی کھیلے ماہی"

(یعنی میں نہ ہندو ہوں نہ میں مسلمان میں غیب کے کھیل میں پانچ عناصر کا ایک پتلا ہوں۔)

رومی نے اپنی مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک شخص کو چار مختلف زبانوں کو بولنے والوں نے ایک ایک درہم دیا۔ ایرانی نے کہا اس سے انگور خریدے جائیں، عرب نے کہا نہیں 'عنب' خریدے جائیں، ترک نے 'ازم' کا نام لیا اور چوتھے نے 'رستافیل' کا، اس پر چاروں لڑنے لگے۔ اس وقت اگر کوئی ان چار زبانوں کا جاننے والا موجود ہوتا تو ان بے وقوفوں کو بتاتا کہ سب ایک ہی چیز مانگ رہے ہیں، لڑائی زبان کی ہے۔

اس نقطے کو اس طرح بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے کہ "رموزِ عشق بیاں کن بہ ہر زباں کہ تو دانی"۔ عشق زبان و بیاں کا محتاج نہیں، مکان و لامکاں سے پرے تخیل و تصورات کی حد سے آگے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سے آگے کوئی مقام نہیں۔ یہی فلسفہ ہے جو کم و بیش تمام بڑے لوگوں میں موجزن ہے۔ اور کبیر داس بھی اسی نظریے کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں زمین و آسماں کی گردش کسی کو ثابت و سالم چھوڑنے سے قاصر ہے۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے"

گویا کہ یہ ایک چکی ہے جس کا ایک پاٹ زمین اور دوسرا پاٹ آسمان ہے اور اس کے بیچ جتنی چیزیں ہیں کسی کو بقا نہیں۔ اسی نقطے کو قرآن نے کچھ یوں کہا کہ:

"کل من علیہا فان"

عام طور سے جو کبیر کے افکار و نظریات کا خاکہ ہمارے ذہن پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ کبیر داس یقینی طور پر موحد تھے اور خرافات اور رسوم و قیود سے بیزار تھے یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں اور کچھ ایسے افکار و نظریات تک بندی کی شکل میں کبیر پر مڑھ دیے گئے جس سے وہ بادی النظر میں نہ صرف اسلام بلکہ دیگر فرسودہ مذہب سے بیزاری کا شائبہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے الحاقی کلام میں یہ شعر دیکھا جا سکتا ہے۔

کنکر پتھر چون کے مسجد دیو بنائے
تا پڑ چڑھ ملا بانگ دے کیا بہرو بیو خدائے

یا پھر۔

پاہن پوجن ہری ملے تو میں پوجوں پہاڑ
واسے تو چکی بھلی کوٹ کھائے سنار

اس کا قطعی طور پر یہ مطلب نہیں کہ کبیر داس مذہبیات میں الجھ کر رہ گئے تھے بلکہ ان کے کچھ اشعار اس قدر وسیع و عریض ہیں کہ آج کی شاعری اس پر رشک کناں نظر آتی ہے۔ بلاتخصیص ان کے چند اشعار دیکھے جا سکتے ہیں جو اعلیٰ قدروں کے حامل ہیں اور اس کی روشنی میں برجستہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ all great man thinks alike ، وہ لکھتے ہیں کہ۔

ایسی وانی بولیے من کا آپا کھوئے
اوروں کو شیتل کرے آپوں شیتل ہوئے

بہ الفاظ دیگر ہماری گفتگو ایسی ہو جس کے اثرات ایسے ہوں جو متکلم اور مخاطب تمام لوگوں کو فرحت کا احساس دلاتا ہو۔ آگے لکھتے ہیں۔

کبیرا پانی راکھئے بن پانی سب سون
پانی گئے نہ اوبرے موتی مانوس چون

یعنی پانی سے مراد عزت و آبرو ہے جس کا پاس بہر صورت بہر طور پر رکھا جانا ناگزیر ہے۔ اگر عزت نہیں رہی جسے شاعر نے پانی سے تعبیر کیا ہے تو پھر حالت اس کی بے تاب ہوگی یا بے بس انسان کی یا پھر اس چونے کی کیفیت ہوگی جو بغیر پانی کے دم توڑ دیتا ہے۔

چلتے چلتے ان کا یہ شعر بھی ہمارے ذہن کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس طرح ہے۔

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو سایا نہیں پھل لاگے اتی دور

ان اشعار کو کبیر داس کی کتاب 'وانی' اور 'بیجک' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اخیر میں حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کبیر داس تمام فرسودہ رسوم و قیود سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔

■

Dr. Md. Monawar Alam
Guest Faculty
Department of Urdu
R.N. College, Pandaul,
Madhubani - 847234 (Bihar)
Mob.: 9934938380, 919852505654

کبیر داس

محمد یسین

کبیر داس کے دوہے اور بھجنوں کے سننے اور پڑھنے کے شائقین ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں ان کی قدر و منزلت ہر ادبی حلقے میں یکساں ہے اور ہو بھی کیوں نہ چونکہ ان کے دوہے اتنے دلکش اور دلفریب ہوتے ہیں کہ اس میں ایک خاص قسم کا رس ہوتا ہے جو قارئین یا سامعین کے کانوں میں پڑتے ہی دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ان کے کہے ہوئے اشعار اور دوہے و بھجن ہر خاص و عام و چلتے پھرتے لوگوں کی زبانوں پر رواں دواں ہیں۔ کبیر داس کے دوہوں اور بھجنوں میں ایک عجیب اثر انگیزی ہے۔ ان کے اشعار میں بلا کی سحر بیانی و جادو سی کیفیت ہوتی ہے۔ جو ایک بار سنتا ہے یا پڑھتا ہے تو دل فریفتہ ہو جاتا ہے۔ان کی مقبولیت ہر قوم و مذہب میں ایک سی ہے۔ پڑھے لکھے اور ادبی حلقوں میں ان کی جادو بیانی دوہوں و بھجنوں کی قدر تو ہوتی ہی ہے لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو طبقہ تعلیم سے نا آشنا ہے جن کا دور تک شعر و شاعری سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے ان کے درمیان بھی کبیر داس ویسے ہی مقبول و مشہور ہیں جیسے کہ دانشور طبقے میں۔ کبیر داس کو گئے صدیاں گزر گئیں لیکن اِن کے بھجن و دوہے پورے ہندوستان میں پڑھے و سنے جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں سادگی و شائستگی پائی جاتی ہے جو بآسانی لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ سادھو، سنتوں اور جوگیوں کو سیکڑوں اشعار زبان زد ہوتے ہیں۔ گلی محلّوں میں گا گا کر ایک بہتر پیغام دیتے ہیں اور سننے والے کو بلا تاخیر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔

کبیر داس کے دوہوں کو جتنی شہرت ملی اتنی ان کو بھی نہیں۔ان کے حالات زندگی اور ان کی پوری سوانح عمری کے بارے میں کوئی مدلل تاریخ نہیں ملتی۔ لوگوں نے بھی ذات پات و مذہب سے اوپر اٹھ کر ان کی کہی ہوئی بات و شعر و شاعری کو سمجھا اور پرکھا۔

ان کی شاعری یقیناً بڑی تھی۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''بڑی شاعری کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ اکثر و بیشتر اپنے خالق سے بے نیاز ہو جاتی ہے پھر اس کے وجود سے شاعر کا وجود پہچانا جاتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کے حالات گزرے ہوئے زمانے کے دھند لکے میں کھو جاتے ہیں اور واقعات افسانے کا لباس پہن لیتے ہیں۔'' (علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:13)

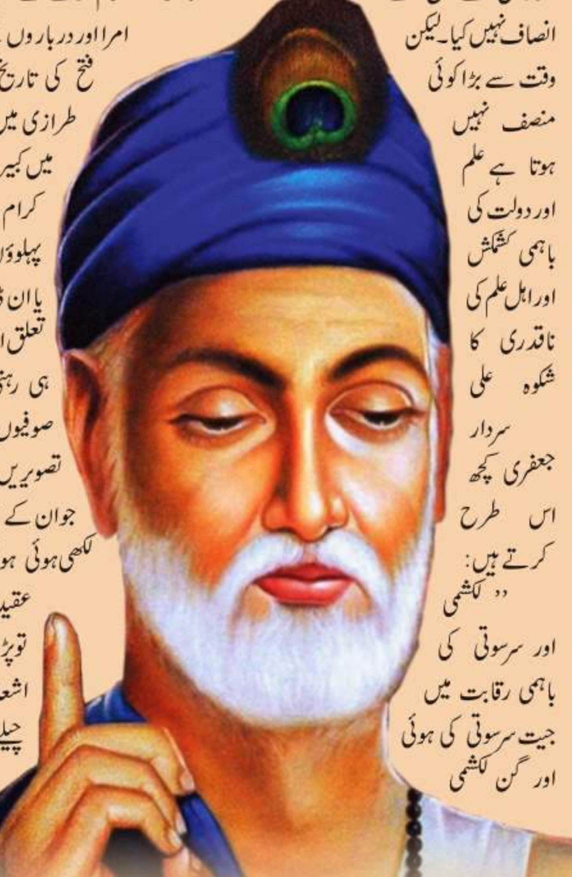

کبیر داس کے سوانحی حالات اکثر و بیشتر غیر معلوم یا کم از کم مشکوک ہیں ان کے ہم عصر ادیب اور مؤرخین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ لیکن وقت سے بڑا کوئی منصف نہیں ہوتا ہے علم اور دولت کی باہمی کشمکش اور اہل علم کی ناقدری کا شکوہ علی سردار جعفری کچھ اس طرح کرتے ہیں:

'' لکشمی اور سرسوتی کی باہمی رقابت میں جیت سرسوتی کی ہوئی اور گن لکشمی کے گائے گئے۔''

(علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص 13)

جب ہم اپنے قدیم زمانوں کے تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں بہت سی باتوں سے انکشاف ہوتا ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ قدیم زمانے کے مؤرخین شعرا و ادبا سب درباری ہوتے تھے کلی یا جزوی طور سے کسی نہ کسی دربار اعلیٰ سے منسلک ہوتے تھے اور انھیں کی مرضی و ذہنی طبیعت کے لحاظ سے شعر و ادب و تاریخ رقم کرتے تھے۔ وہ ذہنی اعتبار سے درباروں کے غلام ہوتے تھے۔ زیادہ تر وہ متعلقہ بادشاہوں، راجاؤں، امرا اور درباروں کے واقعات ان کے جنگ و جدل اور فتح کی تاریخ رقم کرنے میں دلچسپی لیتے اور رقم طرازی میں مصروف رہتے تھے لہٰذا ایسی صورت میں کبیر داس یا ان جیسے بھگتوں اور صوفیائے کرام کے واقعات اور سوانحی حالات پر انھیں پہلوؤں پر روشنی پڑ جاتی تھی جن کا ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ درباروں اور بادشاہوں سے تعلق استوار ہوتے تھے۔ بقیہ تصویر پس آئینہ ہی رہتی ہے علاوہ ازیں ان بھگتوں اور صوفیوں کے حالات زندگی کی کچھ دھندلی سی تصویریں ان تحریروں سے بھی اخذ کی جا سکتی ہیں جو ان کے چیلے اور شاگردوں و عقیدت مندوں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کی کارفرمائی ہوتی ہے اور کبیر داس تو پڑھے لکھے نہیں تھے ان کے کہے ہوئے اشعار، دوہے اور بھجنوں کو ان کے شاگرد یا چیلے ہی یکجا کرتے اور لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے محققین ان کے تعلق سے حقائق کی تلاش میں وہاں پہنچتے ہیں تو کئی پیچیدگیاں ان کے

سامنے درپیش ہوتی ہیں۔ جس میں اکثر و بیشتر ان نتائج تک رسائی نہیں ہو پاتی جن کی تلاش ہوتی ہے۔ اور جو کچھ ہاتھ لگتا بھی ہے وہ مشکوک ہوتا ہے۔ اسی لیے تو علی سردار جعفری قدیم تاریخ نگاری کی اسی کوتاہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات شاید پرانے تاریخ نگاروں کو معلوم نہیں تھی کہ تاریخ محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ سماجی اور معاشی رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی ہے اور فکر و شعور کا سفر بھی۔ اس فضا میں آتے جاتے کردار پرچھائیوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں اور اگر پرچھائیوں کا نام فراموش ہوجائے تو بھی فرق نہیں پڑتا۔ فکر و شعور کا سفر جاری رہتا ہے۔'' (علی سردار جعفری از پیغمبران سخن، ص:14)

آج کی سائنسی دنیا میں انسان نے چاند اور ستاروں تک تو اپنی رسائی کرلی ہے مگر پھر بھی حقیر، کمزور و ناتواں ہے۔ مصیبت زدہ ہے۔ گمراہ رہا ہے اور نسلی رنگوں و ذات پات میں منقسم ہے۔ اس کے درمیان مذہبی دیواریں حائل ہیں۔ انسان خودغرضی کا شکار ہے۔ سب ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے خواہاں ہیں اور ایسے ہی لوگ جب اقتدار سے سبکدوش ہوتے ہیں تو اپنی نیکی اور بدی کا محاسبہ کرتے ہیں ان کو ایک نئے یقین نئے ایمان اور خودغرضی سے پاک محبت کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت وہ سنتوں اور صوفیوں کی بارگاہ میں دوزانو ہوتے ہیں ان کی تعلیمات سے اپنے دلوں کو مزیّن و آراستہ کرتے ہیں۔ کبیر داس بھی انھیں سنتوں میں سے ایک ہیں جن کی کہی ہوئی باتوں کو آج یاد کیا جاتا ہے۔ کوئی دانش ور طبقہ ان کی کہی ہوئی باتوں پر غور و فکر کر رہا ہے۔ سنتوں اور صوفیوں کی تعلیمات آج ایک نئی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

کبیر آپ ٹھگائیے اور نہ ٹھگے کوئے
آپ ٹھگے سکھ اوپجے، اور ٹھگے دکھ ہوئے
انی کا بھلا نہ بولنا انی کی بھلی نہ چوپ
انی کا بھلا نہ برسنا، انی کی بھلی نہ دھوپ
جو تو کے کانٹا بووے، تاہی بووے تو پھول
تو کو پھول کو پھول ہے، وا کو ہے ترسول
پریم نہ باڑی اوپجے، پریم نہ ہاٹ بکائے
راجا پرجا جوہی روچے، سیس دہ لے جائے
پریم پریم سب کوئی کہے، پریم نہ چھے کوئی
آٹھ پہر بھنا رہے، پریم کہوائے سوے
پریتم کو پتیاں لکھوں جو کہو ہوے ودیس
تن میں، من میں، نین میں تا کو کہا سندیس

مندرجہ بالا اشعار سے ان کے اسلوب کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی زبان کتنی سرل اور معصومیت بھری تھی۔ کبیر داس کی زبان تمام بول چال کی زبان تھی وہ ہمیشہ عام فہم زبان کا استعمال بخوبی کرتے تھے۔ وہ کبھی کسی قسم کی تعلیم اسکول میں حاصل کرنے نہیں گئے باوجود اس کے وہ جس بات کو جس انداز میں چاہتے تھے بیان کردیتے تھے۔ وہ الفاظ کو جو روپ دینا چاہتے تھے وہ ہوگیا تو ٹھیک ورنہ اپنی ٹیڑھی میڑھی زبان میں اس کو پرو دیتے تھے۔ ان کے دوہوں اور اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کھڑی زبان ان کے سامنے مجبور ہو جایا کرتی تھی کہ اس کی لاپرواہ پکڑ سے کیسے چھوٹے ایک چوپائی میں کبیر داس پوری کہانی بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پڑھائی لکھائی نہ کرنے کے بجائے بھی اتنے امکانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کبیر کی شاعری اور ان کے کہے ہوئے دوہے مخطوطوں کے ذریعے ہم تک پہنچے جو ان کے ماننے والوں کے پاس محفوظ تھے۔ اور یہ تمام مخطوطے دیوناگری رسم الخط میں تھے۔ کبیر کی زبان میں ان کی ملی جلی کھڑی بولی چاشنی پیدا کرتی ہے۔ کھڑی بولی جس کو وہ استعمال میں لاتے ہیں ان کی شاعری میں موزوں روحانی بھی ہیں اور اخلاقی بھی، لیکن ان کے کہنے کا انداز ولب ولہجہ عوام کی عام زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

کبیر کی شاعری کی مقبولیت کا راز ان کی سادہ زبان تھی جو سماج کے ہر طبقے کی سمجھ میں آتی تھی۔ محنت کش عوام اس کو زبانی یاد کرلیتے تھے۔ ان کی شاعری کے حسن کو محاورے دوبالا کردیتے ہیں۔ وہ محاوروں کو بڑے سلیقے سے

کبیر نے اپنی بات کو عوام الناس تک آسانی سے پھنچانے کے لیے محاوروں کو ذریعہ بنایا ھے۔ تصوف اور بھکتی تحریک سے وابستگی نے کبیر داس کی شاعری میں ناصحانہ ماحول پیدا کیا ھے اور ساتھ ھی ساتھ زبان کی سادگی نے انھیں عوام الناس میں مقبول سے مقبول تر بنا دیا جو آج تک قائم و دائم ھے۔

بہترین دوہے کہے ہیں کہ کبیر داس کی قادرالکلامی کو دیکھ کر ادب کے بڑے بڑے ادبا و شعرا اور ماہرین انگشت بدنداں ہوجاتے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان اور اسی لب و لہجے کو استعمال کر کے طنزیہ کلمات کہتے جس سے پنڈتوں اور جوگیوں نیز مولویوں میں ایک عجیب تلملاہٹ پیدا ہوجاتی تھی۔ چونکہ کبیر بہت ہی سیدھی سادی زبان میں ایسی ضرب کاری کرتے تھے کہ ان کے مخالفین میں سوائے سننے کے اور کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔

کبیر داس سماجی اصلاح کا کام کرتے تھے۔ ان کے دوہوں کے الفاظ پاکھنڈیوں کے پاکھنڈ اور دھرم کے نام پر ڈھونگ و خودغرضی، ذاتی دوکانداروں کو للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبیر ایک سچے اور حساس القلب انسان تھے۔ ان کے اشعار سوالیہ ہوتے ہیں۔ اپنے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

ذاتی جولاہا نام کبیرا
بن بن پھرُ اداسی
ذاتی جولاہا متی کوں دھیر۔ ہری گن رمئے کبیر
توبر معمان میں کاشی کا جولاہا

امیر خسرو کی ہندوی شاعری سے اردو میں شاعری کے

استعمال میں لاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ محاورے کی تشکیل غیر شعوری طور پر عوام میں عام طور پر استعمال ہوتی ہے اور اپنی افادیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ محاورے زبان و ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔

جب ہی نام ہردے دھرا بھیا پاپ کا ناس
مانو چنگی آگ کے پرانی کھاس

لکھا لکھی کی ہے نہیں دیکھا دیکھی بات
دلہا دولہن مل گئے پھیکی پڑی برات
جوگی پڑے وجوگ کہیں گھر دور ہے
پاس ہی بست ہجور، تو چڑہت کھجور ہے

کبیر نے اپنی بات کو عوام الناس تک آسانی سے پہنچانے کے لیے محاوروں کو ذریعہ بنایا ہے۔ تصوف اور بھکتی تحریک سے وابستگی نے کبیر داس کی شاعری میں ناصحانہ ماحول پیدا کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ زبان کی سادگی نے انھیں عوام الناس میں مقبول سے مقبول تر بنا دیا جو آج تک قائم و دائم ہے۔

■

Dr. Mohd Yaseen
A-380, GTB, Nagar Kareli
Allahabad - 211016 (UP)
Mob.:9336084416

محمد اکرام

ایسے تھے نصرت ظہیر

اردو کے عظیم المرتبت مزاح نگار نصرت ظہیر کا تعلق اصلاً سہارنپور سے تھا، جہاں کی خاک میں وہ مدفون ہوئے۔ جب کہ گذشتہ 40 برسوں سے وہ دارالحکومت دہلی میں مقیم تھے، مگر آخری ایام میں جب ان کی طبیعت مسلسل خراب چل رہی تھی تو اپنے آبائی وطن سہارنپور میں رہنے کو ترجیح دی کیونکہ یہاں سے ان کے بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہیں کی خاک سے اٹھ کر وہ خورشید بنے تھے اس لیے شاید اس خورشید کو وہیں غروب ہونا تھا۔

نصرت ظہیر کی وفات کی خبر اچانک آئی مگر حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ طویل عرصے سے مسلسل بیمار چل رہے تھے۔ کسی بھی وقت رحلت کی خبر آسکتی تھی، وہ کہتے بھی رہتے تھے کہ اب گنتی کے چند دن باقی ہیں۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد وہ اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ ان کے ساتھ ہم لوگوں کی بہت طویل مصاحبت رہی، اس لیے اس بات کا ملال رہا کہ ہم لوگ ان کے جنازے میں شریک نہ ہوسکے، کیونکہ ان کی تدفین دہلی کے بجائے سہارنپور میں ہورہی تھی۔ وفات سے کچھ دنوں قبل قومی اردو کونسل کے نمبر پر نصرت ظہیر کا اس وقت ٹیلی فون آیا جب ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ لنچ کررہے تھے۔ ان کی آواز سن کر ہی محسوس ہوا کہ ان کی طبیعت شاید زیادہ خراب ہے۔ زبان میں اتنی لکنت تھی کہ کوئی بھی بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی اتنا تو سمجھ میں آگیا کہ حقانی القاسمی سے بات کرنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ نصرت صاحب نے باقاعدہ عبدالحیٔ اور دیگر لوگوں کے احوال بھی اپنی لڑکھڑاتی آواز میں دریافت کیے، جب کہ عبدالحیٔ اس وقت قومی اردو کونسل کو خیرباد کہہ کر متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر جوائن کرچکے تھے۔ حیرت تو یہ ہوئی کہ انھوں یہ بھی دریافت کیا کہ آپ کون بول رہے ہیں، اسی درمیان فون ڈس کنیکٹ ہوگیا۔ اتنی دیر کی گفتگو کے باوجود میں نصرت ظہیر صاحب کی آواز کو پہچان نہ سکا۔

نصرت ظہیر کا نام میں نے پہلی بار 1995 میں جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس میں دورانِ تعلیم سنا تھا۔ نصرت ظہیر اس وقت روزنامہ 'قومی آواز' کے ضمیمے میں کالم لکھا کرتے تھے۔ قومی آواز کا یہ ضمیمہ اتنا مشہور تھا کہ ملک بھر کے قارئین ہمیشہ اس کے منتظر رہتے۔ نصرت صاحب سے میری باضابطہ ملاقات سہ ماہی 'استعارہ' دہلی کے دفتر میں ہوئی۔ غالباً نصرت صاحب صلاح الدین پرویز کے کسی پروجیکٹ پر کام کررہے تھے۔ اس لیے کبھی کبھار خود ہی آجاتے اور کبھی کسی بچے کو بھیج دیتے۔ نصرت ظہیر صاحب کو ہم نے کبھی بھی استعارہ کے دفتر میں دیگر لوگوں کے ساتھ چائے اور قہقہے لگاتے نہیں دیکھا، ممکن ہے ان کے پاس اتنا وقت نہ رہتا ہو کہ اس طرح کی محفلوں میں شریک ہوں۔ ان سب کے باوجود استعارہ میں کام کرنے والوں کے چہروں حتیٰ کہ نام سے بھی ان کی آشنائی تھی۔ یہ بات میں یقین سے اس لیے بھی کہہ سکتا ہوں کہ مارچ 2010 کا واقعہ ہے ایک بار نصرت ظہیر کا میرے نمبر پر فون آیا۔ انھوں نے کہا میں قومی اردو کونسل، جسولہ، نئی دہلی سے نصرت ظہیر بول رہا ہوں، تم آکر مجھ سے ملاقات کرو۔ اس وقت کونسل کے عملے سے شناسائی تو دور، مجھے اس کے راستے کا بھی علم نہیں تھا۔ کونسل پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میری ملاقات ہادی رہبر سے ہوئی، ہادی رہبر کو میں پہلے سے جانتا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ قومی اردو کونسل کے دفتر میں ملازمت کررہے ہیں۔ بہرحال ہادی رہبر مجھے نصرت ظہیر کے پاس لے گئے جہاں وہ آبگینہ عارف سے محو گفتگو تھے۔ نصرت صاحب سے آمنے سامنے یہ میری پہلی گفتگو تھی۔ انھوں نے مجھے شعبۂ ادارت کے جملہ اسٹاف سے متعارف کرایا اور پھر میں واپس اپنے کمرے آگیا... کچھ دنوں بعد میں بھی قومی اردو کونسل کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوگیا جہاں ہم تقریباً 5 سالوں تک ایک ساتھ کام کرتے رہے۔

قومی اردو کونسل میں نصرت ظہیر کی بہ حیثیت اعزازی مدیر وابستگی سے اردو ادب میں ایک نئی بحث چھڑ گئی۔

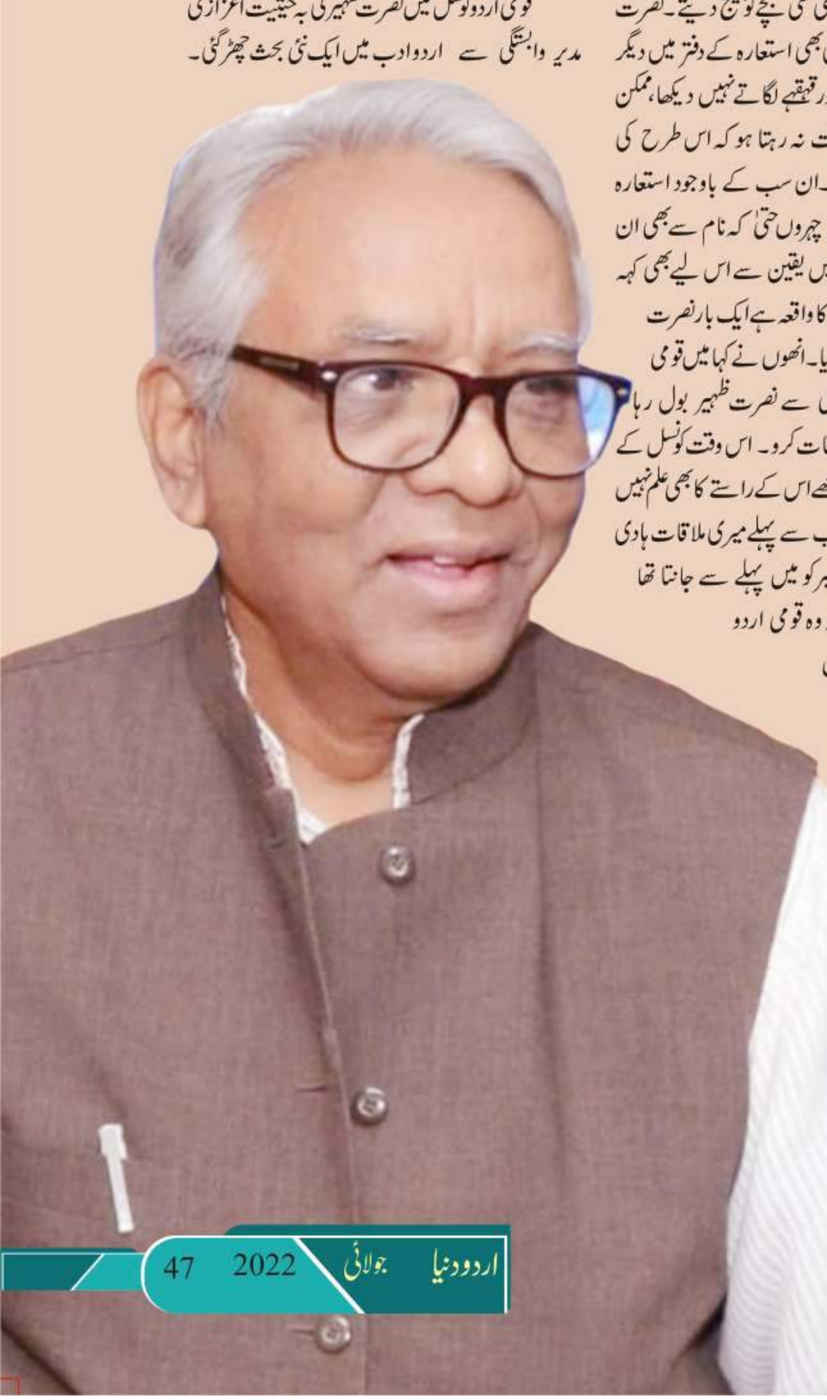

چہار جانب چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ 'مخمور سعیدی (وفات: مارچ 2010) جیسے تجربہ کار، باصلاحیت اور پروقار شخصیت کی جگہ نصرت ظہیر کیسے پر کرسکتا ہے۔ لگتا ہے یہ کسی بارسوخ شخص کی پیروی سے یہاں تک پہنچا ہے۔' دفتر سے باہر نصرت ظہیر کے بارے میں کیا کیا باتیں ہورہی ہیں اس سے وہ بخوبی واقف تھے، لیکن نصرت ظہیر ہار ماننے والے کب تھے، آخران کا بھی بہ حیثیت صحافی ایک طویل تجربہ تھا۔ اس بیچ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے اور ان سب کا جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس طرح کے چیلنجز کا سامنا کرنے کا نام ہی نصرت ظہیر تھا۔ انھوں نے بھی عزم مصمم کرلیا کہ بھلے ہی میں مخمور سعیدی جیسا نہ بن سکوں، لیکن میں کچھ ایسے نئے تجربے ضرور کروں گا جن سے اِن رسالوں کے معیار و وقار میں اضافے کے ساتھ انھیں ایک نئی شناخت بھی حاصل ہو۔ اس کا پہلا ثبوت 'اردو دنیا' اگست 2011 کی صورت میں سامنے آیا، جب یہ رسالہ بلیک اینڈ وائٹ سے بہترین آرٹ پیپر اور خوبصورت تصاویر سے مزین فور کلر میں شائع ہونا شروع ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ نصرت ظہیر نے اس رسالے کی تقدیر و تصویر دونوں ہی بدل ڈالی۔ نصرت ظہیر کی ایک اور کامیاب کوشش کا نتیجہ ہے 'بچوں کی دنیا'۔ بچوں کے لیے اپنے زمانے کے مشہور رسالے کھلونا، غنچہ وغیرہ کے بند ہوجانے کی وجہ سے اس جیسے رسالے کی ضرورت خاص طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ اس کے تعلق سے ان کے ذہن میں کئی قسم کے آئیڈیاز بھی تھے، جس کا ذکر وہ اس وقت کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ سے وقتاً فوقتاً کرتے بھی رہتے تھے، حمید اللہ بھٹ زبانی طور پر اس رسالے کی منظوری دے بھی چکے تھے، لیکن اس کی اشاعت ان کے بعد پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی ڈائرکٹرشپ میں شروع ہوئی۔ اس کا پہلا شمارہ جون 2012 میں آیا۔ اس رسالے کو بچوں کے مزاج اور معیار کے مطابق بنانے میں نصرت ظہیر نے اپنی پوری توانائی صرف کرڈالی، رات دن وہ اسی میگزین کے بارے میں سوچتے رہتے۔ ان کی محنت کا ثمرہ تھا کہ چند ہی مہینوں میں اس رسالے نے سرکولیشن کے اعتبار سے ایک نیا ریکارڈ بنا ڈالا۔ قومی اردو کونسل کا ایک اور رسالہ ہے سہ ماہی 'فکر و تحقیق'، جس میں خالص تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نصرت ظہیر نے اس رسالے کو بھی اپنی استطاعت سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ قومی اردو کونسل سے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہونے والے 'اردو درپن' کی اعزازی ادارت بھی انھوں نے سنبھالی یہ اور بات کہ اس وقت وہ قومی اردو کونسل کے بجائے راشٹریہ سہارا میں کام کررہے تھے۔ 'اردو درپن' میں نصرت ظہیر کی کاوش کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے انھیں مخمور سعیدی کے انتقال کے بعد ملازمت کی پیشکش کی جسے انھوں نے بہ خوشی قبول کرلیا۔

نصرت ظہیر کی شخصیت کے حوالے سے یہ مضمون میں مشاہدے کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ نصرت ظہیر کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا جائے جن سے عام طور پر قارئین واقف نہیں ہیں۔ کوشش یہ بھی ہوگی کہ بیانیے کا انداز مثبت ہو کہ اس سے ان کی شخصیت مجروح نہ ہو۔

> **نصرت ظہیر کو اپنی صلاحیت اور علمی لیاقت پر کبھی غرور نہیں رہا، اگر ان کو کبھی کوئی عبارت سمجھ میں نہیں آتی، یا کسی شعر کی بھتر تشریح نہیں معلوم ھے یا کسی مشکل لفظ کے معنی یا ا س کے تلفظ کا معاملہ ھو تو اکثر وہ ھم میں سے کسی سے بھی پوچھ لیتے اور اگر کسی نے اس کا جواب ان کی سوچ سے بھتر مے دیا تو وہ بھت خوش ھوکر اسے شاباشی بھی دیتے اور یہ کھتے کہ علم اس سمندر کے مانند ھے جس کی وسعت اور گھرائی کی کوئی حد نھیں، سچ میں علم کامطلب ایک دوسرے سے اخذ و اکتساب ھے۔**

نصرت ظہیر کے مذہب کو لے کر عام لوگوں کے خیالات منفی تھے کیونکہ وہ مذہب کو بھی مزاح کے پہلو سے دیکھتے تھے۔ اس تعلق سے نصرت ظہیر کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ گرچہ وہ بہ ظاہر مذہب کے تعلق سے آزاد خیال تھے مگر وہ دین اسلام کے پیروکار تھے۔ وہ آخری پیغمبر حضرت محمدؐ کو دنیا کی معزز ترین ہستی سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ بھی نصرت ظہیر صاحب بتاتے تھے کہ ''میں چند برس پہلے عمرہ کے لیے گیا تھا۔ جب میں خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کے لیے گیا تو مجھے حضور کی زندگی کے ان چھوئے پہلو جو انھوں نے ابتدائے اسلام میں انجام دیے تھے، مثلاً اپنے ہاتھوں اس مسجد کی بنیاد رکھی تھی اور حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کیا تھا وغیرہ، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ چیزیں میری نظروں کے سامنے انجام پا رہی ہیں، مجھے اسی وقت سے حضور کی شخصیت میں ایک اعلیٰ و برتر انسان کی صفات نظر آئیں۔'' البتہ وہ عام گفتگو میں ہمیشہ یہ جملے استعمال کرتے کہ یار اللہ میاں کیا کرتے ہیں، وہ ہیں بھی یا نہیں، ممکن ہے کہ یہ بات بھی وہ مزاح کے پہلو میں کہتے رہے ہوں۔ خیر میری نظر میں نصرت صاحب مذہب اسلام کے سچے پیروکار تھے، اس کی تصدیق اس واقعے سے بخوبی ہوجاتی ہے کہ ایک بار رمضان کا مہینہ تھا، ہم لوگ روزے کی حالت میں دفتر پہنچے تو نصرت صاحب مخاطب ہوئے، یار! میں روزے سے ہوں، تم لوگ مجھے فینی مہیا کرادو تو بہت اچھا ہوگا کیونکہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں یہ سب چیزیں نہیں ملتی ہیں۔ اس جملے سے میں حیران تھا کہ نصرت ظہیر اور روزہ..!

عام دنوں کے مقابلے جمعہ کے روز نصرت ظہیر زیادہ تر تاخیر سے دفتر آتے تھے۔ کبھی کبھی تو ہوتا کہ سارے لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر آتے تو دیکھتے کہ نصرت صاحب دفتر میں موجود ہیں۔ کئی بار تو تفریحاً ہم میں سے بعض لوگ پوچھتے کہ سر! آپ نے جمعہ کی نماز پڑھ لی؟ پھر وہ کہتے'' تم لوگوں کو پتہ نہیں ہم نے نمازیں بہت پڑھی ہیں، اور ویسے بھی تمھارے اللہ میاں تو ہماری سنتے نہیں۔'' پھر ہمیں میں سے کوئی کہتا ''سر! اللہ میاں تو ساری کائنات کے ہیں پھر ہم تم کی تفریق کہاں سے آ گئی''۔ اس طرح کے جملے ہم لوگ نصرت صاحب سے ہمیشہ سنتے اور محظوظ ہوتے رہتے۔

نصرت ظہیر وفات سے کچھ برس قبل جب انڈر یوز گنج سے شفٹ ہوکر شاہین باغ آگئے، تو مذہب اسلام کو مزاح نہیں بلکہ ایک مکمل دین کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ شاید اس کی وجہ ماحول کا اثر ہو کیونکہ نصرت ظہیر نے شاہین باغ شفٹ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ یار ہم ایسے علاقے میں ہیں جہاں ہمیں مذہب کے بہت سارے امور کی انجام دہی کے ساتھ اپنی بچیوں کی شادی میں بھی دشواریاں پیش آرہی ہیں، اس لیے ہم نے یہاں سے منتقل ہوکر شاہین باغ بسنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ خدا کے فضل سے شاہین باغ شفٹ ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ان کی دو بیٹیوں کی شادی بھی ہوگئی۔ خدا پر ان کا یقین بھی اس وقت کامل ہوگیا جب ہولی فیملی میں ان کی ناک کا آپریشن ہوا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد جب وہ گھر آئے تو ہم لوگ ان کی تیمار داری کے لیے گئے، آپریشن کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''جب مجھے ڈاکٹر نے بستر پر سلاتے ہوئے ناک پر بیہوشی کا ماسک لگایا تو اچانک میری نظر اوپر کو گئی اور میں نے خدا کو یاد کرتے ہوئے کہا اللہ پاک مجھے تو ہی نئی

زندگی دے سکتا ہے۔'' اللہ کے فضل سے نصرت ظہیر صاحب صحت یاب ہوگئے۔

عملی زندگی میں نصرت ظہیر اسم بامسمیٰ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مجبوروں کی مدد، شکست خوردہ لوگوں کے حمایتی، دوستوں کے دوست، قول کے سچے، ارادے کے پکے بن کر آپ نے اپنی زندگی گزاری۔ کینہ، بغض، حسد، نفرت، عداوت جیسے الفاظ تو شاید ان کی ڈکشنری میں تھے ہی نہیں۔ ہم میں سے اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتے ہوئے دیکھتے تو اپنی طاقت، جرأت اور حوصلے سے بڑھ کر حمایت میں کھڑے ہوجاتے۔ اگر کوئی اپنے حدود پار کرنے کی کوشش کرتا تو اس کو اس کی حدیں یاددلانے میں بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ نصرت ظہیر کے اندر سب سے بڑی خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہ کہ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا، ان کے ظاہر و باطن میں تفریق نہیں تھی، انسان دوستی ہی ان کا شیوہ تھا اور وہ ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر میں اسے نبھاتے بھی نظر آتے۔ نصرت ظہیر کے ظاہر و باطن کے حوالے سے ایک مضمون حقانی القاسمی نے 'ایک چہرے والا آدمی' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

''نصرت ظہیر کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور دور سے بھی، مگر دونوں میں کوئی دوری نظر نہیں آئی۔ جب کہ اکثر شخصیات میں یہ دوری نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت نہ نیم دروں نیم بروں ہے اور نہ ہی دولخت۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے میری جتنی والہانہ شیفتگی ہے اتنی ہی ان کی شخصیت سے بھی ہے۔''

(ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، نصرت ظہیر نمبر، ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ص 64)

دوستوں سے دوستی نبھانا تو نصرت ظہیر کا طرۂ امتیاز تھا لیکن اگر کبھی کسی کے ذریعے ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی تو اس سے آر پار کی لڑائی سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کچھ ادبی معرکہ آرائیاں بہت مشہور ہیں۔

نصرت ظہیر بھی ایک انسان تھے اور انسان غلطیوں کا مجسمہ ہے۔ اگر اس سے خطائیں نہیں ہوں گی تو پھر وہ انسانیت کے دائرے سے خارج ہوجائے گا۔ بہ حیثیت انسان نصرت ظہیر میں جو مجھے سب سے بڑی کمی دیکھنے کو ملی وہ ہے ان کے لہجے کی کرختگی، اس لہجے کی وجہ سے ان کو زندگی کے ہر موڑ پر ڈھیروں نقصان اٹھانے پڑے۔ اکثر وہ کہتے بھی تھے کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی سے تلخ کلامی کروں مگر پتہ نہیں کیسے یہ عمل مجھ سے سرزد ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر نصرت ظہیر کسی سے تلخ کلامی سے پیش آتے تو کچھ ہی دیر کے بعد فوراً اس سے معافی بھی مانگ لیتے، کہتے کہ یار پتہ نہیں کیسے مجھ سے یہ غلطی ہوگئی، معاف کردینا۔ معافی مانگنے کو بہت سے لوگ اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں لیکن نصرت صاحب اس کو حسین عمل سمجھتے تھے۔ یہ نصرت ظہیر کی ایسی خوبی تھی جس کی تعریف و تحسین ضروری ہے۔

نصرت ظہیر کو اپنی صلاحیت اور علمی لیاقت پر کبھی غرور نہیں رہا، اگر ان کو کبھی کوئی عبارت سمجھ میں نہیں آتی، یا کسی شعر کی بہتر تشریح نہیں معلوم ہے یا کسی مشکل لفظ کے معنی یا اس کے تلفظ کا معاملہ ہوتو اکثر وہ ہم میں سے کسی سے بھی پوچھ لیتے اور اگر کسی نے اس کا جواب ان کی سوچ سے بہتر دے دیا تو وہ بہت خوش ہوکر اسے شاباشی بھی دیتے اور یہ کہتے کہ علم اس سمندر کے مانند ہے جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی حد نہیں، سچ میں علم کا مطلب ایک دوسرے سے اخذ و اکتساب ہے۔ میرے نزدیک نصرت ظہیر کی یہ ایسی خوبیاں ہیں جو عام طور پر آج کے دور میں کم ہی لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

نصرت ظہیر کا آبائی وطن سہارنپور (یوپی) ہے، مگر ان کی ولادت 9 مارچ 1951 کو سکندر آباد، ضلع بلند شہر، یوپی میں ہوئی۔ کچھ دنوں سہارنپور میں رہے اور پھر دہلی منتقل ہوگئے جہاں انھوں نے ایک کالم نگار، صحافی، طنز و مزاح نگار اور مترجم کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت بنائی۔

'میں اور ہم' کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے کہ ''ضلع بلند شہر (اترپردیش) کی تحصیل سکندرآباد کے محلّہ بھاٹیہ واڑہ میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا، مغربی اترپردیش کے شہر سہارنپور میں آنکھ کھولی، مگر احتیاطاً ہوش نہ سنبھالا کہ والد صاحب کافی غصہ والے آدمی تھے۔ پھر محمد علی جوہر لائبریری، مسجد خانی باغ نخاسہ، میونسپل اسکول محلّہ انصاریان ومحلّہ شاہ بہول اور مدرسہ مخزن العلوم کے لائق ترین مولوی صاحبان اور اساتذہ کرام کی قمچیوں کے سائے میں الف ب ت پڑھی، مگر عقل نہ آئی۔ چنانچہ بالغ ہونے کے لیے اسلامیہ انٹر کالج سے رجوع کیا، جہاں نورانی صورت اور روشن دماغ استادوں نے علم کی پیاس بڑھائی... کسی طرح گریجویشن کیا، میکینکل کاموں اور الیکٹرانکس کا شوق ہوا تو آئی ٹی آئی اور ریڈیو انسٹی ٹیوٹ میں تربیت حاصل کرکے شوق کو روزگار بنالیا۔ ابھی معاملہ کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے کس طرف سے اردو صحافت نے آکر آغوش میں لے لیا اور کسی امربیل کی طرح پورے وجود سے لپٹ گئی۔ شاید یہی دیکھ کر شاعری نے دھڑ سے اپنے دروازے بند کرلیے اور ایک شاعر، سابق شاعر بن گیا۔ اسی کے عشرے کی پہلی تاریخ سے زندگی کا دوسرا سفر دہلی میں شروع کیا۔ روزنامہ ملاپ، تیج، سروِتم ریڈرس ڈائجسٹ اور ریڈیو وغیرہ میں جم کر کام کیا، جون 1987 میں وقت کے ہاتھوں نے کان پکڑ کر روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی کے دفتر میں رپورٹر بنا کر بٹھا دیا اور ابھی وہاں کام کرتے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھ دیا۔'' (میں اور ہم، مشمولہ شگوفہ نصرت ظہیر نمبر، ص 10)

نصرت ظہیر کی مشہور کتابوں میں تحت اللفظ (1992)، بقلم خود (1996)، خراٹوں کا مشاعرہ (2002)،

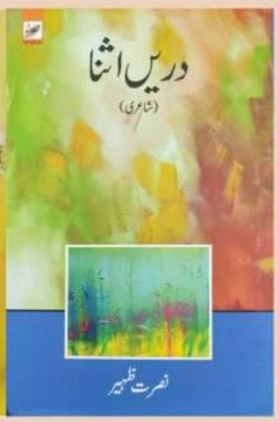

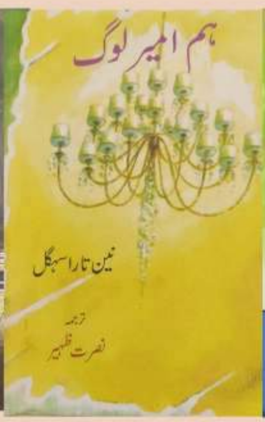

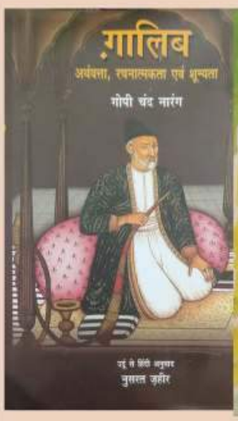

> نصرت ظہیر نے نثر و نظم دونوں صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نصرت ظہیر سہل نگار ادیب تھے، حتی الامکان مقفیٰ اور مسجع جملوں سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کی تحریریں ہر خاص و عام کو بآسانی سمجھ میں آجاتی تھیں۔

ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (1993)، تہاڑ میں میرے شب و روز (2005) (ترجمہ: انگلش سے اردو)، ہم امیر لوگ (2019) (ترجمہ: انگلش سے اردو)، غالب: اَرتھ وتّا، رچنا تمکتا ایوم شونیتا (ترجمہ: اردو سے ہندی)، دریں اثنا (2019) (شعری مجموعہ) وغیرہ شامل ہیں۔

نصرت ظہیر کا شمار مجتبیٰ حسین کے بعد موجودہ عہد کے ان طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن میں دلیپ سنگھ، فیاض احمد فیضی، نریندر لوتھر، شفیقہ فرحت، اسد رضا اور پرویز یداللہ مہدی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ نصرت ظہیر نے نثر و نظم دونوں صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نصرت ظہیر سہل نگار ادیب تھے، حتی الامکان مقفیٰ اور مسجع جملوں سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کی تحریریں ہر خاص و عام کو بآسانی سمجھ میں آجاتی تھیں۔ نصرت ظہیر کی تحریروں میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ مغربی یوپی کی بولیاں اور اصطلاحات بھی ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اس تعلق سے پروفیسر ظفرالدین صاحب نے بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں:

''نصرت ظہیر کے مضامین میں مغربی اتر پردیش کی لفظیات، محاورے، بول چال کے الفاظ، مختلف پیشوں سے جڑی ہوئی اصطاحات، رسوم و رواج، کھانے کی اشیا، برتنوں کے نام، مختلف مواقع پر استعمال ہونے والی اشیا و ساز و سامان کے نام بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ عام قاری کے لیے معلومات میں اضافے کا سبب ہیں تو اس علاقے سے تعلق رکھنے والوں کو یاد ماضی سمیٹنے اور سنوارنے کا سامانہ فراہم کرتے ہیں۔''

(ماہنامہ شگوفہ، نصرت ظہیر نمبر، 26)

نصرت ظہیر نے سماج کو درپیش تقریباً تمام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ ان پسندیدہ موضوع سیاست رہا ہے، جس پر انھوں نے کافی کچھ لکھا۔ ان کے مزید پسندیدہ موضوعات وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، مولوی، منشی، صحافی، حساب، اسکول، کالج، روزہ، شاعر، وغیرہ ہیں۔ انتقال سے چار پانچ سال قبل روزنامہ 'انقلاب' میں 'نمی دانم' کے نام سے ایک کالم شروع کیا جس میں زیادہ تر ان کے موضوعات، سیاست اور جامعات کے اساتذہ ہوتے تھے۔ جامعات کے اساتذہ کو ان کا فرض منصبی یاد دلانے کے ساتھ ان میں پائی جانے والی کوتاہیوں، کمیوں اور خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ کئی جگہ ریسرچ کرنے والے طلبا کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جو اپنا ریسرچ ورک خود نہ کر کے دوسروں سے کراتے ہیں یا ٹیکنالوجی کے مختلف ذرائع سے کٹ پیسٹ پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ اس تعلق سے روزنامہ 'انقلاب' میں ان کا پورا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

نصرت ظہیر کے طنز و مزاح میں مجھے جو خاص بات نظر آئی وہ یہ کہ جس موضوع پر بھی انھوں نے لکھا، اس میں انھوں نے درمیان کا راستہ اختیار کیا یعنی طنز میں اس قدر شدت نہ ہو کہ اس میں اصلاح کا پہلو کم اور برائی زیادہ ہو اور مزاح بھی اس درجے کا نہ ہو کہ اس میں ہنسی کے بجائے پھکڑ پن ظاہر ہو۔ اسی لیے انھوں نے ظرافت کا پہلو اختیار کیا کیونکہ ظریفانہ انداز میں کہی گئی بات قاری کو گدگداتی ہے اور اس کا اثر ذہن و دماغ پر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔

نصرت ظہیر کی کتابوں تحت اللفظ، بقلم خود، ابن بطوطہ کا دوسرا سفر، خراٹوں کا مشاعرہ، نمی دانم میں اسی ظریفانہ پیرائے میں لکھے گئے مضامین ہیں جنھیں پڑھ کر قاری نہ غصہ کرتا ہے، نہ جھنجھلاتا ہے اور نہ ہی کسی جملے پر کھلکھلا کر ہنستا ہے بلکہ وہ اندر ہی اندر خوشی اور تازگی محسوس کرتا ہے جو ایک صحت مند انسان کے لیے ضروری بھی ہے۔ ان کی ایک 'بقلم خود' ہے جس میں 28 مضامین شامل ہیں۔ ویسے تو ہر مضمون پڑھنے کے لائق ہے لیکن مجھے جو مضمون خاص طور پر پسند آیا وہ ہے 'مسئلہ تذکیر و تانیث' اس کے اقتباسات آپ بھی ملاحظہ کریں:

''بچپن میں غلطی سے ایک مرتبہ ہم نے اسکول کی کلاس میں ماسٹر صاحب سے پوچھ لیا کہ جناب طوطا مذکر ہے یا مونث؟ اس کی سزا یہ ملی کہ ماسٹر صاحب نے ہمیں زور سے گھور کر دیکھا اور بنچ پر کھڑا کر دیا۔ جب پیریڈ ختم ہوا تو پاس آئے اور ہمارا کان پکڑ کر بولے...

''اگر طوطا بول رہا ہو تو مذکر ہے اور بول رہی ہو تو مونث! سمجھے؟ اب بیٹھ جاؤ اور گرامر یاد کرو۔''

اس روز ہم تمام دن سوچتے رہے کہ یا اللہ! یہ کیسے پتہ چلے گا کہ طوطا بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔''

(بقلم خود، نومبر 1996، اسکائی پبلی کیشنز، ص 80)

ایک اور اقتباس دیکھیں:

''... ایک دن گھر پر گرامر کا سبق یاد کرتے کرتے ہم گھر میں آئی ہوئی دور کے رشتے کی ایک بزرگ خالہ سے پوچھ بیٹھے:

''خالہ اماں آپ مذکر ہیں یا مونث؟''

یہ سنتے ہی خالہ اماں نے ہماری کمر پر دو ہتڑ جما دیئے اور بولیں:

''ہٹ موئے... دو بالشت کا چھوکرا اور بوڑھی بیوہ سے مذاق کرتا ہے؟ آ تو سہی، ابھی تیری ہڈی پسلی ایک کرتی ہوں۔''

''وہ دن اور آج کا دن ہم نے دوبارہ کبھی کسی سے اس کی جنس معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' (ایضاً، ص 80)

وفات سے ایک سال قبل نصرت ظہیر کا 2019 میں ایک شعری مجموعہ 'دریں اثنا' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ میں نے نصرت ظہیر کو کئی موقعوں پر اشعار گنگناتے تو سنا تھا مگر

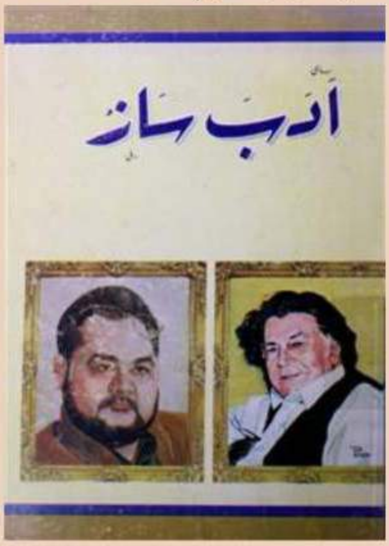

میرے علم میں یہ قطعی نہیں تھا کہ یہ شاعر بھی ہیں۔ کبھی کبھی دوست احباب کی صحبتوں کا اثر بھی انسان پر پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے دوستوں شجاع خاور، فرحت احساس وغیرہ کی رفاقت سے ان کو شاعری کی تحریک ملی ہو۔ اس مجموعے میں انھوں نے اپنے مضامین ہی کی طرح سماج کو درپیش تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اس میں نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی اور کچھ شعرا کی غزلوں کی پیروڈیاں بھی۔

صحافت سے نصرت ظہیر کا بہت پرانا رشتہ رہا، بلکہ انھوں نے صحافت سے ہی اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ وہ یکم جنوری 1981 سے ستمبر 1984 تک روزنامہ 'ملاپ' نئی دہلی میں سب ایڈیٹر رہے، ستمبر 1984 سے جولائی 1986 تک روزنامہ 'تیج' دہلی میں میگزین ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جون 1987 سے مارچ 2008 تک روزنامہ 'قومی آواز' نئی دہلی میں چیف رپورٹر اور اسپیشل کارسپونڈنٹ کے طور پر کام کیا۔ بعد میں یہ راشٹریہ سہارا سے جڑ گئے جہاں ہفت روزہ 'عالمی سہارا' کی ذمے داری

ان کے سپرد تھی۔ اس ہفت روزہ سے ان کی رفاقت بہت مختصر رہی اس کے باوجود انھوں نے 'عالمی سہارا' کو ایک نئی پہچان دلائی اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے میں اپنا پورا تعاون دیا۔ یہاں سے استعفیٰ کے بعد 2010 میں قومی اردو کونسل کے شعبۂ ادارت سے بہ حیثیت اعزازی مدیر وابستہ ہوگئے جہاں ان کی نگرانی میں سہ ماہی 'فکر و تحقیق' (اعزازی مدیر: جولائی -اگست 2010 تا اکتوبر-دسمبر 2011)، ماہنامہ 'اردو دنیا' (جون 2010 تا اگست 2015)، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' (جون 2012 تا اگست 2015) جیسے رسالے شائع ہوتے تھے۔ روز نامہ 'انقلاب' میں ان کا ہفتہ واری کالم 'نمی دانم' بھی بہت مشہور ہوا۔ قارئین ہر ہفتے اس کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ آخری وقت تک یہ کالم انقلاب میں شائع ہوتا رہا۔ ملازمت کے دوران ہی نصرت ظہیر نے 'ادب ساز' کے نام سے ایک ضخیم ادبی رسالہ جاری کیا جو بہت مختصر عرصے میں مقبول ترین رسالہ بن گیا۔ اس کا پہلا شمارہ جون 2006 میں شائع ہوا۔ اس شمارے میں سید محمد اشرف اور حمایت علی شاعر پر دو گوشے تھے۔ ان گوشوں کے علاوہ ساحر لدھیانوی، ستیہ پال آنند، شجاع خاور، منشا یاد، مظہر امام، حامد سراج، واجدہ تبسم، ساجدہ زیدی پر بھی گوشے شائع ہوئے۔ ساحر لدھیانوی (شمارہ 12,13,14 جولائی، 2019 تا مارچ 2010) کا گوشہ اس قدر مشہور ہوا کہ یہ شمارہ حوالہ جاتی بن گیا۔

نصرت ظہیر کی دور درشن، آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستگی رہی۔ دور درشن کے لیے تو انھوں نے ایک مزاحیہ سیریل بھی بنایا تھا۔

نصرت ظہیر مترجم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی مشہور مصنّفین کی کتابوں کے ترجمے کیے۔ بہترین ترجمے کے لیے ساہتیہ اکادمی جیسے موقر ادارے نے ان کو ایوارڈ برائے ترجمہ سے بھی نوازا تھا۔ بہ حیثیت مترجم ان کی پہلی کتاب ہے 'تہاڑ میں میرے شب و روز' جو مشہور صحافی افتخار گیلانی کی کتاب 'My Days in Prison' کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی کتاب پر انھیں 2008 میں ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ برائے ترجمہ سے نوازا تھا۔ ترجمے کی دوسری کتاب 'ہم امیر لوگ' ہے جو 2019 میں منظر عام پر آئی تھی۔ یہ نین تارا سہگل کی 'Rich Like us' کا ترجمہ ہے۔ ان کی آخری ترجمہ کردہ کتاب پروفیسر گوپی چند نارنگ کی 'غالب، معنیٰ آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' ہے جس کا انھوں نے 'غالب ارتھ وتا، رچنا تمکتا ایوم شونیتا' کے نام سے اردو سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

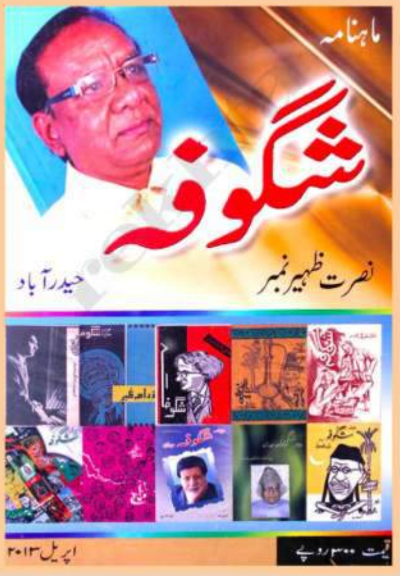

اردو زبان و ادب میں ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے نصرت ظہیر کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے ماہنامہ شگوفہ کا پورا شمارہ ان کے معنون کیا۔ اس شمارے میں اردو زبان و ادب کی موقر شخصیات پروفیسر محمد حسن، موہن چراغی، ڈاکٹر قمر رئیس، شجاع خاور، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پدم شری مجتبیٰ حسین، اسیم کاویانی، فیاض احمد فیضی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اسد رضا، ظفر عدیم، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، سراج نقوی اور فاروق ارگلی کے مضامین ہیں۔ اردو زبان و ادب کے ممتاز ادیب اور ناقد پروفیسر محمد حسن نے نصرت صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف اپنے مضمون 'چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا...' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''... نصرت ظہیر نے رسمی اور روایتی لطیفوں کا سہارا لیا نہ ادبیت کا۔ بڑی ہی واقعاتی یا نیم واقعاتی نیم تاثراتی قسم کے نثر کے میدان میں قدم رکھا اور پھر بھی دلچسپی اور دل بستگی قائم کی اور آنسوؤں کو قہقہوں میں نہ سہی کم سے کم مسکراہٹوں میں سموتے چلے گئے۔ (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے) اور اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے یہ طے نہ کر پائیں کہ کہاں نثر ختم ہوتی ہے اور کہاں مسکراہٹ شروع ہوتی ہے۔''
(ماہنامہ شگوفہ (نصرت ظہیر نمبر)، جلد 46، شمارہ 4، اپریل 2013، ص 30)

مشہور ناقد اور محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ نصرت ظہیر صاحب سے بے حد محبت کرتے اور دل و جان سے انھیں چاہتے تھے۔ ساہتیہ اکادمی سے نصرت صاحب کی برسوں وابستگی رہی ہے۔ نارنگ صاحب نے اپنے مضمون 'نصرت ظہیر آدمی خوب ہے' میں نصرت ظہیر کو ایک جن بتایا ہے اور نصرت ظہیر کی کثیر تعداد میں کالم نگاری کی داد بھی دی ہے:

''نصرت ظہیر آدمی نہیں جن ہیں۔ ان کے دو نہیں شاید چار ہاتھ ہیں۔ دن رات لکھتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں 'نمی دانم' لیکن جانتے یہ خوب ہیں کہ اخبار جو صبح سے شام تک ردّی کے ڈھیر پر چلا جاتا ہے، اس کا قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے۔'' (ایضاً، ص 38)

نئی نسل کے ممتاز ناقد اور نصرت ظہیر کی کالم نگاری کے مداح حقانی القاسمی کا مضمون 'ایک چہرے والا آدمی' ایک ایسا مضمون ہے جو نصرت ظہیر کی شخصیت کے ان گوشوں کو وا کرتا ہے جن کا علم عام قاری کو نہیں ہے۔ حقانی القاسمی نے نصرت ظہیر کو ایک اعلیٰ اور عمدہ کالم نگار اور مزاح نگار قرار دیا ہے اور نصرت ظہیر کی ادبی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان کی تحریریں ذہن کو شاداب اور شگفتہ رکھتی ہیں اور عصری آگہی کے دروازے بھی کھولتی ہیں۔ گول مول اور نمی دانم میری مطالعاتی ترجیحات میں شامل ہیں کہ ان کے یہاں جو پولیٹیکل آئرنی ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے سیاسی طنزیے دوٹوک ہوتے ہیں وہ اشارے کنائے میں طنز نہیں کرتے وہ براہِ راست وار کرتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 64-65)

یہ اقتباسات نصرت ظہیر کی شخصیت فہمی کے لیے ضروری تھے کہ ان سے وہ قاری جو نصرت ظہیر کو نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں، وہ ان کی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت سے واقف ہوسکیں۔ رسائل و جرائد میں گوشے تو سیکڑوں شخصیات پر شائع ہوچکے ہیں، مگر فی زمانہ زیادہ تر شخصیات کے گوشے تعریف و تحسین اور ذاتی مفاد تک ہی محدود رہتے رہیں۔ نصرت ظہیر پر جن شخصیات نے خامہ فرسائی کی مجھے ایسا نہیں لگتا کہ ان میں سے کسی کو بھی نصرت ظہیر سے کسی صلہ و ستائش کی ضرورت رہی ہوگی۔ ستائش ایک اچھے تخلیق کار کی بہر حال ہونی چاہیے، نصرت ظہیر صاحب اس کے حق دار تھے۔ شگوفہ کا خصوصی شمارہ نصرت ظہیر پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔

نصرت نے اردو زبان و ادب کی جتنی خدمات کی ہیں ان کا اعتراف ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں نصرت ظہیر صاحب کی ادبی خدمات سے کماحقہ واقف ہوسکیں۔

■

Mohd Ikram
89/6A, Street No.: 1
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9873818237

زبیر رضوی کی ادبی صحافت

خورشید اکرم

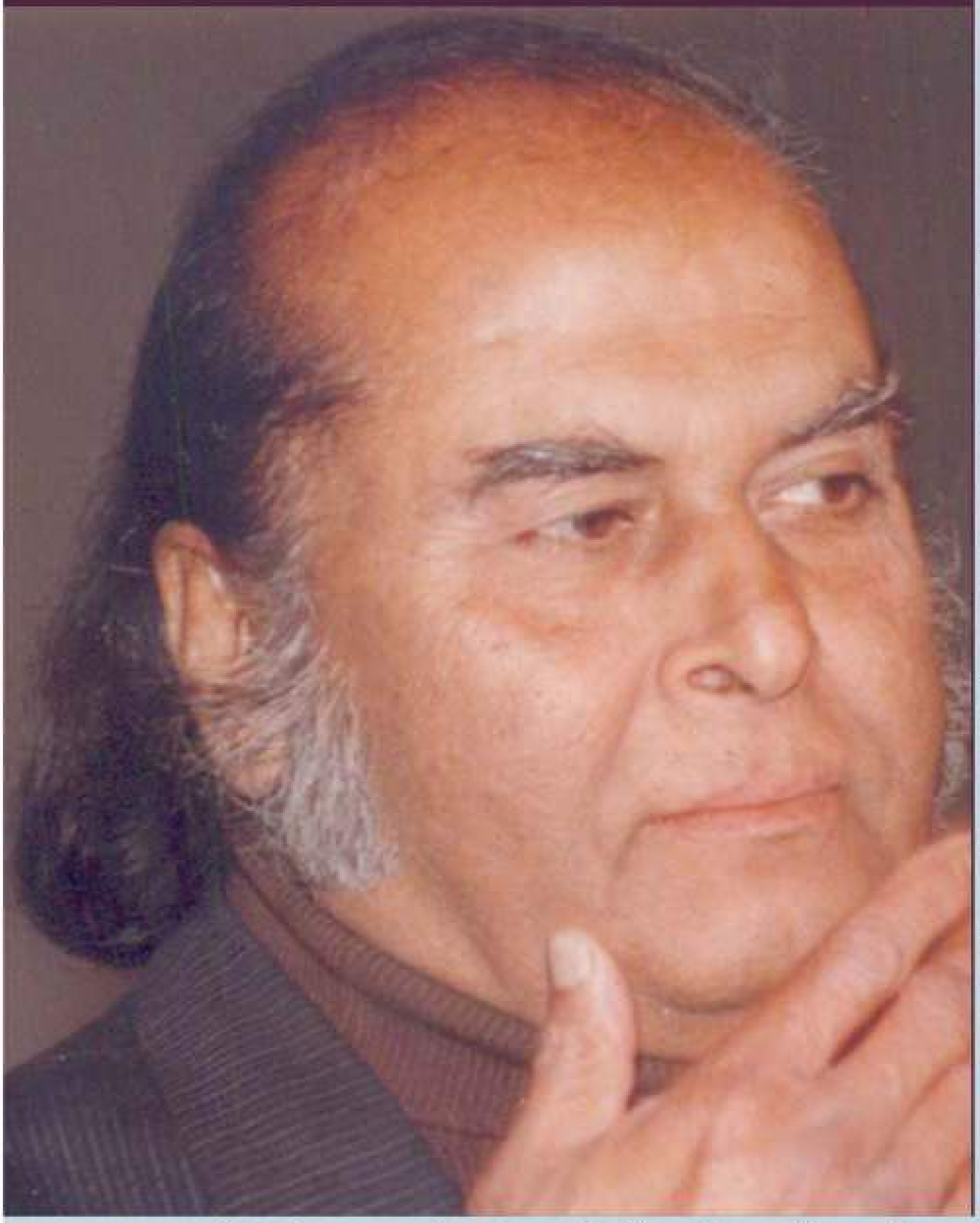

ادبی رسالہ نکالنے کے لیے ایڈیٹر میں تین بنیادی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک: وہ ادب کی تمام اصناف... غزل، نظم، افسانہ، انشائیہ، مزاحیہ، طنزیہ، ناول، تنقید اور تحقیق کا ارفع شعور رکھتا ہو، ان اصناف کی روایت سے واقف ہو اور ہم عصر رجحانات و میلانات سے آگاہ ہو۔ دو: ہم عصر ادب کے مین اسٹریم (مکھیہ دھارا) سے وابستہ دور ونزدیک کے تمام لکھنے والوں (یا کم از کم بیشتر لکھنے والوں) سے واقف ہو اور تین: بے لوث ہو، Self-less ہو۔ یہ تین بنیادی صفات جس میں ہوں گی اس کے ذہن میں یہ صاف ہوگا کہ اسے رسالہ کیوں نکالنا ہے، کیسا نکالنا ہے اور کس طرح نکالنا ہے۔ ان اوصاف کے علاوہ دو ایک اور اضافی خوبیاں بھی درکار ہوتی ہیں۔ مثلاً بہتر ہے کہ مدیر، ہم عصر دنیا کے سیاسی، سماجی، ثقافتی معاملات پر اچھی نظر رکھتا ہو۔ مزید یہ کہ اس کے اردگرد کی زبانوں میں اور عالمی طور پر دیگر زبانوں میں کس طرح کا ادب لکھا جارہا ہے ان سے آگاہ ہو۔ سونے پہ سہاگہ: اگر یہ خوبی اور ہو کہ مدیر قارئین کا اپنا حلقہ پیدا کرنے اور مستقبل کے لکھنے والوں کی شناخت اور ان کی آبیاری کرنے کا بھی وژن رکھتا ہو۔

زبیر رضوی صاحب اور ان کے رسالے ذہن جدید کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ چند باتیں از خود ذہن میں آئیں بلکہ یہ جو درج بالا خصوصیات اور خوبیاں یہاں درج ہوئی ہیں وہ دراصل زبیر رضوی کی مدیرانہ شخصیت کو مجسم ومتشکل کرنے کی کوشش میں ذہن میں نقش ہوتی گئیں۔ یہ تو ہوئی ایک بات کہ کیوں زبیر رضوی اتنے اہم مدیر ثابت ہوئے، ماضی قریب کی ادبی صحافت میں۔ یہ ت بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ پچھلے تیس چالیس رسوں میں ہندوستان ہی میں نہیں پاکستان میں بھی کوئی ور رسالہ (جو اپنی مکمل شکل میں رسالہ ہو) ایسا نہیں نکلا جو س طرح عہد ساز ثابت ہوا ہو۔ اب ذرا یہ دیکھا جائے کہ یہ رسالہ کن زمانی حالات میں نکلا اور کیوں کر اور کس طرح اپنی جگہ مستحکم کرسکا۔ اس کے لیے ہمیں اس عہد کی عمومی ادبی فضا اور اس زمانے میں نکلنے والے دیگر ادبی وعلمی رسائل وجرائد کی سمت ورفتار پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ اسی کی دہائی کے آخری برسوں میں ایک گہرا سناٹا ادبی صحافت میں قائم ہوگیا تھا اور جس میں شاعر اور آجکل کے علاوہ جواز، عصری ادب اور کچھ حد تک الفاظ کو چھوڑ کر کوئی قابل ذکر رسالہ نہیں بچا تھا۔ ایسے میں 'ذہن جدید'

اسی کی دہائی کے آخری برسوں میں ایک گہرا سناٹا ادبی صحافت میں قائم ہوگیا تھا اور جس میں شاعر اور آجکل کے علاوہ جواز، عصری ادب اور کچھ حد تک الفاظ کو چھوڑ کر کوئی قابل ذکر رسالہ نہیں بچا تھا۔ ایسے میں 'ذہن جدید' نے اردو کی ادبی صحافت میں قدم رکھا۔ 1990 میں جب ذہن جدید کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اردو کی ادبی صحافت میں جیسے ایک نئے عہد کا آغاز ہوگیا۔

نے اردو کی ادبی صحافت میں قدم رکھا۔ 1990 میں جب ذہن جدید کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اردو کی ادبی صحافت میں جیسے ایک نئے عہد کا آغاز ہوگیا۔ سبب یہ ہے کہ اب سے پہلے اردو کے کسی مدیر نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ادبی رسالے میں فائن آرٹ یعنی ادب کے علاوہ رقص، سنگیت، پینٹنگ، تھیٹر، فلم، کارٹون سازی وغیرہ پر بھی تحریریں شائع کی جاسکتی ہیں۔ جو اردو قارئین کے دورافتادہ اور کہنا چاہیے کہ خاصے بڑے حلقۂ قارئین کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ زبیر صاحب کا یہ آئیڈیا کلک کر گیا۔ ذہن جدید کے قارئین کا ایک حلقہ اسے روز اول سے مل گیا۔ لیکن رسالے کے مقبول ہونے کا یہی ایک سبب نہ تھا۔ زبیر صاحب نے اس وقت کے سب سے اچھے لکھنے والوں کو یہاں اکٹھا کرلیا تھا۔ ذہن جدید کے پہلے شمارے کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی بہت کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ بحث: اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ترقی پسندی کی معنویت۔ یہ موضوع اس وقت چرچا میں تھا ہی پھر اس میں بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، دیویندر اسر، وحید اختر جیسے بڑے ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ اس سے پہلے گورباچیف کا مضمون 'امتحاں اور بھی ہیں'...... افسانے: بانو قدسیہ، انور عظیم، سریندر پرکاش، جیلانی بانو، عوض سعید، عبداللہ حسین کے۔ شاعری: بلراج کومل، محمد علوی، مخمور سعیدی، وحید اختر، زبیر رضوی کی نظمیں۔ دلیپ سنگھ کا مزاحیہ۔ گوشۂ ممتاز مفتی۔ اس میں اشفاق احمد کا مضمون زبیر رضوی اور مسعود اشعر کے ذریعے ممتاز مفتی سے لیا گیا انٹرویو اور ایک افسانہ۔ 'ٹیگور اور وکٹوریہ' مضمون۔ قصہ گو فیض، فیض کی روداد حیات خود ان کی زبانی۔ ادب انتفاضہ (فلسطینی ادب) مضمون، کہانیاں، نظمیں، ہندوستانی ادب، کنڑ، ہندی، پنجابی اور انگریزی ادب سے منتخب تحریریں۔ لتا منگیشکر سے انٹرویو۔ گریٹا گاربو، سری لیکھا، انورادھا پوڈوال پر مختصر تحریریں۔ تھیٹر پر دو مضامین۔ کینوس کے زیر عنوان رنگوں میں احتجاج منوپارکھ، آرٹ کی قومی نمائش، کینوس پر کلچر، کتابوں کی باتیں اور آخر میں قرۃ العین حیدر کا انٹرویو: اردو میں فکشن کی تنقید کا فقدان ہے۔ اب اس فہرست پر ایک نظر دوبارہ ڈالیے۔ عموماً ادبی رسالے کا سب سے بڑا حصہ شعری حصے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں دوسو صفحات میں صرف بارہ صفحہ شاعری کے حصے میں وہ بھی صرف نظمیں۔ موضوعات کا تنوع دیکھیے۔ اول اپنے عہد کے سب سے سنجیدہ موضوع پر مباحثہ، پھر بہترین افسانہ نگاروں کے افسانے، ایک سینئر ادیب پر گوشہ، فلسطینی ادب، ہندوستانی ادب، فلم، تھیٹر، پینٹنگ، انٹرویو، کتابوں پر تبصرے۔ کتابی سائز کے دوسو صفحے کے ایک رسالے میں اتنی تحریریں اور اتنی متنوع تحریریں، غور کیجیے، کیا آپ نے اس سے پہلے کسی رسالے میں دیکھی تھیں۔ پھر ہر حصے میں زبیر رضوی اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کے ساتھ موجود۔ تقریباً چوتھائی صفحات خود ان کے اپنے لکھے ہوئے یا ترجمہ کیے ہوئے۔ ذہن جدید کے بہتر شمارے نکلے۔ کوئی بھی شمارہ اٹھا کر دیکھ لیجیے: کم از کم پچاس ساٹھ صفحے زبیر صاحب کے لکھے ہوئے ملیں گے۔

ادبی سطح پر ذہن جدید نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہمارے کئی بڑے قلم کار جو خاموش ہوگئے تھے وہ سرگرم ہوگئے کچھ اس لیے کہ ایڈیٹر زبیر رضوی اسی ادبی قبیلے کے فرد تھے اور کچھ اس لیے کہ یہ رسالہ ایک نئے رنگ ڈھنگ، نئے مزاج و انداز کے ساتھ سامنے آیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، سریندر پرکاش، محمد علوی، بانو قدسیہ، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، انتظار حسین، بلراج کومل، فضیل جعفری، انور عظیم، اقبال مجید، رتن سنگھ...... لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ایک گہما گہمی پیدا ہوئی۔ میں نے رسائل وجرائد کے جائزے پر مبنی ایک مضمون میں ذہن جدید کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

'ذہن جدید' کا اجرا اس معنی میں 90 کی دہائی کا ایک ادبی واقعہ ہے کہ اس نے اپنے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کیا۔ پرانے لکھنے والوں کو انسپائر کیا، نئے لکھنے والوں کو دریافت کیا اور ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی۔ یہ سب کچھ اس نے متانت اور اعتدال کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا، کوئی Radicalism اختیار کیے بغیر کیا۔ دو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ایک سہ ماہی رسالہ جو اپنے وقت سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ تاخیر سے شائع ہوتا رہا، مقبولیت کی اس بلندی کو پہنچا کہ قارئین کو اس کا انتظار رہتا اور شائع ہونے کے چند دنوں کے اندر ہی ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو بن جاتا۔

زبیر صاحب آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہاں سے جو تجربے اپنے ساتھ لائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اپنے وقت اور عہد کو زیادہ سے زیادہ انگیز کرنے کی کوشش کرو کیونکہ جو آج کا وقت ہے وہی کل کو تاریخ ہوجائے گا۔ اکیسویں صدی کی آمد کا غلغلہ تھا جب ذہن جدید نے اب تک کی اردو ادبی صحافت کا سب سے بڑا دھماکہ کیا۔ انھوں نے بیسویں صدی کے ادب کا ایک جائزہ پیش کیا۔ دس بہترین کہانیاں، دس بہترین ناول، دس بہترین شاعر، دس اہم تنقیدی کتابیں، فکشن کے پانچ بہترین نقاد...... وغیرہ وغیرہ اور اس ادبی سروے کے لیے انھوں نے اپنے عہد کے تیس چالیس بڑے ادبی ناموں کو منتخب کیا، ان سے رائیں مانگیں، ان رایوں کو یکجا کیا اور ان سے جو ٹھوس نتیجے برآمد ہوئے انھیں 'اپنی نوعیت کا پہلا ادب پیما' کے عنوان کے تحت ایک شمارے میں شائع کردیا۔ ایک ہلچل مچ گئی۔ ہندوستان سے پاکستان تک۔ کوئی اتفاق کررہا ہے، کوئی اختلاف۔ کوئی اپنا جائزہ پیش کررہا ہے، کسی کو کسی نام پر اعتراض، کسی کو کسی پر، کسی کو اس بات پر کہ سیمپل سائز بہت چھوٹا تھا۔ زبیر رضوی کا ایک مختصر سا جواب: چالیس کے بجائے سو لوگوں سے بھی رائے لی جاتی تب بھی نتیجے میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ نہ کوئی جائزہ کبھی مکمل ہوتا ہے، نہ کسی جائزے سے سب کو اتفاق ہوتا ہے۔ لیکن ذہن جدید کو ایک بہت بڑا کام اس طرح کرنا تھا، اس نے کردیا۔ آج بھی کسی سے پوچھیے کہ اردو کی سب سے بڑی کہانی کون سی ہے وہ اعتماد سے کہے گا 'کفن'۔ سند: ذہن جدید شمارہ 29۔ ذہن جدید کو زبیر صاحب نے کم از کم بیس برس تک نہایت سرگرمی کے ساتھ نئی تبدیلیوں کے ساتھ، نئے حالات وحوادث سے خود کو ہم آہنگ رکھ کر اور اپنے افکار ونظریات کے اعلان کے ساتھ نکالا، بلا خوف وخطر۔ پہلے ہی شمارے میں سریندر پرکاش کی دو کہانیاں اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیں۔ پہلا ہی جملہ: اردو کہانی کو سعادت حسن منٹو کے بعد جس شاطر افسانہ نگار کی ضرورت تھی وہ سریندر پرکاش کی شکل میں میسر آگیا ہے۔ بس یہ جملہ ادبی فضا میں گونج گیا۔ ادھر وارث علوی کا ایک مضمون چھپتا ہے۔ بڑے بڑے بتوں کے لباس فاخرہ دھجیاں بن کر اڑنے لگتے ہیں۔ سریندر پرکاش، وارث علوی کی طرف

ذھن جدید ان کے لیے صرف ایک رسالہ نہیں تھا وہ ان کا Passion بن گیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے قارئین میں ایک بیداری پیدا کرنے کی کوشش آخری وقت تک کرتے رہے- رسالے کے ڈھیروں صفحات وہ خود لکھتے تھے- رسالے کا پروف پڑھنے، اس کے لیے اشتہارات لانے، ادیبوں سے رابطہ کرنے، چھپوانے، پیکٹ بنانے، پتے لکھنے سے لے کر ڈاک خانے تک لے جانے اور پوسٹ کرنے تک کا سارا کام وہ خود ھی کرتے تھے- اتنا سارا کام کسی دیوانگی کے بغیر پیشن کے بغیر ممکن نہیں-

کمان کھینچ کر ایک افسانہ مارتے ہیں۔ جوابی حملہ وارث کا۔ کرلو فیصلہ کون سیر کون سوا سیر۔ شموئیل احمد سنگار دان لکھ کر لائے ہیں۔ ذہن جدید میں کہانی چھپی۔ ایک آن میں مشہور ہوگئی، چرچے میں آ گئی۔ 70 کی دہائی میں ابھر کر گمنام ہوجانے والا افسانہ نگار شموئیل احمد سنگاردان کی اشاعت کے بعد راتوں رات اسٹار ہوگیا۔ اردو کہانی کی تاریخ سے سنگاردان کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ذہن جدید نہ ہوتا کوئی اور رسالہ ہوتا تو کیا یہ کہانی اس طرح آن کی آن میں مشہور ہوجاتی۔ شاید نہیں۔ اس پایے کی اور کئی کہانیاں اس کے آگے پیچھے کئی اور رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ یہ شہرت اور مقبولیت کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ یہ کہہ کر میں اس کہانی کا قد چھوٹا نہیں کر رہا، صرف اس Weightage کو نشان زد کر رہا ہوں جو ذہن جدید میں اس کی اشاعت کے باعث اسے ملا۔ 96-1995 میں انھوں نے یکے بعد دیگرے جدید نظم پر دو شمارے نکالے (شمارہ 19 اور 20) پہلا شمارہ اختر الایمان کے بعد سے 1980 تک کی نظمیہ شاعری کا انتخاب جو انھوں نے خود کیا۔ دوسرا شمارہ نظم کی تاریخ، جدید نظم کے میلانات و امتیازات پر مبنی منتخب مضامین پر مشتمل ہے۔نئی نظم کا سفر (کتاب نما 1974 مرتب خلیل الرحمٰن اعظمی) کے بعد اردو نظم کا کوئی اور جامع انتخاب نہیں چھپا تھا یا کم از کم کل ہند سطح پر قابل ذکر نہیں سمجھا گیا تھا۔ پھر دو تین سال بعد ایک شمارہ 80 کے بعد کی نظموں کے انتخاب پر مشتمل۔ تینوں شمارے ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بعد میں انھوں نے ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس طرح کہ یہ ایک دستاویزی نوعیت کی کتاب بن گئی۔

زبیر رضوی خود شاعر تھے لیکن میرا خیال ہے کہ ذہن جدید کے پچیس چھبیس برسوں کے سفر میں تخلیقی ادب میں ان کی دلچسپی شاعری کے مقابلے افسانے کی طرف زیادہ رہی۔ افسانے پر جتنی توجہ 'ذہن جدید' نے کی کسی اور رسالے کو اتنی کامیابی نہیں مل سکی۔ کئی افسانہ نگاروں نے 'ذہن جدید' کے صفحات پر گویا اپنے آپ کو دوبارہ دریافت کیا۔ کئی افسانہ نگاروں کو شناخت اسی پرچے سے ملی۔ میرا اندازہ ہے کہ ان برسوں میں جو قابل ذکر افسانے اردو میں چھپے ان میں ذہن جدید اور شب خون کا حصہ دیگر اعلیٰ درجہ رسائل مثلاً نیا ورق، سوغات، شاعر، آجکل کے مقابلے زیادہ ہوگا۔ زبیر صاحب نے اردو کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ ہندی، بنگلہ، اڑیہ، مراٹھی وغیرہ ہندوستانی زبانوں کا ادب تواتر سے چھاپا۔ ہندی کے مشہور افسانہ نگار ادے پرکاش کو اردو میں آجکل نے ہندی کہانی نمبر (جنوری 1988) سے متعارف کرایا تھا مگر زبیر رضوی نے یکے بعد دیگرے ان کی کئی کہانیاں چھاپیں اس طرح کہ وہ اردو والوں میں ایک مقبول نام بن گئے۔ اصغر وجاہت کا ڈرامہ 'جسی لاہور نئیں دیکھیا' چھاپتے ہیں اور وہ اردو والوں میں بھی جانا پہچانا نام بن جاتے ہیں۔ فسادات کی کہانیاں، خواتین کی کہانیاں، طوائفوں کی زندگی پر مبنی کہانیاں، جیسے کئی یادگار شمارے شائع کیے جو اب ہماری ادبی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ غیر ملکی ادب سے مارکیز، سلویا پلاتھ، سارا ماگو، ارحان پامک، نجیب محفوظ، نازک الملائکہ، قرۃ العین طاہرہ، فروغ فرخ زاد، ڈورلیس لیسنگ، ٹونی موریسن گنتر گراس وغیرہ کی ڈھیروں کہانیاں نظمیں، مضامین چھاپے۔

اردو میں ادبی رسالے بالعموم عصری حوالوں سے خالی ہوتے ہیں۔ لیکن ذہن جدید نے اپنے پہلے ہی شمارے سے ادب اور ادیب کو متاثر کرنے والے ہمعصر سیاسی، سماجی اور ثقافتی معاملات کو جگہ دینے کی جو روش اپنائی تھی اسے تادیر اختیار کیے رکھا۔ ذہن جدید کے اوراق پر انگریزی اخبارات سے منتخب سیاسی کارٹونوں کی اشاعت کا سلسلہ ان کی اسی ذہنی سرگرمی کا حصہ ہے۔

1980 کے بعد سے 2015 کی ربع صدی میں ہندوستان، اردو دنیا اور سارا عالم جن بڑے واقعات وحادثات سے گزرا ان سب پر اپنے ادیبوں اور فنکاروں اور دانشوروں کے ردعمل دیکھنے ہوں تو آپ ذہن جدید کی فائلیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ لگاتار پچیس برس تک زبیر رضوی نے پوری تندہی اور سرگرمی سے اپنے عہد کے آشوب کو اردو قارئین تک پہنچانے کا کام کیا اور کچھ اس طرح کہ کوئی اور وہ کام اس طرح تن تنہا نہیں کرسکتا تھا۔

رسالے میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں ان کا ایک بڑا حصہ وقت کے ساتھ فرسودہ ہوجاتا ہے۔ یہ ذہن جدید کے ساتھ کم کم ہوا۔ یہ بات کچھ اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کیوں کہ میں نے ابھی ذہن جدید کے تقریباً پچاس شماروں کو دوبارہ الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔ زبیر صاحب نے تمام وقتی اور ہنگامی موضوعات کو رسالے کے صفحات پر جگہ دینے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ان کی کوشش ایسی تحریروں کی اشاعت پر رہی جو بعد میں بھی پڑھی جاسکیں اور ایک دائمی قدر کی حیثیت رکھتی ہوں۔ مثلاً ذہن جدید میں شائع چھوٹے بڑے مضامین کو یکجا کر کے انھوں نے تقریباً ایک درجن کتابیں تیار کیں جن میں سے چند یہ ہیں: (1) ہندوستانی سنیما: سو برسوں کا سفر (2) اردو فنون اور ادب (3) غالب اور فنون لطیفہ (4) کالی رات (فسادات کے افسانے) (5) عصری عالمی ادب کے ستون۔ احوال وافکار (6) ادب، تھیٹر، مصوری، رقص، کارٹون اور فوٹو گرافی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کے انٹرویوز کا مجموعہ وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ تلاش وتحقیق کی جائے تو موسیقی، رقص، کارٹون سازی، فلم سازی وغیرہ پر کئی مبسوط کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔

رسالے کا جو خاکہ انھوں نے پہلے شمارے سے بنایا تھا اس میں وہ مسلسل تبدیلیاں کرتے رہے مگر اس طرح کہ اس کا کیریکٹر نہ بدلے۔ اس نے اپنی جو پہچان بنائی ہے وہ قائم رہے اور اس کے قارئین کی دلچسپی بنی رہے۔ ذہن جدید نے ایک طرف سینئر لکھنے والوں کو متوجہ کیا تو بہت سے نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ یہ ایک نیا رول ماڈل بن گیا جس میں اعلیٰ ادب، فلم، فن، تھیٹر، بین الاقوامی سطح پر ہونے والی فکری اور ادبی تبدیلیوں کی جھلکیاں مل جاتی تھیں۔

ذہن جدید ان کے لیے صرف ایک رسالہ نہیں تھا وہ ان کا Passion بن گیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے قارئین میں ایک بیداری پیدا کرنے کی کوشش آخری وقت تک کرتے رہے۔ رسالے کے ڈھیروں صفحات وہ خود لکھتے تھے۔ رسالے کا پروف پڑھنے، اس کے لیے اشتہارات لانے، ادیبوں سے رابطہ کرنے، چھپوانے، پیکٹ بنانے، پتے لکھنے سے لے کر ڈاک خانے تک لے جانے اور پوسٹ کرنے تک کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ اتنا سارا کام کسی دیوانگی کے بغیر پیشن کے بغیر ممکن نہیں۔

■

Khursheed Akram
52 B, Sukhdev Vihar DDA Flats
New Delhi 110025
Mob: 8010470440
Email: akramkhurshid1@gmail.com

محمد حنیف خان

اردو صحافت میں زبان کا استعمال

اردو صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی سلاست اور روانی ہوتی ہے.یہ سادہ اور سلیس ہوتی ہے تاکہ عام قاری کو بھی سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہ آئے.اسے لغات کا سہارا نہ لینا پڑے،کیونکہ ترسیل و ابلاغ کا بنیادی وسیلہ زبان ہے اور صحافت ہر قاری کی ضرورت ہے.اس لیے صحافت میں ایک ایسی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے جس کی سطح اتنی بلند نہ ہو کہ عام قاری کی فہم سے بالاتر ہو اور اتنی غیر معیاری بھی نہ ہو کہ اعلی مذاق کے قارئین زبان کے لطف سے ہی محروم ہوجائیں.

کسی بھی زبان کے اخبار اپنے مواد کے لحاظ سے متعلقہ معاشرے کے ذہنی تفوق یا اس کے تنزل کی علامت ہوتے ہیں جبکہ اس میں مستعمل زبان اس بین السطور کو واضح کرتی ہے جس سے وہ سماج تشکیل پایا ہے۔ زبان کی لفظیات کے پس پشت ایک تہذیب اور ثقافت کی دنیا آباد ہوتی ہے جو غیر بدیہی ہوتی ہے، یہ الفاظ اور ان کے محل استعمال سے پیدا ہونے والے معانی طے کرتے ہیں کہ معاشرے کا فکری نہج کیا ہے۔ اخبارات میں زبان کے مطالعے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ الفاظ کیا ہیں ؟ کوئی لفظ بامعنی کب اور کیونکر ہوتا ہے؟ الفاظ دراصل اشیا کی علامت ہیں، اسی لیے ایک ہی شے کے لیے مختلف زبانوں میں اس کے لیے الگ الگ الفاظ ہوتے ہیں کیونکہ معاشرہ ان اشیا کی شناخت اپنے اعتبار سے کرتا ہے اور ان کے لیے حروف کے کسی مجموعے کا تعین کرتا ہے، اسی لیے اپنے آپ میں حروف کے مجموعہ لفظ کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے، اسے معاشرہ اور اس کا فہم بامعنی بناتا ہے۔ مثلاً گلاس جس کی انگریزی اور اردو دونوں میں ایک صوتی حیثیت ہے اس کے باوجود دونوں زبانوں میں اس صوتی مجموعے/لفظ سے الگ الگ اشیا مراد لی جاتی ہیں۔ یہ معنوی تنافر معاشرہ اور اس کی فہم کی بنا پر ہوا ہے۔ ہر دو معاشرے میں یہی صوت ہمارے ذہن پر الگ الگ عکس اور شبیہ ابھارتی ہے۔ لفظیات کو بطور وسیلہ استعمال کرکے فرد یا معاشرہ کسی خیال، احساس یا منظر کی ترسیل کرتا ہے۔ اس طرح الفاظ ہمارے تجربات کا علامتی اظہار بن جاتے ہیں۔ جب ہم کوئی لفظ بولتے ہیں، سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو یہ تینوں کسی نہ کسی کیفیت کا اثر ہمارے ذہن پر مرتب کرتے ہیں۔ معاشرہ اس طرح لفظوں کو معنی سے لبریز کرتا ہے۔

ہر شعبے کے افراد کے اظہار کی زبان / لفظیات مختلف ہوتی ہے، یہ کلیہ اردو صحافت پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جس طرح ہر تحریر اپنے اسلوب اور خصوصیات کی بنیاد پر پہچانی جاتی ہے، اسی طرح اردو صحافت کی زبان بھی اپنے اسلوب اور طرز تحریر کی بنا پر پہچانی جاتی ہے کیونکہ اس کے اپنے ہدفی قارئین ہوتے ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی سلاست اور روانی ہوتی ہے، یہ سادہ اور سلیس ہوتی ہے تاکہ عام قاری کو بھی سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہ آئے۔ اسے لغات کا سہارا نہ لینا پڑے، کیونکہ ترسیل و ابلاغ کا بنیادی وسیلہ زبان ہے اور صحافت ہر قاری کی ضرورت ہے۔ اس لیے صحافت میں ایک ایسی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے جس کی سطح اتنی بلند نہ ہو کہ عام قاری کی فہم سے بالاتر ہو اور اتنی غیر معیاری بھی نہ ہو کہ اعلی مذاق کے قارئین زبان کے لطف سے ہی محروم ہو جائیں۔

اخبارات کا جائزہ اگر زبان کے حوالے سے لیا جائے تو ہمیں اس کے تین پہلو نظر آتے ہیں علمی، ادبی اور عام بول چال کی زبان۔ آخری الذکر کا تعلق خبروں سے ہے جبکہ علمی اور ادبی زبان کا تعلق اداریہ اور ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے علمی و ادبی مضامین سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مضامین اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان پر خاص توجہ دی جاتی ہے کہ سطح مرتفع سے

نیچے کی زبان کا استعمال کیا جائے، اصطلاحات اور ثقیل لفظیات سے اجتناب کیا جائے تا کہ عام قاری کو تفہیم میں دشواری پیش نہ آئے اور وہ اخبارات کی خبروں کے ساتھ ہی اس کے علمی وادبی مضامین سے بھی استفادہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ سانپ کی کینچلی کی طرح لفظیات بھی وقت کے ساتھ اپنے معنی کھوتی ہیں جو دھیرے دھیرے کلیشے کے زمرے میں داخل ہوجاتی ہیں اور پھر متروک ہو کر اپنا وجود کھو دیتی ہیں لیکن بعض لفظیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ خود کو نئے معنی سے وابستہ کر لیتی ہیں۔ مثلا ایک لفظ '' خلافت'' ہے، فرہنگ عامرہ کے مطابق یہ اپنے اصل معنی میں جانشینی، قائم مقامی اور پرانے پن کو بیان کرتا ہے۔

(محمد عبداللہ خویشگی، فرہنگ عامرہ، یونین پرنٹنگ پریس 1953، ص 205)

یہی لفظ جب اسلامی اصطلاح کے تناظر میں استعمال ہوتا ہے تو یہ خلفاء راشدین /اسلامی دور کے بادشاہوں کے دور کو بیان کرتا ہے۔

(تصدق حسین: لغات کشوری، مطبع نامی منشی نول کشور 1952 صفحہ 173)

یہی لفظ اپنے اشتقاق کے ساتھ جب معاشرے اور عام بول چال میں 'خلیفہ' کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو یہ 'نائی' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لفظ جب اردو کو چھوڑ کر عمومی صحافت میں آیا تو مخالفت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس طرح یہ لفظ اپنے اصل معنی سے بہت دور ہو گیا۔ جب کوئی لفظ مرتا ہے تو اس کے ساتھ پوری تہذیب مرجاتی ہے بعینہٖ جب کوئی لفظ ابھرتا ہے تو ایک نئی تہذیب سانسیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ہم جب اردو صحافت کی زبان کی دو سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں اتار چڑھاؤ صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ دہلی اردو اخبار کو پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کی زبان آج کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ دیکھیے '' سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب اور کثرت مرداں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا بہت مدت کا نوکر ہے، جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔''

(مولوی باقر دہلوی، دہلی اخبار، 15 اگست 1841)

برطانوی دور میں لاہور سے نکلنے والے پہلے اردو اخبار 'کوہ نور' کی زبان دیکھیے جو اشتہار کی شکل میں ہے '' روپیہ پیشگی کا ہمراہ درخواست خواہ تاریخ اجرا سے اندر ایک مہینے کے عنایت فرمانا چاہیے ورنہ شرح ماہوار شمار کی جائی ہے اور اگر چہ مہینے تک شرح ماہواری سے بھی روپیہ قیمت اخبار کا عنایت نہیں ہوتا تو بعد اوسکی شرح مابعد تتمہ سالیانہ محسوب ہوتی ہے۔ '' (اخبار 'کوہ نور' 16 جنوری 1855)

امرتسر سے نکلنے والے اخبار 'وکیل' کی ایک رپورٹ دیکھیے جو محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی تیاریوں کے حوالے سے ہے:

'' سترہواں اجلاس کانفرنس کا جو بمقام بمبئی ہوگا، اس کے انتظام کے لیے جو کمیٹی بمبئی میں قائم ہوئی ہے اوسکے سکریٹری جناب قاضی کبیر الدین صاحب بیرسٹر نہایت سرگرمی اور جوش سے اپنا کام کر رہے ہیں اور ہم اس بات کو دیکھنے سے خوش ہیں کہ وہ کانفرنس کو مفید بنانے اور حقیقت اس سے عملی نتائج پیدا کرنے اور تمام ہندستان کے مسلمانوں کو اس سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں۔'' (وکیل: امرتسر 23 اکتوبر 1903)

جنگ عظیم کے دوران فرانس کے متعلق رپورٹ شائع کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: '' یورپ میں جب فرانس کی ہزیمت کی خبریں شائع ہوئیں تو ڈیوک ولیڈگن تک کو الجزائری کی عظمت اقرار کرنا پڑا۔ آٹھ نو سال کے اندر تقریباً اس نے کل جزائر پر قبضہ کر لیا تھا۔ تمام ساحلی اور اندرونی قلعے فرانسیسی فوج کی لعنت سے پاک ہو گئے تھے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال 13 جولائی تا 25 دسمبر 1912)

لاہور سے نکلنے والے اخبار 'بندے ماترم' کی زبان دیکھیے، اخبار کی شہ سرخی ہے۔'' سردار بھگت سنگھ مسٹر راجگورو اور مسٹر سکھ دیو کی نعشوں کی بے حرمتی کی تحقیقات'' ذیلی سرخی یوں ہے '' انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے کمیشن نے اپنا کام شروع کر دیا۔ گورنمنٹ نے تحقیقات میں امداد دینے سے انکار کر دیا۔''

(بندے ماترم، 14 اپریل 1931)

یہ آزادی سے قبل کے اخبار ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت 415 اردو اخبارات، ہفتہ وار اور ماہنامے ہندستان سے شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے 345 ہندستان میں رہ گئے۔ ستر اخبارات کے مالکین پاکستان ہجرت کر گئے۔ آزادی کے بعد جو اخبار منظر عام پر آئے ان میں دعوت نئی دہلی، نئی دنیا، سیاست، منصف، اعتماد، آزاد ہند، ہند سماچار، اخبار مشرق، آبشار، انقلاب، عکاس، اردو ٹائمز، انقلاب، سالار، قومی آواز اور رہنمائے دکن وغیرہ ہیں۔

اس فہرست سے قبل مندرجہ اخبارات کی زبان اور آج کے اخبارات کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ فرق اسلوب کے ساتھ ہی لفظیات کی سطح پر بھی ہے، اگر چہ دولت انگلشیہ کی وجہ سے آزادی سے قبل ہی انگریزی لفظیات کا استعمال شروع ہوگیا تھا لیکن یہ استعمال اصطلاحات کی سطح تک تھا حالانکہ آج ان لفظیات کا ایسا بے محابا استعمال شروع ہوگیا ہے جس سے زبان اور اسلوب دونوں میں تنزلی آئی ہے۔

ہم جب اردو صحافت کی زبان کی دو سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ھیں تو اس میں اتار چڑھاؤ صاف طور پر نظر آتے ھیں۔ دھلی اردو اخبار کو پھلا اخبار ھونے کا شرف حاصل ھے، اس کی زبان آج کی زبان سے بالکل مختلف ھے۔ دیکھیے '' سنا گیا ھے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ھاشم علی خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ھوئے تھے۔ کھتے ھیں کہ بڑا قمار ھوتا تھا لیکن بہ سبب رعب اور کثرت مرداں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نھیں ھوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ھوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بھت جری سنا جاتا ھے مقرر ھوا ھے یہ پھلے جمعدار تھا بھت مدت کا نوکر ھے، جمعداری میں بھی یہ بھت گرفتاری مجرموں کی کرتا رھا ھے۔

وقت کے ساتھ زبان کا بھی سفر جاری رہا اور اس میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ دہلی اخبار سے لے کر بندے ماترم تک پہنچتے پہنچتے جن لفظیات کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے وہ لسانیات کے طالب علم کے لیے باعث استعجاب ہے۔ جہاں مولوی باقر کی زبان خالص اردو ہے جس میں اضافت کا خصوصی استعمال دیکھنے کو ملتا ہے وہیں بندے ماترم میں انگریزی لفظیات کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معاشرے میں انگریزوں اور انگریزی کے ساتھ

ہی اس کی تہذیب و ثقافت کے سرایت کرنے کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردوصحافت کی معیاری زبان میں تنزلی کا سبب دخیل الفاظ کا استعمال بھی ہے۔غیر زبان کے الفاظ کا استعمال معیوب نہیں ہے،اس سے زبان ثروت مند بنتی ہے لیکن اس میں توازن از حد ضروری ہے جبکہ اردو صحافت میں یہ توازن برقرار نہیں رہ سکا۔غیر زبان کی لفظیات کے استعمال کا اصول یہ ہے کہ غیر ضروری یا بلا ضرورت ان کا استعمال نہ کیا جائے،لیکن جہاں متبادل لفظیات نہ ہوں یا اس زبان میں کسی خاص مفہوم کے بیان کے لیے بہت زیادہ الفاظ درکار ہوں تو ایسی صورت میں اس کے استعمال میں قباحت نہیں ہے،اس سے زبان کو ایک نیا لفظ بھی ملے گا اور وہ ثروت مند بھی بنے گی لیکن اگر متبادل ہونے کے باوجود غیر زبان کی لفظیات کا بے محابہ استعمال کیا جائے گا تو اپنی زبان ملغوبہ بن جائے گی۔

اردوصحافت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر ضروری طور پر انگریزی، ہندی اور عام لفظیات کا استعمال کیا جا رہا ہے،حالانکہ ان لفظیات کے رائج متبادل بھی موجود ہیں جن کا استعمال زبان کو مزید خوبصورت بنا سکتا ہے۔ادھر چند برسوں میں اردو صحافت میں جب سے وہ ہندی خبروں کی مرہون منت ہوئی ہے عوامی زبان کے غیر معیاری الفاظ کا استعمال بڑھ گیا ہے۔اردوصحافت میں مستعمل انگریزی کی لفظیات اور ان کے متبادل دیکھیے۔

ایڈوانس، (پیشگی) کورٹ (عدالت) مسٹر (جناب) سکیورٹی (تحفظ) ووٹرز (رائے دہندگان) انفراسٹرکچر (بنیادی ڈھانچہ) چیئرمین، چیئرپرسن (صدر، سربراہ) ایئر پورٹ (ہوائی اڈہ) اسپیشل (خصوصی) ریسکیو کرنا (بحفاظت بچایا جانا) لینڈ کرانا (زمین پر اتارنا) کنٹرول کرنا (قابو میں کرنا) بائک (موٹر سائیکل) اپوزیشن (حزب مخالف) میمورنڈم (عرضداشت) ڈپریشن (ذہنی تناؤ) ڈیفنس (دفاع) ٹیچرس (اساتذہ) ہاکر (اخبار فروش) وغیرہ۔

عوامی زبان کی مثالیں' سیندھ ماری (نقب زنی) خلاصہ (انکشاف) ذات پات (ذات برادری) پریوار (کنبہ، اہل وعیال) سرکار (حکومت) لگاتار (مسلسل) نقدی (نقد روپے) منمانی (مرضی) وغیرہ۔

بعض تراکیب میں ایک اردو اور ایک انگریزی لفظ کے استعمال کا چلن عام ہو رہا ہے مثلاً محکمہ صحت کی جگہ محکمہ ہیلتھ، محکمہ تعلیم کی جگہ محکمہ ایجوکیشن وغیرہ جیسی کثیر تعداد میں تراکیب ہیں جو اردو صحافت میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اردو صحافت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر ضروری طور پر انگریزی،ھندی اور عام لفظیات کا استعمال کیا جا رھا ھے،حالانکہ ان لفظیات کے رائج متبادل بھی موجود ھیں جن کا استعمال زبان کو مزید خوبصورت بنا سکتا ھے۔ادھر چند برسوں میں اردو صحافت میں جب سے وہ ھندی خبروں کی مرھون منت ھوئی ھے عوامی زبان کے غیر معیاری الفاظ کا استعمال بڑھ گیا ھے۔

خبروں میں استعمال ہونے والی زبان کی سطح دیکھیے۔ یہ خبر ہندستان کے ایک قومی اخبار کی ہے جو بنگال سے لے کر ممبئی اور لکھنؤ سے لے کر دکن تک میں شائع ہوتی ہے۔''ایک شخص نے رشتے میں پوتے تین سال کے معصوم کو ندی میں ڈوبا کر قتل کردیا ہے۔دادا نے بھتیجے سے کچھ روپے کی ڈیمانڈ کی تھی۔جسے دینے سے اس نے انکار کردیا تھا۔اس کے بعد وہ انش کو گھومانے کے بہانے سے باہر لے گیا تھا۔''اسی خبر کا یہ جملہ دیکھیں، جو بھائیوں کے مابین جائداد کی تقسیم سے متعلق ہے''سبھی کے بیچ زمین جائداد کے تقسیم ہوگیا ہے۔''

ایک دوسری خبر کا یہ ٹکڑا دیکھیے:''ٹیم کو خفیہ اطلاع ملی کہ اس معاملے کو انجام دینے والا تین جرائم پیشہ ایک بائک پر سوار ہو کر جھالوا گاؤں میں مسجد سے آگے ایک درخت کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔وہ کسی واردات کو انجام دینے کے فراق میں ہیں۔''

(راشٹریہ سہارا۔ کیم مارچ 2022)

اس خبر میں واحد اور جمع میں عدم مطابقت کے ساتھ ہی عوامی لفظیات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ایک دوسری خبر میں تذکیر و تانیث کی عدم مطابقت دیکھیے:''تھانہ میں درخواست دیا گیا تھا''''چودھری کا قتل نامعلوم جرائم پیشوں کے ذریعہ کردی گئی ہے۔''اسی خبر میں استعمال کی گئیں یہ لفظیات ملاحظہ کریں''ڈیمانڈ، جانکاری، پوچھ گچھ وغیرہ۔ایک اور سرخی دیکھیے''سروپ نگر قتل کیس میں لا پتہ ہاکر کا نہیں لگ سکا پتہ''اس سے اردو صحافت میں زبان کے استعمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بعض مرتبہ املا کی غلطیاں لفظوں کے صوتی آہنگ تو نہیں البتہ اس کی ہیئت ضرور بدل دیتی ہیں،مرکب الفاظ کو ان کی اصل شکل میں نہ لکھ کر انہیں صوتی پس منظر میں لکھ دیا جاتا ہے۔مثلاً شان ہند، جان من، سر دست کو شانے ہند، جانے من، اور سرے دست تک لکھ دیا جاتا ہے۔ یہاں 'ے' کے بجائے اضافت / جری حالت میں ہی اسے لکھا جانا چاہیے تھا۔اس طرح کی غلطیوں سے نئی نسل کے املائی گمرہی کے شکار ہونے کا خطرہ ہے۔اس طرح کے ایک دو لفظ نہیں ہیں بہت سی لفظیات و تراکیب ہیں جن کا املا غلط لکھا جا رہا ہے۔یہ روش اردو صحافت کی زبان کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

خبروں کی زمرہ بندی کے لحاظ سے بھی زبان کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے، مقامی، عالمی، کھیل، اور صحت کی خبروں کے ساتھ ہی ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے علمی و ادبی مضامین اور خصوصی رپورٹ وغیرہ کی زبان میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔عالمی خبروں، کھیل، اور صحت میں انگریزی کی لفظیات کا زیادہ استعمال ہوتا ہے جبکہ مقامی خبروں کی زبان سب سے زیادہ مسخ نظر آتی ہے، اس میں واحد اور جمع کے ساتھ ہی تراکیب میں بھی سب سے زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں۔اس کے بہت سے اسباب و وجوہ ہیں۔سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اب براہ راست اردو میں خبریں بہت کم لکھی جاتی ہیں، زیادہ تر خبروں کا ہندی سے ترجمہ ہوتا ہے کیونکہ ہندستان کے جو اردو کے بڑے اخبارات ہیں ان کا مالکانہ حق ایسی کمپنیوں کے پاس ہے جن کے پاس ہندی اخبارات بھی ہیں، ایسے میں اکثر و بیشتر خبریں ان اخبارات کو ہندی سے ملتی ہیں جن کا ترجمہ کیا جاتا ہے، براہ راست بہت سی کم خبریں اردو میں لکھی جاتی ہیں، چونکہ عملہ بھی کم ہوتا ہے اس لیے جملوں کی ساخت، اور لفظوں کے انتخاب میں غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ جہاں تک ایسے اخبارات کا تعلق ہے جو محدود ہیں تو وہ ایجنسیوں اور گوگل ٹرانسلیٹ پر اپنا وجود رکھتے ہیں اور گوگل کا ترجمہ مشینی ہوتا ہے وہ اسم، فعل اور واحد و جمع میں تمیز نہیں کرتی کیونکہ اردو تو احساس کی زبان ہے اور مشین اس سے عاری ہوتی ہے۔ پہلے اردو اخبارات میں پروف ریڈر ہوا کرتے تھے مگر اب یہ چلن بھی ختم ہوتا جا رہا ہے، ایسے میں سب ایڈیٹر سے رہ جانے والی غلطیوں کی اصلاح اب خود قاری کو ہی کرنا پڑ رہا ہے۔

■

Mohd Haneef Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9359989581
Email.: haneef5758@gmail.com

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

علی شاہد دلکش

''اچھی کتابیں وہ نہیں، جو ہماری بھوک کو ختم کردیں بلکہ اچھی کتابیں وہ ہیں جو ہماری بھوک بڑھائیں... زندگی کو جاننے کی بھوک...''

اصطلاحاً یہ عام ہے کہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ہر وہ تحریر جو کسی شکل میں محفوظ کی گئی ہو، کتاب کہلاتی ہے۔ کتاب کا تعلق انسان سے بڑا پرانا ہے۔ کتاب نہ صرف انسان کی بہترین رفیقِ حیات ہے بلکہ یہ انسان کے علم و ہنر اور ذہنی استعداد میں بھی بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔ کتاب عام انسانی زندگی میں روشنی کی علامت کی سی ہوتی ہے۔ جہاں ایک جانب کتابیں علم و آگہی کا بہترین ذریعہ، انسانی ضمیر کو روشنی بخشنے والی قندیل، غم خوار و مددگار، زندگی کی ناہمواریوں میں دلنواز ہم سفر اور اضطراب و بے چینی کی معالج ہیں تو وہیں دوسری جانب کتابیں تنہائی کی جاں گسل طوالت کی بہترین رفیق بھی ہیں۔ کتاب ایک ایسی سچی و اچھی دوست ہے جس سے بہتر کسی دوسرے دوست کا تصور ممکن نہیں۔ علم کے اس زینے کا نام کتاب ہے جس کے بغیر بنی نوع انسان تہذیب وعلمیت کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ بقول معروف شاعر پیرزادہ عاشق کیرانوی۔

سرورِ علم ہے، کیفِ شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے، کتاب سے بہتر

عالمی شہرت یافتہ ناول و فکشن نگار قرۃ العین حیدر صاحبہ (عرف عینی آپا) کی کتاب 'آگ کا دریا' کے حوالے سے ادبی ترقی پسند نظریہ ساز علی سردار جعفری نے ان کو یوں لکھ بھیجا تھا: ''ہر اچھی کتاب روح میں ایک نیا چراغ جلاتی ہے۔'' (عالمی سہارا، ص:85، مارچ 2012)

قابلِ غور امر ہے کہ اگر کتاب کا وجود نہ ہوتا تو آج ہمارے پاس قرآنِ کریم اور سنت و احادیث کی کتابیں جامع صورت میں موجود نہ ہوتیں، چنانچہ یہ کہا جائے کہ کتابیں اللہ پاک کی نعمت ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔ ضمناً کتاب کے ارتقائی مراحل سے حال تک قد آور ادیبہ، معلّمہ، محققہ اور مصنفہ پروفیسر صالحہ رشید (صدر شعبہ فارسی و عربی، الہ آباد یونیورسٹی) اپنی تحقیقی کتاب 'محاضرات' کے پیش لفظ میں صفحہ نمبر 10 پر یوں رقمطراز ہیں:

''کتابوں کی اہمیت یا ضرورت کسی دور میں کم نہیں ہوسکتی۔ حصولِ علم کا بہترین ذریعہ کتابیں ہیں۔ کتابیں صرف کاغذی پیرہن نہیں بلکہ یہ اپنے دامن میں عقل و دانش کے خزانے چھپائے ہوتی ہیں۔ کبھی یہ زمانے کے حقیقی خدوخال کو عیاں کرتی ہیں تو کبھی اس کے تغیرات کی داستانیں سناتی ہیں۔ یہ آفاقی پیغام کی حامل ہوتی ہیں۔ کتابیں انسان کی روحانی قدروں کو جلا بخشتی ہیں۔ آج کی ترقی بلاشبہ کتابوں کی مرہونِ منت ہے۔ جدیدیت تا مابعد جدیدیت تسخیر کائنات کی ایجادات، اختراعات اور اطلاعاتی سیلاب میں کتابوں کا رول کلیدی رہا ہے۔ کتابوں نے آج پیڑ کی چھال سے آگے کا سفر طے کرتے ہوئے ای کتاب e-book کی شکل اختیار کر لی ہے۔''

ایک چینی فلسفی کا قول ہے کہ جس گھر میں کتاب نہیں، اس گھر میں مت جائیے۔ علاوہ ازیں ہم اپنے بڑے بزرگوں سے بھی سنتے آئے ہیں کہ زندگی روز ایک نیا سبق سکھاتی ہے۔ گویا انسانی زندگی بھی کتاب کی سی ہوتی ہے جس کا ہر دن اس کتاب کا ایک باب نما ہوتا ہے۔ وحشتِ ہستی کی داستانیں اسی کتابِ زیست پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس تناظر میں معروف شاعر عاجز کمال رانا شعری پیرہن میں یوں کہتے ہیں۔

ہمارا ہر دن کتاب کا ایک باب ہے اور
کتاب وحشت کی داستانوں پہ مشتمل ہے

کتابوں کی اہمیت و افادیت کے مدنظر ہی دنیا کے 100 سے زائد ممالک میں 23 / اپریل کو 'عالمی یومِ کتب' کے طور پر celebrate کیا جاتا ہے۔ کتاب کا عالمی دن منانے کا مقصد لوگوں میں اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ حالانکہ یہ نکتہ جگ ظاہر ہے کہ موجودہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل فونز کے استعمال کی وجہ سے بھی کتاب کی اہمیت متاثر ہوئی ہے۔ تاہم آج بھی کتابیں بیشتر معاشرے میں 70 فیصد افراد کے لیے معلومات اور حصولِ علم کا ذریعہ ہیں۔

کتابوں کے زیرِ سایہ عمرِ عزیز کے کچھ پل گزار کر ہی دنیا کے اکثر نشیب و فراز سے واقفیت ممکن ہے۔ کیونکہ کتابوں کی رفاقت میں جب مطالعہ شروع ہو جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کتب بینی انسان کے وقت کو نہ صرف ضائع ہونے سے بچاتی ہے؛ بلکہ معاشرتی ہم آہنگی، سلیقہ مندی اور خود شناسی کے ساتھ ساتھ سماج شناسی کے قریب ہمیں لا کھڑا کر دیتی ہے۔

فضلِ ربّ العالمین ہے کہ مجھے کم سنی سے ہی کتابوں سے دلچسپی رہی ہے۔ ایسا میرے گارجین نیز اقارب کے ذریعے گاہے گاہے سننے کو ملتا ہے۔ مزید میری والدہ محترمہ بتاتی ہیں کہ بچپن میں میرا دو ہی کام ہوا کرتا تھا، پہلا کھانا اور دوسرا کتابیں پڑھنا۔ معاشی طور پر تنگی کی وجہ سے اپنی گلی کے حدود میں یا گھر کی چہار دیواری میں ہی رہتا۔ اس لیے کتابیں ہی میری ساتھی اور مونس ہوتیں۔ اس تناظر میں بہت سالوں بعد مطالعے میں آیا کہ چینی ماہرِ تعلیم گورچ فوک کہتے ہیں:

''اچھی کتابیں وہ نہیں، جو ہماری بھوک کو ختم کر دیں بلکہ اچھی کتابیں وہ ہیں جو ہماری بھوک بڑھائیں... زندگی کو جاننے کی بھوک...''

بہر حال چونکہ سرشت میں انا و خودی شامل تھی لہٰذا زمانۂ طالبِ علمی میں سکنڈری تا گریجویشن، دوست و احباب کے ساتھ مٹر گشتی یا وقت گزاری کی بجائے بیشتر اوقات کتابیں پڑھنے اور (مسلۂ ذاتی اخراجات اور پڑھائی کے اخراجات کو حل کرنے کی غرض سے) پڑھانے میں گزرتا۔ ذہنی چاشنی کے لیے گاہے گاہے کم فرصت کے اوقات میں ادبی مطالعہ بھی کیا کرتا۔ آج بھی کتابوں کو بہترین ساتھی سمجھتا ہوں۔ کریم رب کے کرم سے پڑھتے پڑھتے آڑی ترچھی تخلیقی تحریریں بھی شروع کر دیا۔ فطرتاً انٹیریکٹیو اور ری ایکٹیو ہونے کے باعث تحریروں میں بھی حق گوئی کے ساتھ ایگریشن کی جھلک نظر آتی۔ مگر زمانے کی مصلحت پسندی نے اسے رفتہ رفتہ کم کرنے پر آمادہ کیا۔ گوش گزار کرتا چلوں کہ دیگر انتسابی پہلوؤں کی رو سے کتابوں کے تئیں اہلِ دانش میں معتبر نام اوئلس گیلیوس

کہتے ہیں: ''کتابیں خاموش استاد ہیں۔''

یوں تو دنیا میں پڑھنے اور پڑھانے کے لیے بے شمار کتابیں پڑی ہیں۔ مگر خاکسار کو قرآن مجید اور کتبِ احادیث کے ساتھ ساتھ جن کتابوں نے متاثر کیا اس میں 'تعلیم الاسلام' اور 'دینی تعلیم کا رسالہ' ہے۔ یہ کتابیں راقم الحروف کو کانکی نارہ مدرسہ اسلامیہ میں صوفی صفت جید عالم دین مولانا عبدالحمید قاسمی (مرحوم) کی سرپرستی ونگرانی میں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اول الذکر 'تعلیم الاسلام' کے مولف حضرت علامہ مفتی اعظم محمد کفایت اللہ ہیں۔ سلیس زبان میں لکھی گئی یہ کتاب مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے استحکام اور روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل سے آشنائی وسد باب کے لیے درس ومطالعے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے بنیادی اسلامی بیداری و ذہنی آبیاری کے روشن امکانات ہیں۔ موجودہ وقت میں دونوں ہی کتابوں کے کئی حصے ونمبرات دستیاب ہیں۔ بعد الذکر 'دینی تعلیم کا رسالہ' کے مرتب ومصنف حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ ہیں۔ دینی مدارس ودانش گاہوں میں درس وتدریس کے لیے یہ کتاب مرکزی دینی تعلیمی بورڈ، جمعیۃ علماء ہند سے منظور شدہ بھی ہے۔ 'دینی تعلیم کا رسالہ' نئی نسلوں کے ذہن و دماغ میں صحیح دینی عقائد راسخ کرنے، اسلامی تہذیب وتمدن کی بوباس کی افزائش کے غرض سے، کچھ حد تک ملت کے نونہالوں کی نشوونما دینی نہج پر کرنے یا ان کے اکتساب وتدریس میں دینی مزاج کو فروغ دینے کے لیے مفید ثابت ہوتی آئی ہے۔ واقعی دونوں مخصوص کتابوں 'تعلیم السلام' اور 'دینی تعلیم کا رسالہ' کی مکمل جلدوں کے ذریعے ضروری دینی عقائد کی پختگی بہتر کی جا سکتی ہے۔ ماضی بعید وقریب میں اس رو سے کامیابیاں بھی دیکھنے کو میسر ہوئی ہیں۔اس غرض سے افادۂ عام کے لیے متذکرہ رسالے تدریس واکتساب کی حامل ہیں۔ واضح ہو کہ دینی تعلیم کا رسالہ نمبر 1 کے مشمولات میں آغاز بہ اسمِ باری تعالیٰ، حمد خداوندی، وحدۂ لاشریک کی وحدانیت، عظمت و تقدیس خانۂ خدا اور کتاب اللہ، ماں باپ، ماں اور بچہ، استاذ، نیکی، بدی، اچھائی و برائی اور قومی خدمات پر بالکل آسان زبان و اسلوب میں مضامین ومنظومات شامل ابواب ہیں۔ دینی تعلیم کا رسالہ نمبر 2 میں دینی ومعاشرتی اخلاقی اقدار پر مشتمل مضامین کے تحت رسول اللہ کی شیرخوارگی، بچپن، اخلاق حسنہ، نکاح، سفر، تجارت، معیشت، نبوت، پہاڑی واعظ اور تبلیغِ اسلام سے متعلق بات بات میں درس و تدریس کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ ایک باب بہ عنوان 'شہر کعبہ' میں اسلامی شعار پر بنیادی باتوں کے ساتھ عظمت و تعظیمِ حبیب اللہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مزید حضرت شیخ سعدی شیرازی کا بین السطور مشہور ومقبول عربی نعتیہ شعر بھی درج ہے:

بلغ العُلا بکمالهِ کشف الدُجی بجمالهِ
حَسُنت جمیعُ خصالهِ صَلُّوا علیه و آلهِ

اس سبق کے آخر میں سوال وجواب کے بعد اضافی طور سے تشریح، وضاحت اور اکتساب وتدریس کے لیے اردو کے زیرِ نظر اشعار بھی درج ہیں:

پہنچے بلندی پر اپنے کمال سے
کھول دیا اندھیروں کو اپنے جمال سے
اچھی ہیں آپ کی تمام عادتیں
درود پڑھو آپ پر اور آپ کی اولاد پر

درج بالا اردو اشعار کی تشریح اور شیخ سعدی شیرازی کے مقبول زمانہ عربی شعر کے ترجمے کے مطالعے کے بعد معلومات میں اضافہ ہوا کہ متذکرہ اردو کے ماخوذ چار مصرعے شیخ سعدی کے عربی والے مقبول چار مصرعوں کے منظوم اردو تراجم ہیں۔

راقم المضمون کو جن کتابوں نے متاثر کیا ان میں اہم نام کے طور پر بین الاقوامی سطح پر مقبول شاعر وادیب منور رانا کی دو نثری کتابیں بھی ہیں۔ ان میں پہلا نام 'چہرے یاد رہتے ہیں' اور دوسرا نام 'بغیر نقشے کا مکان' ہے۔ مقبول کتاب 'کچھ چہرے یاد رہتے ہیں' کے مضمون بہ عنوان 'دل وہ بھیگا کاغذ ہے جو جلتا ہی نہیں' میں کتنی بے باکی سے اردو ادب کی تنقیدی صنف کے مشکوک تناظر میں حقیقی ولطیف بات کہنے کی کامیاب جسارت کی گئی ہے، جو یوں ہے:

''اردو تنقید کا سب سے بڑا مسئلہ یہی رہا ہے کہ جس پر لکھا جانا چاہیے تھا، اس پر نہیں لکھا جا رہا ہے اور جس پر لکھا جا رہا ہے وہ لکھے جانے کے لائق نہیں۔''

اسی مخصوص کتاب کے مضمون بہ عنوان 'تمھاری یاد کھڑی تھی فصیل شہر کے پاس' میں عالمی شہرت یافتہ شاعر وادیب منور رانا اردو شاعری اور شعرا کے عملی کردار کے حوالے سے زیرِ نظر اقتباس میں کیا خوب کہتے ہیں:

''سچ پوچھیں تو شاعری وہ نہیں ہوتی جسے آپ مصرعوں میں قید کر لیتے ہیں۔ بلکہ اصل شاعری تو وہ ہوتی ہے جس کی خوشبو آپ کے کردار سے آتی ہے۔''

منور رانا صاحب کی کتاب 'بغیر نقشے کا مکان' دراصل کلکتے کا محض ادبی منظر نامہ نہیں ہے بلکہ اردو کی چلتی پھرتی تہذیب ہے۔ مزید براں یہ مخصوص کتاب رانا صاحب کے ذریعے آباد کی گئی لفظوں کی ایک کہکشاں ہے، جہاں عام فہم اور سہل سے جملوں میں بڑی سے بڑی بات ایسی دلکشی کے ساتھ ادا کی گئی ہے کہ قاری کا متن میں ڈوب جانا لازم ہے۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا کہہ دوں کہ کتاب 'بغیر نقشے کا مکان' کا تذکرہ وتبصرہ اختصار سے اور عجلت میں نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ اس 'بغیر نقشے کا مکان' کے احترام میں لفظوں کا ایک جہاں آباد کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ دلیل کے طور پر ذیل کے اقباسات سے محظوظ ہوں: ''علم کی دیوی سرسوتی اپنے مندر میں سیاسی مجرے کی اجازت کبھی نہیں دے سکتی ہے۔''

موجودہ منظر نامے میں جہاں بڑے بڑے ادبا، لیکچرار اور پروفیسرز حضرات اپنی خاطر تنخواہوں کے بعد بھی امرا، رؤسا اور ایم ایل اے اور ایم پی کے اشاروں تلے ہر کام کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس تناظر میں ادب کی تڑپتی ادبیت کے حوالے سے رانا صاحب یوں کہتے ہیں:

''ادب رکھیل کی طرح نہیں ہوتا کہ جس کے جسم اور سانسوں پر شہر کے کسی رئیس کا قبضہ ہو''

اتحاد کے لیے ترستے ملی انتشار، ملی قائدین، ائمہ، مبلغین، شعرا و ادبا اور اعلی تعلیم یافتگان کے درمیان اختلافات سے پیدا شدہ علیحدگی، جو ہماری تنزلی کی وجوہات میں ہے، کے مدنظر رانا صاحب کی مذکورہ کتاب کے پیش نظر قتباس کو دیکھیں:

''اس زمانے میں اتحاد کا فقدان ہے۔ مسجدیں تقسیم ہو گئی ہیں۔ قبرستان بھی متحدہ ہندوستان کی طرح بٹوارے کی نذر ہو گئے ہیں۔ لفظ اتحاد صرف ڈکشنری میں یا لیڈروں کی زبان پر رہ گیا ہے۔''

قلم کو روکنے سے قبل مختصراً عرض کر دوں کہ ماہر فلسفہ ونفسیات ملٹن کے مطابق ''اچھی کتاب عظیم روح کے قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے اس کو محفوظ کرنے کا مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو اس عظیم روح سے روشناس کروانا ہے۔''

اظہار برملا کے سائے میں ناچیز یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے صرف کتابیں ہی اچھی نہیں لگتی ہیں بلکہ کتابی چہرے بھی پسند ہیں اور مانند کتاب شخصیات کی صحبت بھی۔ لہٰذا مانند کتاب شخصیات میں مولانا عبدالحمید صاحب (مرحوم) کے بعد حکیم علاؤالدین احمد (منہ بولے خالو مگر حقیقی سے بہتر) اور محترم محمد سلیم (فوٹوگرافر) صاحبان سے راقم السطور متاثر رہا۔ کیونکہ میری ذہنی تربیت میں ان کا رول ہے۔ اللہ انھیں تا دیر سلامت رکھے، آمین۔

■

Shahid Ali
H.No.: 387/1/203, West Purwasa, Sthirpara Road
Near Poorbasha Masjid E Bilal
Po-Kankinara, Distt.: North-24
Parganas - 743126
Mob.:8820239345

اردو زبان و ادب میں تصور کی تفہیم

محمود الحسن خان

اردو زبان و ادب سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے لفظ تصور نیا یا اجنبی سا نہیں، جابہ بجا تحریرو مکالمہ میں اس کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے، اردو میں لفظ تصوریا تصور کی اضافت کے ساتھ کئی کتاب و مضامین بھی موجود ہیں اور مستقل لکھے بھی جارہے ہیں اسی طرح آج کی روز مرہ زبان میں اس کا استعمال جگہ جگہ پر ہوتا ہے، جیسے اقبال کا تصور عشق، منٹو کا تصور جنس، چکبست کا تصور قومیت یا دیگر شعرا و ناقدین، ناول و افسانہ نگاران کے مختلف تصورات کو مختلف اندازسے بولا، پڑھا، سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔

اردو زبان و ادب سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے لفظ تصور نیا یا اجنبی سا نہیں، جابہ بجا تحریر و مکالمہ میں اس کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے، اردو میں لفظ تصور یا تصور کی اضافت کے ساتھ کئی کتاب و مضامین بھی موجود ہیں اور مستقل لکھے بھی جارہے ہیں اسی طرح آج کی روزمرہ زبان میں اس کا استعمال جگہ جگہ پر ہوتا ہے، جیسے اقبال کا تصور عشق، منٹو کا تصور جنس، چکبست کا تصور قومیت یا دیگر شعرا و ناقدین، ناول و افسانہ نگاران کے مختلف تصورات کو مختلف انداز سے بولا، پڑھا، سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔

لیکن تصور کے حوالے سے چند سوالات ہیں جن کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے یا کم از کم مطالعے و مکالمے کے درمیان اس کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے، اور وہ یہ کہ سب سے بنیادی بات تصور کیا ہے؟ پھر کسی بھی چیز کا تصور کیسے قائم ہوتا ہے؟ کسی صنفی تخلیق یا تخلیق کار کے تصور کو کیسے سمجھا جائے گا؟ اور کس تصور کو ذہن میں رکھ کر تخلیق یا تخلیق کار کے تصور اور نظریہ، تصور و تخیل اور تصور و خیال یا اس کے وہم و گمان کو الگ کیسے کیا جائے گا ان بنیادی سوالات کے جواب کے بعد ہی ہم تصور کے تعلق سے صحیح تفہیم و تنقید تک پہنچ سکتے ہیں۔

ان بنیادی سوالات کے جواب میں سب سے پہلے قدیم فلاسفر کی طرف نظر کرنی پڑتی ہے اس لیے کہ لفظ تصور کی ابتدائی بحث باوجود اس کے کہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے، عربی لسانیات کے باب کے بجائے دستیاب عربی زبان و ادب سے قبل ہم کو فلسفے کے باب میں ملتی ہے جہاں اس کی بنیادی طور پر دو قسم کی جاتی ہے۔

تصدیق اور تصور

جس کو مختصر یوں بیان کیا جاسکتا ہے تصدیق وہ ہے جس کو مطالعے و مشاہدے سے ثابت کرکے دلیل کے ساتھ پیش کردیا گیا ہو اس طرح کسی چیز کو لے کر ایک نظریہ قائم ہوجاتا ہے اور تصور: جس کو مطالعے مشاہدے سے ثابت نہ کیا جاسکتا ہو یا اس کے لیے کوئی Ontological Theory مکمل طور پر نہ پیش کی جاسکتی ہو جیسے روح اور ہوا، عشق و محبت اور خیر و صداقت کی مثال پھر اس تصور کی بھی دو قسمیں بنتی ہیں ایک تصور بدیہی یعنی وہ جو حقیقی ہوتا ہے جیسے روح اور ہوا اور دوسرا تصور نظری یعنی وہ جو گمانی ہوتا ہے جیسے عشق و محبت اور خیر و صداقت وغیرہ۔

یہ عجیب بات ہے تصور کے تعلق سے اردو زبان و ادب میں بہت سی غلط فہمیاں عام و خاص میں اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہیں جس سے تصور کی مکمل تفہیم مشکل ہوجاتی ہے اور پھر تصور و نظریہ، تصور و تخیل، تصور و خیال، تصور و وہم میں بھی بڑی بڑی غلطی ہوجایا کرتی ہے اور حیرانی تو یہ ہے اس پر کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا۔

اردو زبان پھر اس کی شاعری میں تصور کی اصطلاح

یہ عجیب بات ہے تصور کے تعلق سے اردو زبان و ادب میں بہت سی غلط فھمیاں عام و خاص میں اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہیں جس سے تصور کی مکمل تفہیم مشکل ہوجاتی ہے اور پھرتصور و نظریہ، تصور و تخیل، تصور و خیال، تصور و وہم میں بھی بڑی بڑی غلطی ہوجایا کرتی ہے اور حیرانی تو یہ ہے اس پر کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا۔

کا سلسلہ بہت قدیم ہے، شاعر کے یہاں زندگی اور کائنات سے متعلق مخصوص اور مستقل خیالات پائے جاتے تھے، جیسے کلاسکی غزل میں عاشق و معشوق کے مخصوص تصورات اور بعد کی شاعری میں حسن و عشق اور زندگی سے متعلق کئی ایسے نظریات ہیں جن کو تصورات کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اور کئی ایسے خیال و گمان بھی ہیں جس کو تصورات کے زمرے میں رکھا جانا مناسب نہیں ہے، جیسے غالب کا یہ شعر ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اس شعر میں غالب نے موت کے بعد کی رسوائی سے بچنے کے لیے غرق دریا ہونے کا خیال باندھا ہے، اس خیال کو غالب کا نظریہ سمجھیے تو یہ خیال تصور ہے اور اگر محض بیان یا اظہار کیفیت ہے تو اس بات کو صرف خیالات کے زمرے میں رکھا جائے گا نا کہ تصوارت کے۔

تصور کے تعلق سے اس طرح کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور دوسرے مترادف الفاظ میں فرق واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ تصور کے فلسفیانہ نظریے کے ساتھ ساتھ اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے جس کو مختصر انداز میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

تصور کی لغوی تعریف:

تصور عربی زبان کا لفظ ہے جس کی تعریف میں اہل زبان حسب ذیل رائے رکھتے ہیں۔

علی جرجانی (جن کو عربی لغت کے پیش رووں میں شمار کیا جاتا ہے) کے مطابق کسی چیز کا عقل میں آنا یا ابھرنا تصور ہے "حصول صورة الشیء فی العقل"[1]

معجم الوسیط اور دور حاضر کی جدید لغت المعانی الجامع میں تصور کی تعریف اس انداز سے کی گئی ہے:

"استحضار صورة الشیء محسوس فی العقل دون التصرف فیه"

ترجمہ: دماغ میں کسی محسوس چیز (Tangible) کا بنا تصرف و بدلاؤ آنا تصور ہے۔[2]

عرب علما و فلاسفر اور لسانیات کے ماہرین کے یہاں تصور کی اصطلاحی تعریف لغوی تعریف کے قریب تر ہے، علامہ ابوبکر بن عبداللہ جو فقہ النوازل کے مصنف ہیں اور قدیم اہل علم وفن میں ان کا شمار ہوتا ہے وہ حکم و یقین کو تصور کی ایک قسم یا شاخ مانتے ہیں ان کا کہنا ہے:

"الحکم فرع التصور"[3]

قدیم عربی زبان کے ماہر و فلسفی علامہ مناوی اور علی جرجانی کے یہاں تصور وہی ہے جس کا لغت میں بیان کیا گیا ان حضرات کے نزدیک کسی بھی چیز کا دماغ میں ابھرنے کا نام تصور ہے:

التصور حصول صورة الشیء فی العقل[4]

بعد کے اہل زبان ولغت نے اس میں تھوڑا اضافہ کیا ہے ان کا کہنا ہے:

"ان یکون ما یراد تصوره مدرکا والا کام ضربا من ضرب الظن"

ترجمہ: تصور وہ ہے جس کے تصور کو ادراک میں لایا جاسکے ورنہ وہ گمان و خیال کی ایک قسم ہے۔

ان تعریفات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی چیز کے تصور بننے کے لیے حسب ذیل شرطیں ہیں:

* ادراک پایا جائے یعنی وہ (Cognitive) ہو۔
* اس کی تصدیق نہ کی جاسکتی ہو یعنی وہ (Imperception) کے زمرے میں آئے۔
* اور اس میں مطابقت (Compatibility) پائی جاتی ہو۔

یعنی تصور میں ادراک نہیں تو وہ وہم شمار ہوگا اور تصدیق پائی جائے تو وہ تصور نہیں رہتا اسی طرح اس میں مطابقت نہ پائی جائے تو وہ تصور نہیں خیال ہوجاتا ہے۔

تصور کی اصلاحی تعریف:

جب تصور کی اصطلاحی تعریف کی بات کی جاتی ہے تو اس کا سلسلہ عربی لفظ 'تصور' سے زیادہ پرانا ہوجاتا ہے یعنی اس کا سلسلہ قدیم فلاسفرز سے جا کر ملتا ہے فلسفے کے ابتدائی بحثوں میں ایک Metaphysics کے بعد منطق کے تلاش و بیان میں تصور کی بحثیں ملنے لگتی ہیں وہاں اہل فلسفہ تصور کو علم کی دوسری سب سے اہم کڑی مانتے ہیں ان کے مطابق تصدیق کے بعد سب سے اہم چیز یہی تصور ہے چنانچہ 'تصوریت' کو باقاعدہ فلسفے کی حیثیت سے یافت و دریافت کیا جانے لگتا ہے۔[5]

تصور کی اصطلاحی تعریف قدیم فلسفیوں کے یہاں اختصار کے ساتھ اور بعد کے یہاں تفصیل کے ساتھ ملتی ہے جس میں سب سے پہلے برکلے کا نام لیا جاسکتا ہے جس نے باقاعدہ اس پر اپنا اظہار خیال کیا ہے۔

برکلے کے نزدیک "ہر وہ شے جو بلا واسطہ علم میں آئی" تصور ہے۔[6]

یعنی معطیات حس حواس خمسہ کے ذریعے جو بھی چیز ذہن میں منتقل ہوتی ہے وہی تصور ہے لیکن بعد کے فلاسفرز جو (Contemporary Era) سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے برکلے کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ نامکمل تعریف ہے بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو معطیات حس سے باہر کی ہیں ان کو بھی تصور کی فہرست میں رکھا جائے گا چنانچہ بی رسل نے اس تھیوری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا:

"یہ کوئی امر مسلم نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو واقعیت کے خلاف ہے کہ ہم جو چیز نہیں جانتے اس کا وجود بھی نہیں جان سکتے، اس ضمن میں جاننا دو معنوں میں استعمال ہوا ہے، استعمال اول میں جاننے کا اطلاق اس قسم کے علم پر ہے جس کو غلطی کا عکس سمجھنا چاہیے یعنی جس سے مراد علم صحیح ہے یہ وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ سچ ہے اس کے تحت میں ہمارے وہ معتقدات و متیقنات آسکتے ہیں جو تصدیق کے نام سے پکارے جاتے ہیں اس قسم کے جاننے کو ہم علم حقائق کہتے ہیں اب لفظ جاننا اپنے دوسرے معنی میں ہمارے علم اشیا پر مشتمل ہے جسے ہم معرفت بھی کہہ سکتے ہیں یہ وہ مفہوم ہے جس کی رو سے ہم اپنے معطیات حس سے آگاہ ہوتے ہیں یہ تفریق فرانسیسی الفاظ Savior اور Connaitre یا جرمن الفاظ Wisden اور Kennen سے ظاہر ہوسکتی ہے۔"[7]

تصور کے مختصر و قدیم فلسفیانہ نظریے، لفظ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کے بعد یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سائنس کے جدید دور میں تصور کے تعلق سے کیا تصور قائم ہے، گرچہ جدید تصورات میں تصور کے حوالے سے کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا براہ راست اردو زبان و ادب میں مستعمل تصور سے کم تعلق ہے، لیکن یہ دیکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جدید سائنس اور اردو زبان میں استعمال کیے جانے والے لفظ تصور کے درمیان کیا سلسلہ و ربط ہے؟ اور یہ تفہیم بھی عام ہو کہ اس زمرے میں کن نظریات

اردوزبان پھر اس کی شاعری میں تصور کی اصطلاح کا سلسلہ بہت قدیم ہے، شاعر کے یہاں زندگی اور کائنات سے متعلق مخصوص اور مستقل خیالات پائے جاتے تھے، جیسے کلاسکی غزل میں عاشق و معشوق کے مخصوص تصورات اور بعد کی شاعری میں حسن و عشق اور زندگی سے متعلق کئی ایسے نظریات ہیں جن کو تصورات کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اور کئی ایسے خیال و گمان بھی ہیں جس کو تصورات کے زمرے میں رکھا جانا مناسب نہیں ہے۔

کواہمیت سے دیکھا جانا چاہیے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید فلاسفرز (Modern Era) کے یہاں تصور کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

* تصور بحیثیت (Mental Representation) یعنی وہ جو حواس خمسہ میں آئے۔
* تصور بحیثیت Abilities یعنی عمل ولیاقت۔
* تصور بحیثیت Abstract Object of Mental State یعنی غیر محسوس ومشاہدہ، برخلاف عقل [8] مذکورہ بالا تعریفات و توضیحات، قدیم فلاسفرزاور جدید سائنسدانوں کی مختصر تشریح کی روشنی میں جونتیجہ نکلتا ہے اس کوحسب ذیل انداز سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے:
* تصور ایک مکمل فلسفہ ہے جس کے بننے میں کئی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔
* تصور میں ادراک Cognation کا پایا جانا ضروری ہے۔
* تصور معطیات حس (حواس خمسہ) اور غیر معطیات حس (غیر حواس خمسہ) یعنی Tangible or Intangible دونوں ہوسکتا ہے۔
* تصور تخیل (Perception) سے الگ چیز ہے
* تصور اور خیال میں فرق مطابقت Compatibility کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے
* تصور کو نظریہ نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ نظریہ کے لیے دلیل شرط ہے۔
* تصور مطالعہ ومشاہدہ یا وجدان وتجربے کے بعد بنتا ہے۔
* تصور Abstract ہوتا ہے نا کہ Actual اگر وہ Actual ہوا تو تصور نہیں رہتا بلکہ تصدیق کے زمرے میں آجاتا ہے۔
* تصور کو علمیاتی نوعیت Epistemological اور وجودیاتی نوعیت Ontological دونوں زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

ان مختصر نکات سے تصور کی تفہیم میں کافی آسانی پیدا کی جاسکتی ہے اور یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں لفظ تصور پر جس انداز سے مباحث قائم کیے جانے تھے اس میں کہاں کمی واقع ہوئی ہے اور زبان میں تصور کو کس انداز سے دیکھا اور لکھا گیا ہے، تصور کی افہام وتفہیم میں یہ دیکھنا بھی دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں کہ اس سے ملتے جلتے الفاظ سے تصور کو کیسے الگ کیا جائے؟ اس حوالے سے عربی کی مشہور کتاب فروق اللغوية بہت معاون ہے جس کی روشنی میں کچھ تعریفات کو نیچے نقل کیا جارہا ہے اور ایک کوشش کی ہے کہ مترادف الفاظ سے خلط ملط کے عمومی رجحان کو کم کیا جاسکے۔

شاعر کے مطابق اس دنیائے رنگ و بو کی تمام تر رعنائیاں حسن یار کے جمال سے آراستہ ہے لیکن شاعر کے پاس نہ اس کی دلیل ہے ناہی قاری کے پاس اس کا انکارچنانچہ دعوی اپنی جگہ ادھور سچ ہے اور اس دعوے کی تصدیق نہ ہونے کی صورت میں اس کو شاعر کے تصورسے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن کوئی دعوے کی تردید کردے تو یہ بس ایک خیال بن جائے گا،اسی طرح تصورات بنتے چلے جاتے ہیں۔

تصور اور اس سے قریب ترین جن الفاظ میں فرق کیا جانا ضروری ہے اس کی نشاندہی یوں کی جاسکتی ہے:

تصور اور خیال/تخیل میں فرق
تصور اور وہم وگمان میں فرق
تصور اور نظریہ ودلیل میں فرق

تصور اور خیال میں فرق اس طرح سے کیا جائے گا کہ تصور ایک حالت میں نہیں رکتا جبکہ خیال یا تخیل کی ایک حالت ہوتی ہے۔

تصور اور وہم وگمان میں اس طرح سے فرق کیا جائے گا کہ تصور کے لیے علم شرط ہے اور وہم وگمان علم سے خالی ہوتا ہے۔

تصور اور نظریہ میں اس طور پر فرق کیا جاسکتا ہے کہ تصور کے لیے دلیل شرط نہیں جبکہ نظریہ کے لیے دلیل شرط ہوتی ہے۔[9]

کسی تخلیق یا تخلیق کار کے تصور کی تعریف کیا ہوسکتی ہے؟

کسی بھی تخلیق یا تخلیق کار کا تصور جس زمرے میں آتا ہے اس کو تصور نظری کہتے ہیں یعنی ایسا تصور جس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی ہے، (تصدیق ہوگئی تو یہی تصور بدیہی یعنی حقیقت میں تبدیل ہوجائے گا) اس طرح وہ تصور کے خانے سے منتقل ہوکر حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے اس کو کلاسکی شاعری میں صوفیانہ تصور عشق کی مثال سے یوں سمجھیے کہ شعرا کے ذہن میں تصور عشق کے ادراک اور مطابقت کی تصویر بنتی اور ابھرتی ہے لیکن اس کو ظاہر نہیں کیا جاسکتا ہے، ادراک و مطابقت کی شکل یوں بنتی ہے جیسے بعض علما وصوفیا تصور عشق کو حسن کے وجود کا سبب مانتے، سمجھتے یا محسوس کرتے ہیں لیکن سمجھتے یا محسوس کرتے ہوئے بھی اس کو سمجھا نہیں سکتے۔

حسن جمال یار سے ہے انجمن تمام

شاعر کے مطابق اس دنیائے رنگ و بو کی تمام تر رعنائیاں حسن یار کے جمال سے آراستہ ہے لیکن شاعر کے پاس نہ اس کی دلیل ہے ناہی قاری کے پاس اس کا انکار چنانچہ دعوی اپنی جگہ ادھور سچ ہے اور اس دعوے کی تصدیق نہ ہونے کی صورت میں اس کو شاعر کے تصور سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن کوئی دعوے کی تردید کردے تو یہ بس ایک خیال بن جائے گا، اسی طرح تصورات بنتے چلے جاتے ہیں۔

غرض ذہن میں کسی ایسی صورت کا بار بار آنا جس کے ادراک کی عقل گواہی دے یا مطالعے ومشاہدے سے اس کو ثابت کرنے کی گنجائش دِکھے لیکن ثابت نہ ہوئی ہو، اور اس صورت سے ذہنی مطابقت میل کھاتی دکھائے دے لیکن اس کو دکھایا نہ جاسکے تصور ہے جیسے: ،روح، عشق ومحبت یا دوسرے جذبات وغیرہ لیکن اگر وہی صورت دکھائی دینے لگے یا محسوسات میں آجائے تو تصور کی اگلی کڑی تصدیق کہلائے گی جیسے پانی درخت انسان اور لفظ اس کو مثال سے یوں سمجھیے ،ایک مشہور تصور ہے 'شروع میں لفظ ہی خدا تھا' پھر لفظ کی تصدیق ہوتی گئی اور خدا تصور ہی میں رہا۔

حواشی

1 کتاب التعریفات ،محمد بن علی جرجانی، ص 135، ط: دارالکتب العلمیہ بیروت، لبنان۔
2 المعانی الجامع، مروان عطیہ، المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ/احمد زیات بشکریہ (Almaany.com)
3 فقہ النوازل، ابوبکر بن عبداللہ، جلداول، ص 142، طباعت: موسسۃ الرسالہ، بیروت
4 التوقیف علی مھمات التعاریف، علامہ مناوی، ص 180، طباعت: عالم الکتب، القاھرہ
5 تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: انواع فلسفہ از ظفر حسین خان مبادیات منطق وفلسفہ از حکیم تسخیر احمد خان بشکریہ Rekhta.org
6 مسائل فلسفہ، بی رسل، ترجمہ: معین الدین انصاری، ص: 28، طباعت: دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
7 ایضا، مسائل فلسفہ، ص 33
8 Stanford *'Concepts' Stephen Lawrence Eric Margolis; Metaphysics Research Lab at * Encyclopedia of Philosophy November 2012 Retrieved6 * Stanford University www.bcs.mit.edu/research/congnitive-science
9 فروق اللغویۃ، علامہ حسن عسکری، ص 98 تا 100، طباعت: موسسۃ النشر الاسلامی۔

■

Mahmoodul Hasan Khan
Research Scholar, MANUU, Lucknow Campus
Near Darul Uloom Nadwadul Ulama
Lucknow - 226007 (UP)
Mob.: 8090060800

صلاح الدین شاہ

گئودان اور اڑیہ ناول چھومانڑو آٹھو گونٹھو کا تقابلی تجزیہ

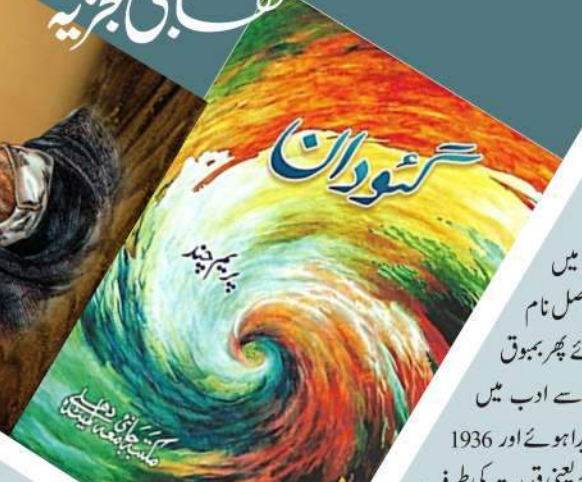

پریم چند اردو فکشن کی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اصل نام دھنپت رائے، قلمی نام نواب رائے پھر بمبوق اور آخر میں پریم چند کے نام سے ادب میں جانے جاتے ہیں۔ 1880 میں پیدا ہوئے اور 1936 میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے یعنی قدرت کی طرف سے انھیں صرف 56 سال کی زندگی ملی۔اس میں سے انھوں نے اپنی عمر کے 36 سال چرا کر ادبی دنیا کو فراہم کیے۔انھوں نے اردو ادب کو افسانہ، ناول، ڈراما اور خطوط جیسی اہم اصناف سے مالا مال کیا۔ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز 1901 سے ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے اردو اور بعد میں ہندی میں طبع آزمائی کی۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے ادیب تھے۔ ان کی تمام کتابیں ایک مدت تک راست طور پر اردو میں ہی شائع ہوئیں۔ البتہ ان کے ترجمے ہندی میں شائع ہوتے رہے۔اردو ادب میں ان کی پہچان فکشن نگار کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے کل تیرہ ناول لکھے جن میں سے پہلا اور آخری ناول نامکمل ہے۔ان کے 14 افسانوی مجموعے ہیں جن میں ڈھائی سو سے زائد افسانے موجود ہیں۔ پریم چند نے اردو میں دو طبع زاد ڈرامے 'کربلا' اور 'روحانی شادی' کے نام سے تخلیق کیے۔

اسی طرح فقیر موہن اڑیہ ادب میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے ذکر کے بغیر اڑیہ ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔فقیر موہن کی ولادت ریاستِ اڈیشہ، ضلع بالیشور کے ایک گاؤں ملی کاس پور میں 13 جنوری 1843 کو ہوئی۔ جب ان کی عمر 17 مہینے کی تھی تو والد اور جب ڈھائی سال کے تھے تو والدہ کی موت ہوگئی۔ان کی پرورش ان کی دادی کوچیڑا دیوی کی سرپرستی میں ہوئی۔

اصل نام برجوموہن تھا۔ابتدائی زمانے میں کئی سال تک بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کی دادی نے ایک درگاہ میں منت مانگی تھی کہ اگر برجوموہن کی طبیعت اچھی ہو جائے تو اسے آپ کا غلام بنا دوں گی۔ برجوموہن کے صحت مند ہونے کے بعد یہ تو نہ کر پائیں البتہ محرم کے مہینے میں برجوموہن فقیر بن کر گاؤں گاؤں بھیک مانگتے اور ان پیسوں کی شیرینی خرید کے بانٹ دیتے۔مناسبت سے انھوں نے اپنا نام برجو موہن سے فقیر موہن اختیار کیا۔ابتدائی تعلیم 9 سال کی عمر سے شروع ہوئی۔اس وقت نہ کوئی اسکول تھا اور نہ ہی اڑیہ ادب میں کوئی کتاب رائج تھی۔گھر کے معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے اعلا تعلیم حاصل نہ کر پائے اور انھیں صرف ڈھائی سال تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

فقیر موہن کی ادبی زندگی کا آغاز 1868 سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اڑیہ ادب میں افسانہ، ناول، نظم اور ترجمہ وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے گوڑ پو سوڑ پو جلد اول (چند کہانیاں، جلد اول) اور گوڑ پو سوڑ پو جلد دوم (چند کہانیاں، جلد دوم) ہیں جن میں کل 20 افسانے شامل ہیں۔انھوں نے چار ناول اور کئی نظم تخلیق کیں۔اس کے علاوہ رامائن، مہابھارت اور سری مد بھگوت گیتا کا اڑیہ زبان میں ترجمہ کیا۔

گئودان پریم چند کا آخری، مکمل اور شاہکار ناول ہے۔اس ناول کو انھوں نے 1932 میں لکھنا شروع کیا 1935 میں مکمل ہو کر 1936 میں شائع ہوا۔ یہ ناول پریم چند کی زندگی اور ان کے فن کا نچوڑ ہے۔ ہندی میں گودان اور اردو میں اس کا نام 'گئودان' ہے۔ یہ وہ ناول ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو ناول کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ ناول بیسویں صدی کی تاریخ، تہذیب، سماج اور اس دور کی عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے عوامی زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اردو ناول

> ”فقیر موھن اڑیہ ادب میں ستون کی حیثیت رکھتے ھیں۔ ان کے ذکرکے بغیر اڑیہ ادب کی تاریخ مکمل نھیں ھو سکتی۔فقیر موھن کی ولادت ریاستِ اڈیشہ، ضلع بالیشورکے ایک گاؤں ملی کاس پور میں 13 جنوری 1843کو ھوئی۔جب ان کی عمر17 مھینے کی تھی تو والد اور جب ڈھائی سال کے تھے تووالدہ کی موت ھوگئی۔ ان کی پرورش ان کی دادی کوچیڑا دیوی کی سرپرستی میں ھوئی۔“

میں اب تک ہندستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ لیکن زیادہ تر ناول کا تعلق شہری زندگی سے رہا۔ اگرچہ پریم چند کے ناولوں میں دیہاتی زندگی کے عناصر موجود ہیں لیکن اس پر اتنی پختگی نہیں ملتی ہے جتنی گئودان میں ہے۔ اس ناول میں باقاعدہ دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل، سیاسی حالات اور اقتصادی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوام کو مرکزی مقام دیا گیا ہے۔ بقول احتشام حسین:

گئودان اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف پریم چند پہنچے اور وہ بھی صرف ایک بار۔ یہ ناول ان کے فنی ارتقا کا نقطۂ عروج ہے۔ شاید ان کا فن ابھی اور آگے بڑھتا لیکن موت نے راہ کھوٹی کر دی کیوں کہ جس سال گئودان پہلی دفعہ شائع ہوا اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔'' (افکار و مسائل، ص 117)

اسی طرح فقیر موہن نے اڑیہ کا پہلا مکمل ناول لکھا جو فن کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ انھوں نے چار ناول لکھے جن میں سے پہلا ناول ان کا شاہکار نکلا۔ یہ ناول رسالہ ''اتکلو ساہتیہ'' میں اکتوبر 1897 سے 1899 تک کل 28 قسطوں میں شائع ہوا۔ 1902 میں یہ ناول کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس ناول کو فقیر موہن اپنے نام کے بجائے دھور جوٹی کے نام سے لکھتے تھے۔ جب یہ ناول قسط وار شائع ہوتا تھا اس کا کوئی عنوان نہ تھا لیکن جب کتابی شکل میں شائع ہوا تو اس کا عنوان قائم کیا گیا۔ مثلاً، منگوراج کا خاندان، چمپا، زمیندار شیخ دلدار میاں، گاؤں کا حال چال، بھوگیا اور ساریا، گوبرا جینا وغیرہ۔ یہ ناول اڈیشہ کے جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کی عظمت اور شہرت اس وقت ہوئی جب اس کا ترجمہ مختلف موقع پر کئی بار انگریزی زبان میں ہوا۔

اس ناول کے کل چار تراجم ملتے ہیں:

1. Subdle Under the Cloven Hoof. , C.V.N.Dash 1967
2. A Plot of Land , D.M.Senapati & AM Senapati 1967
3. A Plot of Land , N. Mishra 1969
4. Six Acres and a third University of California Press 2005

فقیر موہن کی تخلیق مقصدیت کی حامل ہے۔ سماج کو برائیوں سے پاک کرنا ان کا مقصد تھا۔ یہ ناول کسان اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان کشمکش کو پیش کرتا ہے۔ بقول کرشن چندر پردھان:

'''چھو مانڑو آٹھو گونٹھو' اس زمانے کا اڈیشہ اور بعد کے زمانے کی درمیانی کڑی ہے۔ فقیر موہن گہری نظر رکھنے والے انسان تھے۔ وہ انسان کی بے بسی اور مفلسی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ پاپ سے نفرت کرتے تھے پاپی سے نہیں۔ پاپی کو معاف کرنے کے لیے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ انسان کے کردار کی اچھی پکڑ تھی۔ زمانے کے مسائل پر آواز بلند کرنا ان کا ہنر تھا۔ اس وجہ سے ان کا پہلا ناول اس زمانے اور اس زمانے کے لوگوں کا امتحان گاہ ہے۔'' (مقدمہ چھو مانڑو آٹھو گونٹھو، ص 6)

گئودان میں ہندستانی کسان اور دیہاتیوں کی زندگی کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مختلف و متنوع مسائل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جس کا سلسلہ دیہات سے لے کر شہر تک پھیلا ہوا ہے۔ پریم چند گئودان میں جس دور کو پیش کرتے ہیں وہ دور ہندستانی دیہاتوں کا بدترین دور تھا۔ ملک کے جاگیردارانہ نظام کے دم توڑنے کے بعد نئے زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے جگہ لے لی تھی۔ اس بدلے ہوئے سماجی اور معاشی ڈھانچے میں گاؤں کے کسان کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ کسان کی حالت ایسی تھی کہ زمیندار کو وقت پر مال گزاری چاہیے۔ سرکار کو وقت پر لگان چاہیے۔ کھانے کو دو مٹھی اناج چاہیے اور پہننے کے لیے کپڑا۔ پر ایک طرف آندھی طوفان فصل برباد کر دیتی اور جو بچا کھچا رہا اس پر زمیندار کی ملکیت رہتی۔

ایسے ہی نظام اور اسی طرح کے سماج کی نمائندگی 'چھو مانڑو آٹھو گونٹھو' بھی کرتا ہے۔ چوں کہ یہ ناول قسط وار شائع ہوتا رہا اس وجہ سے کسان کے مسائل کو اس میں وسیع پیرایے میں پیش نہیں کیا گیا ہے لیکن اس زمانے میں زمین کے بغیر ایک مزدور کی کیا حالت ہو سکتی ہے ان مسائل کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ آج کے زمانے میں اگر کسی کی زمین چھین لی جائے تو وہ زندگی دوسرے طور سے جی سکتا ہے۔ مگر اس زمانے میں زمین کے بغیر جینا اس طرح تھا جیسے پانی کے بغیر مچھلی۔ گئودان میں ہوری اپنے برسوں کے ارمان یعنی ایک گائے کے لیے کسان سے مزدور بن جاتا ہے۔ 'چھو مانڑو آٹھو گونٹھو' میں بھگیا اور ساریا ایک اولاد کی خواہش میں اپنی زمین سے ہاتھ دھو جاتے ہیں۔

گاؤں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں گائے کی اہمیت، نجی ملکیت کے سبب باہمی رقابتیں، جھگڑے، تفریق، تباہی اور بربادی کو گؤدان کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ ناول کا عنوان ہی گائے کی اہمیت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ عام طور پر گائے دودھ دیتی ہے جس سے گھر کے افراد پرورش پاتے ہیں اور اس کے بچھڑے کاشتکاری کا اہم ترین ذریعہ بنتے ہیں۔ اس فائدے کو پریم چند یوں ظاہر کرتے ہیں:

''ابھی پہلا ہی بیانا ہے۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ دے گی۔ سیر بھر تو گوبر ہی کو چاہیے۔ روپا دودھ دیکھ کر کیسی للچاتی رہتی ہے۔ اب پیے جتنا چاہے۔ کبھی کبھی دو چار سیر مالکوں کو بھی دے آیا کروں گا۔'' (گئودان، ص 33)

مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی گائے کی موجودگی، آسودگی اور روحانی سکون بخشتی ہے۔ انھی خیالوں کے تحت دیہات کا ہر فرد گائے پالنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ مذہبی عقیدہ بھی ہے۔ ہوری سوچتا ہے:

''گئو سے تو درواجے کی سوبھا ہے۔ سیرے سیرے گئو کے درسن ہو جائیں تو کیا کہنا۔ نہ جانے کب یہ سادھ پوری ہوگی وہ سبھ دن کب آئے گا۔ (گئودان، ص 8)

'چھو مانڑو آٹھو گونٹھو' میں بھوگیا اور ساریا کی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک گائے کو اولاد کی طرح پرورش کرتے ہیں۔ جس کا نام نیتو ہے۔ جب منگوراج گائے کو اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور پھر گئو ماتا کو بیچ دیتا ہے۔ اس موقع کو اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''آوارہ بیلوں کو منگوراج حفاظت میں رکھتا ہے۔ کوئی کوئی گائے لاکر انعام لے جاتے ہیں۔ بیل چھوڑ کر گائے تین سو سے زیادہ ہیں۔ گئوماتا کو باہر گھومنے سے تکلیف ہوگی اس وجہ سے اپنی حفاظت میں رکھتے ہیں۔ جب زیادہ سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو قصاب کو دینا پڑتا ہے۔'' (چھو مانڑو آٹھو گونٹھو، ص 29)

پریم چند نے گئودان میں عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل، ان پر ظلم اور ان کی مجبوری کو نسوانی کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں جہاں عورت کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے کردار میں نمایاں کیا گیا ہے وہیں سچائی، حقوق اور قومی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہوا بھی دکھایا گیا ہے۔ انھوں نے اس کی معاشی غلامی، سماجی پستی اور اس غیر انسانی رویے کے خلاف جو مرد اس پر روا رکھتا رہا ہے، اس کی مخالفت کی ہے۔ اس ناول میں عورت کی آزادی پر سوال اٹھتا ہے۔ وہ صرف خاموش رہنے کی عادی نہیں بلکہ اپنی رائے اور حقوق کو پانے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس کی رہنمائی مس مالتی کرتی ہے۔ ایک جگہ بولتی ہے:

''نہیں خود کو مٹانے سے کام نہیں چلے گا۔ عورت کو سماج کی فلاح کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اسی طرح جیسے ان کسانوں کو اپنی حفاظت کے لیے اپنی اس فرشتہ خصلتی کو ترک کرنا پڑے گا۔'' (گئودان، ص 394)

اسی طرح مینا کسی اپنے شوہر سے بدلہ لیتی ہے۔

وہیں گوبندی اپنے شوہر کے ظلم کو چپ چاپ سہتی ہے۔ شہری عورتوں کے علاوہ دیہاتی عورتوں کی نمائندگی دھنیا کرتی ہے۔ خود پر اور اپنے پریوار پر ہوئے ظلم کی مخالفت کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ ہوری سے پٹتی ہے۔ پھر بھی وہ خاموش نہیں رہتی۔ اسی طرح روپا کی زندگی ایک وحشت ناک ہے۔ غریبی کی وجہ سے ادھیڑ عمر کے مرد کے ساتھ ساری زندگی کاٹنے پر مجبور ہے۔ سلیا داتا دین کے کھیت پر کام کرتی ہے۔ داتا دین اسے رکھیل بنالیتا ہے۔ اس کو صرف کھانا اور کپڑا ملتا تھا۔ داتا دین محض جانوروں کا سا تعلق رکھتا تھا۔ جس میں انسانیت وشرافت کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کی طرح نسوانی طبقہ بھی صدیوں سے ظلم وزیادتی کا شکار رہا ہے۔ پریم چند نے ہمیشہ مرد اور عورتوں کو ایک ترازو کے دو پلے کے روپ میں دیکھنا چاہا۔ اس وجہ سے عورتوں کے اوپر ہوئے ظلم کی انھوں نے مخالفت کی ہے۔

گئودان کی طرح فقیر موہن نے 'چھو مانڑو آٹھو گونٹھو' میں صرف تین نسوانی کردار پیش کیے ہیں۔ تینوں کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ساریا کا کردار ان عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے جس کی گود اولاد سے محروم ہے اور اس وجہ سے اسے ہمیشہ طعنہ سننا پڑتا ہے۔ ساریا نے اس ظلم سے خود کو بچانے کے لیے حد پار کردی جس کے بعد اس کی زندگی تباہ ہوگئی۔ ساریا کا نہ کسی سے جھگڑا ہے نہ کسی سے شکایت وہ تو بس اپنی اولاد کی طرح گائے نیتو اور شوہر بھوگیا کے ساتھ خوش تھی۔ اس کی زندگی میں بس اسی کمی کا سب بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسرا کردار سانتانڑی (بی بی صاحبہ) کا ہے جو صرف نام کو اب سانتانڑی ہے۔ اس کے متعلق فقیر موہن لکھتے ہیں:

''وہ دل میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ شوہر کی خدمت بیوی کا فرض ہے۔ اس خدمت سے خوشی ملتی ہے۔ صرف شوہر کی خدمت نہیں بلکہ انسان کی مدد کو بھی وہ خوشی کا باعث سمجھتی تھی...... اس کے پاس صاف اور میلا سب برابر ہے۔ ان کو جو عزت دے وہ بھی اچھا جو نہ دے وہ بھی اچھا۔'' (چھومانڑو آٹھو گونٹھو، ص: 73)

'چھومانڑو آٹھو گونٹھو' میں سب سے اہم نسوانی کردار چمپا کا ہے۔ ناول کے شروع سے آخر تک وہ ان کرداروں کی نمائندگی کرتی ہے جو ہمیشہ اپنے فائدے کی سوچتے ہیں اور اس کے لیے وہ کسی حد تک جاسکتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لکھے گئے ناولوں میں عورتوں پر ہمیشہ مرد کو ظلم کرتے دکھایا گیا ہے۔

لیکن فقیر موہن گاؤں کی عورتوں کی فطرت سے بہت ہی قریب سے واقف نظر آتے ہیں۔ اس کردار سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ظلم آدمی آدمی پر کرتا ہے۔ جس طرح مظلوم عورت یا مرد ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح عورت یا مرد بھی ظالم ہوسکتے ہیں۔ اس کی نمائندہ چمپا ہے۔ کبھی وہ مشورہ دے کر بھوگیا اور ساریا کی زمین چھین لیتی ہے تو کبھی خالہ کا روپ بدل کر گھر جلادیتی ہے اور آخر میں جس کی نوکرانی رہی، جس کا ہمیشہ نمک کھایا اس کو بھی لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

پریم چند اردو ادب میں ایک اعلیٰ پائے کے فکشن نگار ہیں۔ ان کی تخلیق میں گئودان معرکے کی تخلیق ہے۔ یہ ناول پریم چند کی پوری عمر کی مہارت، مشاہدات، تجربات اور غور وفکر کا نچوڑ ہے۔ اسی طرح 'چھومانڑو آٹھو گونٹھو' فقیر موہن کے نئے تجربات، مشاہدات اور غور وفکر کی ابتدائی کوشش ہے۔ 'چھومانڑو آٹھو گونٹھو' بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی عکاسی کرتا ہے وہیں گئودان اس کے چند سال بعد کے سماج کا مرقع ہے۔ ان چند برسوں کے وقفے میں جو ردوبدل ہوا ہے ان تمام مسائل کو پریم چند نے گئودان میں بخوبی بیان کردیا ہے۔ جہاں گئودان ایک طویل ناول کی حیثیت رکھتا ہے وہیں چھومانڑو آٹھو گونٹھو صرف 126 صفحات پر مشتمل ہے۔

مضمون میں پیش کردہ دونوں ناول دو منفرد زبان پر منحصر ہیں۔ جن میں کئی چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے وہیں چند چیزیں منفرد بھی ہیں۔ ان ناولوں میں انداز بیان منفرد ہے۔ گئودان ایک مکمل کتاب کی شکل میں منظر عام پر آیا جبکہ چھومانڑو آٹھو گونٹھو رسالہ اتکولو ساہتیہ میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد میں اس کو کتابی شکل دی گئی۔ گئودان ایک ضخیم ناول ہے اور چھومانڑو آٹھو گونٹھو مختصر ناول ہے۔ دونوں ناول اپنی ریاستوں کے اس زمانے کا احاطہ کرتے ہیں جہاں کسان اور مزدور جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم کے عادی بن چکے تھے۔ ان دونوں ناولوں کا موضوع مشترک ہے۔ دونوں ناولوں میں بیان کیے گئے کئی مسائل مماثلت رکھتے ہیں۔ جیسے زمین کا مسئلہ، گائے کا مسئلہ، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ، لیکن ان مسائل کو پیش کرنے اور ان سے نجات یا ان کا حل پیش کرنے کا انداز جداگانہ ہے۔ گئودان میں کہانی کے ذریعے کردار کو پیش کیا گیا ہے جب کہ چھومانڑو آٹھو گونٹھو میں کردار کے ذریعے کہانی کا ارتقا ہوتا ہے۔ گئودان کا خاتمہ المیے پر ہوتا ہے اور چھومانڑو آٹھو گونٹھو میں بھی ناول کا خاتمہ المیہ ہے لیکن اس میں برائی کا خاتمہ دکھایا گیا ہے یعنی جیسی کرنی ویسی بھرنی لیکن گئودان کا نتیجہ اس کے برعکس ہے۔ وہ کسان کو مجبور دکھاتے ہیں۔ یہاں ایک بات صاف کھٹکتی ہے۔ چھومانڑو آٹھو گونٹھو بیسویں صدی کی ابتدا میں لکھا گیا ناول ہے۔

> **گئودان ایک ضخیم ناول ھے اور چھومانڑو آٹھو گونٹھو مختصر ناول ھے۔ دونوں ناول اپنی ریاستوں کے اس زمانے کا احاطه کرتے ھیں جھاں کسان اور مزدور جاگیردارانه، سرمایه دارانه نظام کے ظلم کے عادی بن چکے تھے۔ ان دونوں ناولوں کا موضوع مشترک ھے۔ دونوں ناولوں میں بیان کیے گئے کئی مسائل مماثلت رکھتے ھیں۔ جیسے زمین کا مسئله، گائے کا مسئله، جاگیردارانه اور سرمایه دارانه نظام وغیره، لیکن ان مسائل کو پیش کرنے اور ان سے نجات یا ان کا حل پیش کرنے کا انداز جداگانه ھے۔ گئودان میں کھانی کے ذریعے کردار کو پیش کیا گیا ھے جب که چھومانڑو آٹھو گونٹھو میں کردار کے ذریعے کھانی کا ارتقا ھوتاھے۔**

اس میں بھی شہری دیہاتی زندگی دونوں کا بیان ہے جب منگوراج ساریا کا قتل کردیتا ہے اور گاؤں کا پہرہ دار رام چندر داروغہ کو اطلاع کرتا ہے۔ منگوراج کا مقدمہ کورٹ میں چلتا ہے اور نتیجہ بھی سنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس گئودان 34 سال بعد منظر عام پر آیا۔ اس میں بھی شہری اور دیہاتی زندگی دونوں شامل ہیں۔ بلکہ شہری زندگی ایک بڑے پیمانے پر سامنے آتی ہے۔ ہیرا کے زہر دینے سے گائے کی موت پر داروغہ بھی آتا ہے لیکن کسانوں پر اتنے ظلم وزیادتی کے باوجود کہیں بھی تھانے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہاں قاری سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ فقیر موہن 34 سال قبل جس تجربے سے گزر چکے تھے 34 سال بعد پریم چند کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ پائی۔

■

Salauddin Saha
A-66, Christian Colony,
Opp Moris Nagar Police Satation
Delhi - 110007
Mob.:7396689934
Email.: salluodisha@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

اردو-ہندی لغت

مصنف/ ادارہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
صفحات: 416، قیمت: 150، اشاعت ثالث: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A تیسری منزل، فاطمہ اپارٹمنٹ جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں نے ایک ہی کوکھ یعنی کھڑی بولی کے بطن سے جنم لیا ہے اور دونوں جدید ہند آریائی زبانیں ہیں نیز دونوں نے اسی ہندوستان کی سرزمین میں آنکھیں کھولی ہیں دونوں کی پرورش و پرداخت اور نشو نما تقریباً ایک ساتھ ہی ہوئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ دونوں نے ترقی کے منازل بھی ایک ساتھ ہی طے کیے۔ یہ دونوں زبانیں اپنے قواعدی اصول و ضوابط اور صوتیاتی ساخت کے اعتبار سے اس قدر قریب تھیں کہ ایک ہی زبان معلوم ہوتی تھی لیکن لغوی اعتبار سے دونوں زبانوں نے متعدد ذرائع سے الفاظ، تراکیب، محاورات، ضرب الامثال وغیرہ اس قدر مستعار لیا کہ دونوں کی زبان اور ان کی شناخت علاحدہ علاحدہ زبان کے طور پر مسلم ہوگئی۔ اردو زبان نے فارسی اور عربی سے الفاظ مستعار لیے اور ہندی نے سنسکرت سے۔ دونوں زبانوں کا رسم الخط بھی الگ الگ ہے۔ اردو کا عربی اور فارسی اور ہندی کا دیوناگری۔ یہ لغت بھی انھیں دونوں رسم الخط میں ہے جس میں اردو کے مشکل الفاظ، تراکیب، اصطلاحات کے معنی ومفہوم کو ہندی زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ نہ صرف اردو کے طلبا، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس اس سے مستفید ہوں بلکہ وہ لوگ بھی جو ہندی سے واقفیت رکھتے ہیں لیکن اردو کے مشکل الفاظ کی تفہیم میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں بھی اس سے فائدہ حاصل ہو۔ یہ لغت ان اساتذہ کے لیے بھی انتہائی مفید ہے جو مختلف علوم وفنون میں سہ لسانی فارمولے کے تحت لینگوا فرینکا کی زبان کا استعمال کرکے درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں نیز ان ریسرچ اسکالرس کے لیے بھی جو اپنی تحقیقی خدمات انجام دیتے ہوئے مشکل الفاظ وتراکیب اور ان کے معنی کی تفہیم سے دوچار ہوتے ہیں۔

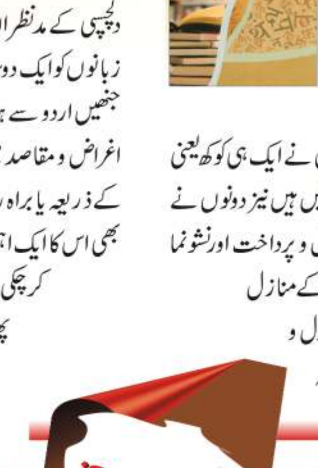

اس لغت کو تیار کرنے کا ایک مقصد جہاں دونوں زبانوں کے جاننے والوں کی دلچسپی کے مدنظر ان کے افہام وتفہیم کے مسائل کو دور کرنا ہے وہیں دوسرا مقصد دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے ساتھ ان ماہر مترجمین کو بھی مدد پہنچانا ہے جنھیں اردو سے ہندی میں کہیں کہیں ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ چونکہ قومی کونسل کے اغراض ومقاصد میں جہاں مختلف زبانوں میں پیش کردہ علوم وفنون کو اردو میں ترجمے کے ذریعہ یا براہ راست منتقل کرنا شامل ہے وہیں لغت سازی یا تدوین لغت کا منصوبہ بھی اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ اسی اہم منصوبے کے تحت کونسل اب تک متعدد لغات تیار کرچکی ہے۔ کونسل کی چونکہ ایک دیرینہ خواہش ہے کہ اردو کو پورے ملک میں پھیلایا جائے اور ادارہ اس کے لیے مسلسل کوشاں بھی ہے۔ اردو- ہندی لغت اسی کوشش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس لغت کی طرح اور دوسرے لغات کی تیاری کے سلسلے میں کونسل نے جو منصوبہ بنایا ہے اس کا ذکر ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ اور مسرت جہاں نے اپنے مقدمے میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت مختلف ذولسانی لغات کا خاکہ تیار کیا جن میں اردو- ہندی، اردو-انگریزی، اردو-تامل، اردو-تیلگو، اردو- کنڑ، اور اردو- بنگالی سرفہرست ہیں۔ یہ لغات ان لوگوں کے لیے کارآمد ثابت ہوں گی جو یہ زبانیں جانتے ہیں اور اردو سیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔''

قومی کونسل نے انھیں مقاصد کے پیش نظر زیر تبصرہ اردو-ہندی لغت کو تیار کیا ہے۔ اس لغت کو تیار کرنے میں جن اہم امور کی طرف توجہ دی گئی ہے ان میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے 'کہ اگرچہ دونوں زبانوں کے افعال مشترک ہیں، پھر بھی دونوں زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ کے اپنے لسانی اور تہذیبی امتیازات ہیں۔ اس لغت میں فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات کے مانوس اور اساسی الفاظ شامل کیے گئے ہیں تلفظ بھی انھیں لغات پر مبنی ہے۔' اس لغت میں تقریباً 15678 الفاظ شامل ہیں جن میں اردو کا

تلفظ دیوناگری رسم الخط میں دیا گیا ہے اور قوسین میں اردو الفاظ کی قواعدی حیثیتوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ لغت الف بائی ترتیب پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون میں استعمال ہونے والے الفاظ کی نشاندہی کے لیے ہندی میں مخففات کا استعمال بطور علامت کیا گیا ہے تاکہ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ یہ ترکیب، اصطلاح یا لفظ کس مضمون کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے قاری کے افہام و تفہیم کا مسئلہ آسان ہوگیا ہے مثلاً ارتھ شاستر کے لیے 'ارتھ' اتہاس کے لیے 'اِتی' کمپیوٹر وگیان کے لیے 'کمپیو' گرِت کے لیے 'گا' چِکتسا کے لیے 'چکی' 'جَن سَنچار کے لیے 'جا' وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لغت عام اردو لغات سے ہٹ کر ہے کیونکہ اس میں ایک ہی قبیل کے تمام الفاظ کو شامل کرنے کے بجائے مختلف مضامین میں شامل مشکل الفاظ کے معنی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے بقیہ عام بول چال کی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کو اس میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے یہ لغت ان حضرات کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی جنھیں اردو کے ساتھ ہندی زبان پر بھی گرفت ہے یا جو تحقیق و تنقید کے ساتھ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ یہ لغت ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ اس لغت کی تیاری میں کونسل کے ساتھ جن لوگوں کی کاوشیں شامل رہی ہیں ان سب کو مبارکباد۔ امید ہے علمی حلقوں میں پہلے کی طرح اس کی مزید پذیرائی ہوگی۔

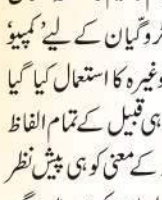

مغربی تعلیم اور مسلمان

مصنف: مسرور علی اختر ہاشمی

صفحات: 240، قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: سمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کسی بھی قوم کی ترقی میں تعلیم کا کلیدی رول رہا ہے۔ جس قوم نے تعلیم کو اختیار کرلیا اس کی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کے تعلیمی نظام کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے جہاں روایتی تعلیم کا نظام تھا وہیں انگریزوں کی آمد کے ساتھ مغربی تعلیم اور تہذیب نے ہندوستانی نظام تعلیم میں ایک تبدیلی بھی پیدا کی۔ 1857 کے ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے یہاں تعلیمی نظام میں خاص تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ 1857 کے بعد ہندوستان کی سیاست کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ تعلیم کے میدان میں بھی کئی نئے چیلنجز سامنے آئے۔ مذکورہ کتاب میں انہی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

مسرور علی اختر ہاشمی کی یہ کتاب بنیادی طور پر انگریزی میں Muslim Response to Western Education کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوئی تھی، بعد میں لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔

زیر تبصرہ کتاب کو مصنف نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ تعارف، نتائج اور کتابیات بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کا پہلا باب 'برطانوی دور میں تعلیم کی نشوونما' ہے۔ برطانوی دور کی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے مسرور علی اختر ہاشمی نے لکھا ہے کہ 1781 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس وقت کے گورنر ہیسٹنگز نے کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ وہ عام انگریزوں کے مقابل مشرقی تہذیب اور مشرقی علم و ادب کا شائق تھا۔ چونکہ گورنر ہیسٹنگز خود عربی فارسی پر قدرت رکھتے تھے اس مناسبت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدرسہ کے قیام کا مقصد بھی ہندوستانی زبان و ادب کے ساتھ مذہبی تعلیم کا فروغ رہا ہوگا۔ کلکتہ مدرسہ کے قیام کے دس برس بعد بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد ڈالی گئی جس کا مقصد ہندوؤں کے مقدس شہر میں ان کے قانون، ادب اور مذہب کی آبیاری اور تحفظ کو یقینی بنانا تھا۔ ان دونوں اداروں کے قیام کا مقصد تھا کہ عدالتی نظام کو بہتر بنانے میں ہندو مسلم کی یکساں شمولیت کو یقینی بنایا جاسکے۔ برطانوی دور میں تعلیم کو لے کر کچھ تجاویز بھی پیش کیے گئے تھے جس میں مڈل اسکول کے قیام، مرکزی مقامات پر یونیورسٹی کے قیام اور تربیت یافتہ اساتذہ کی بحالی پر زور ملتا ہے۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے لکھا ہے کہ عیسائی مشنری کی تعلیمی سرگرمی کا مقصد تبدیلیٔ مذہب تھا اور انھوں نے اس بات سے کبھی انکار بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے بعد کے دنوں میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے عدم تعاون تحریک کے زیر اثر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

زیر مطالعہ کتاب کا دوسرا باب 'دار العلوم دیوبند' ہے۔ 1857 کی ناکام جنگ آزادی کے ایک دہائی بعد ہی دار العلوم کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے دار العلوم کے بانی اور قیام کے پس منظر پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دار العلوم کے قیام کا خاص مقصد مذہب، تہذیب اور ثقافت کو محفوظ رکھنا تھا۔ ابتدا میں دار العلوم نے عملی سیاست کو بہت اہمیت دی۔ بنیادی طور پر دار العلوم کے قیام کے مقاصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسرور علی اختر ہاشمی نے لکھا ہے کہ مدرسے کا قیام مسلمانوں کو قرآن، تفسیر، حدیث اور کلام کی تعلیم دینے کے ساتھ طلبا کی زندگی میں اسلامی نظام وضبط پیدا کرنا، سرکار کے اثر سے گریز اور آزادیٔ خیال و عمل قائم رکھنا اور مذہبی علوم کی ترویج و اشاعت اور مختلف مقامات پر عربی مدارس کا قیام تھا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے دار العلوم کے نصاب تعلیم کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب 'ایم اے او کالج علی گڑھ' ہے۔ دیوبند نے جہاں مشرقی تعلیم کی جانب توجہ دی وہیں ایم اے او کالج نے ابتدا سے ہی جدید تعلیم اور جدید رجحانات کو اختیار کیا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے لکھا ہے کہ ایم اے او کالج ابتدا سے ہی برطانیہ موافق تھا اور یہاں انگریزوں کو اعزازی حیثیت حاصل تھی۔ یہی نہیں انھوں نے لکھا ہے کہ دیوبند اور علی گڑھ میں تقریباً تمام ہی معاملات میں اختلافات تھے، حالانکہ یہ بات درست ہے کہ دونوں ہی اداروں کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی تہذیبی اور تعلیمی تربیت تھا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے کالج کو ملنے والے عطیات کے ساتھ نصاب کے بارے میں بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

مذکورہ کتاب کا چوتھا باب 'دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ' ہے۔ ہندوستان میں تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ 1857 کے انقلاب کے بعد اس میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ تبدیلی رونما ہوئی۔ 1866 میں جہاں دار العلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، وہیں 1875 میں ایم اے او کالج علی گڑھ کا قیام ہوا اور 1898 میں ندوۃ العلما کی شکل میں ایک بڑا دینی ادارہ وجود میں آیا۔ ندوۃ العلما ایک معنی میں دار العلوم دیوبند کے جیسا ہی تھا کہ دونوں ہی دینی ادارے تھے، مگر شہری سماجی فضا، اصلاح نصاب اور انگریزی حکومت کی کے موافقت نے اسے علی گڑھ سے قریب کردیا۔ دراصل دیوبند میں جدید سائنس اور انگریزی زبان کے سلسلے میں ایک قسم کی سختی تھی، یہی نہیں سیاست کے معاملے میں بھی دیوبند کے یہاں سختی ملتی ہے وہ کسی بھی طور پر انگریزوں کی موافقت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ندوۃ العلما کے مقاصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسرور علی اختر ہاشمی لکھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی، نظام تعلیم میں اصلاح، تبلیغ اسلام، باہمی اختلافات کو دور کرنا، اہل اسلام کی فلاح کی فکر، مسالک کی وجہ سے پیدا ہورہی خلیج کو ختم کرنے کے ساتھ علما سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے لکھا ہے کہ ندوۃ العلما اور علی گڑھ میں فکری طور پر کئی چیزیں مشترک تھیں۔ دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ ندوہ نے مذہبی تعلیم پر زور دیا مگر نصاب میں لبرل آرٹس کو بھی رکھا، وہیں علی گڑھ نے جدید تعلیم پر زور

دیااور دینیات کوبھی نصاب میں شامل رکھا۔

کتاب کا پانچواں باب 'جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی' ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام 1920 میں ہوا تھا۔ اس ادارے کا قیام عدم تعاون تحریک کے زیر اثر ہوا۔ ابتدا میں اس ادارے کا خرچہ خلافت کمیٹی نے اٹھایا۔ یہ سلسلہ 1923 تک جاری رہا، اس دوران جامعہ کا مقصد سیاسی زیادہ تھا مگر گزرتے وقت کے ساتھ یہ ایک تعلیمی ادارے کی شکل میں ابھرا۔ مسرور علی اختر ہاشمی نے جامعہ کے قیام اور عروج کا سلسلے وار جائزہ لیا ہے۔ یہی نہیں نصاب تعلیم اور بانیان کی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

مجموعی طور پر زیر نظر کتاب 'مغربی تعلیم اور مسلمان' کئی اعتبار سے اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہم مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے قیام، ان کے مقاصد سے واقف ہوتے ہیں وہیں اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم اور نظام تعلیم اور ان کی ترجیحات کا علم ہوتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ خوبی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر نہایت عمدہ کتاب شائع کرتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔

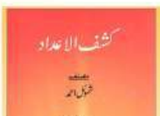

کشف الاعداد

مصنف: شموئل احمد

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عرش منیر، D-61، لنٹن اسٹریٹ، کولکاتا۔ 700014

علم نجوم کی ایک شاخ علم الاعداد ہے۔ اسے انگریزی میں Pseudoscientific علم بھی کہا جاتا ہے۔ شموئل احمد کی زیر نظر کتاب 'کشف الاعداد' علم الاعداد کے ماہرین کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فلسفۂ اعداد کے ان مخفی گوشوں پر بحث کرتی ہے جس کے مطابق پوری دنیا ایک حسابی تفاعل یا Arithmancy کے زریعہ غیب گوئی کی مہارت پر گھومتی ہے اور اس کے تمام اعمال ان اعداد کی غیبی خاصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ہر چیز کو اعداد میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ عدد کی اپنی اہمیت ہے جسے خالق کائنات نے بھی بہ نفس نفیس تسلیم کیا ہے۔ شموئل احمد نے اعداد کی تفہیم کے لیے ان تمام علوم کا مطالعہ کیا ہے جن سے انھیں اعداد کی تفہیم کے مزید در وا ہوتے نظر آئے ہیں ویدک مکتبہ فکر۔ ٹیرو کارڈ۔ عبرانی طریقہ کار اور حکیم فیثا غورث جسے بابائے ریاضی بھی کہا جاتا ہے ان کے افکار و خیالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ مسلمان فلسفی اور عالموں نے بھی اعداد کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس علم کو اپنے افکار کی روشنی میں مزید پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے شموئل احمد کی تخلیق میں ان افکار کے مطالعہ نے بھی اپنے نقوش ثبت کیے ہوں گے۔ بقول شموئل احمد ''یہ میری تحقیق کا ثمر ہے۔ ٹیرو کارڈ کی مدد سے عدد کی داخلی تصویر تک پہنچنے کی کوشش میں میری تحقیق بھی شامل ہے...''

جہاں تک جدید ریسرچ بتاتی ہے کہ ہمارے خیالات ذہن یا دماغ کی ایک مخفی استعداد سے جنم لیتے ہیں جہاں توانائی کی فریکوئنسی وقفوں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جس کی جانچ سوائے عددی سانچے کے ممکن ہی نہیں ہے۔ بہرحال کشف الاعداد اپنی نوعیت کی منفرد تحریر ہے۔ امید ہے کہ علم نجوم اور علم الاعداد سے دلچسپی لینے والے یا اس علم پر تحقیق کرنے والے طلبا و طالبات کے لیے یہ کتاب بہت معاون ثابت ہوگی.... شموئل احمد نے تشکیل زائچہ کے حوالے سے بھی کافی مدلل گفتگو کی ہے۔ کسی فرد کی پیدائش کی تاریخ، سال، ماہ، دن، برج، نام کا عدد (عبرانی)۔ ان کے بنیادی نمبروں کو جمع کرنے کے بعد یہ یہ دیکھنا ہے کہ کس نمبر کی تکرار ہوئی ہے اس سے اس فرد کی زندگی کے اہم سال دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ شخص کی زندگی کا محاسبہ ان اعداد کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زندگی میں پیش آنے والے خوشگوار لمحات اور حادثات کچھ بھی آپ ان اعداد کی الگ الگ ترتیب سے بآسانی جان سکتے ہیں آنے والے خطرے سے آگاہ بھی ہوسکتے ہیں، مثالوں کے ذریعہ بالکل آسان اور دلچسپ انداز میں شموئل احمد نے سمجھایا ہے۔ اگر اسے مزید آسان زبان میں سمجھنا ہے تو ایسا سمجھنا چاہیے کہ زائچہ ایک قسم کا آسمانی عکس ہے جس میں دیے گئے وقت اور مقام کے حوالے سے سورج۔ چاند اور سیارگان کی بارہ بروج اور بارہ گھروں میں پوزیشن دی ہوئی ہے۔ زائچۂ پیدائش علم الاعداد کی مدد سے بنوا کر انسان اپنے حال۔ مستقبل اور ماضی کے تعلق سے کسی بھی سوال کا جواب جان سکتا ہے۔ اردو میں اسے زائچہ۔ عربی میں مخططات الابراج۔ سنسکرت میں راشی چکر۔ ہندی میں کنڈلی اور انگریزی میں ہوروسکوپ Horoscope کہتے ہیں... مغربی مفکروں یا علم الاعداد کے ماہرین کی نظریات پر بھی شموئل احمد نے فیثا غورث کے افکار کی روشنی میں عالمانہ بحث کی ہے۔ بقول ان کے مغرب میں علم الاعداد حکیم فیثا غورث کے افکار پر مبنی ہے۔ جبکہ مغرب کے بیشتر علم الاعداد کے ماہرین Pythagoras کے سر علم الاعداد کی ایجاد کا سہرا رکھتے ہیں۔ پائتھا گورس ایک فلسفی تھا جو B.C 569 کے قریب یونان میں پیدا ہوا تھا۔ مغرب میں اس علوم پر کافی تحقیق کرنے کے بعد اس علم سے متعلق کچھ اصول و ضوابط بھی متعین کیے گئے ہیں یہاں نام کے عدد کے مختلف درجات ہیں جس کی روشنی میں انسان کی شخصیت اس کی خوبیاں۔ خامیاں اس کی زندگی کے واقعات کا احاطہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ علم الاعداد کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس کے ذریعہ بعض گتھیاں بھی سلجھائی جاسکتی ہیں۔ جس کو سلجھانے سے تاریخ انسانی قاصر ہے۔ علم الاعداد ایک مسلمہ علم ہے اور اعداد کی گرفت سے کوئی شخص باہر نہیں ہے، انھیں حقائق کا جائزہ شموئل احمد نے بہت ہی مفصل انداز میں مثالوں کے ذریعہ لیا ہے۔ پڑھنے والے کے لیے یقیناً یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہوگی بہت ممکن ہے کہ علم الاعداد کی طلسمی دنیا کی سیر کرتے ہوتے کوئی بھی اس علم کا اسیر ہوسکتا ہے۔ بنیادی طور پر اعداد کا سلسلہ ا سے لے کر 9 تک ہے یہ مفرد اعداد کہلاتے ہیں۔ جبکہ کسی نام یا کسی شے کے نام کے مرکب اعداد بھی لیے جاسکتے ہیں۔ ایک آدمی کے ساتھ مرکب اور مفرد اعداد کی تاثیرات کا تعلق رہتا ہے۔ ویسے علم الاعداد غیب کا علم قطعی نہیں ہے اس کے زریعہ بہتر راہ متعین کرنے کی کوشش قطعی غیر شرعی نہیں ہے۔ ہماری زندگی ہو یا کرہ ارض پر موجود چاہے وہ ذی روح ہے یا جامد و ساکت اجرام فلکی ہر شے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

احمد یوسف کے افسانے: فکر سے فن تک

مصنف: ڈاکٹر آصف سلیم
صفحات: 240، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: محمد ذاکر حسین، خدابخش لائبریری، پٹنہ بہار

احمد یوسف نے آزادی کے فوراً بعد لکھنا شروع کیا اور ترقی پسندی کی سیر کرتے ہوئے جدیدیت تک پہنچے۔ ستر کی دہائی میں دبستان عظیم آباد فکشن کے باب میں بایں طور اہمیت رکھتا ہے کہ اس دور کی افسانہ نگاری میں اس کی سب سے اہم اور بڑی حصے داری تھی۔ دبستان عظیم آباد کا یہ ماحول بلاشبہ بہار کی افسانہ نگاری کی تثلیث کہے جانے والے غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور احمد یوسف کی کوششوں سے تیار ہوا تھا۔ غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کے فکر وفن کے تعلق سے باتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن احمد یوسف کی افسانہ نگاری پر ہر طرف سناٹا ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس مہیب سناٹے اور مکمل سکوت کو توڑتے ہوئے ایک توانا آواز ابھی حال ہی میں احمد یوسف کے تعلق سے ادبستان میں بلند ہوئی ہے جو تمام گلے شکوے کا مداوا ہے۔ وہ آواز ہے ڈاکٹر آصف سلیم کی، ایک جانا پہچانا نام، جو شاعری اور افسانے کی پرکیف وادیوں کی سیر کرتے ہوئے تحقیق وتنقید کی محفل میں براجمان ہو گئے ہیں اور جنھیں احمد یوسف سے قلبی لگاؤ ہے اور ان کے فکر وفن سے خاصے متاثر بھی ہیں۔ احمد یوسف کی حیات ہی میں وہ ان پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ وفات کے بعد ہی سے میں بار بار ان سے تقاضا کرتا رہا کہ 'بزرگوار' کا قرض ہم میں سے کوئی بھی ادا نہیں کر رہا ہے، آپ ہی سے امید کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے پورے اعتماد سے کہا تھا کہ مایوسی نہیں ہوگی۔ واقعی انھوں نے مایوس نہیں کیا اور 'احمد یوسف کے افسانے: فکر سے فن تک' کی شکل میں ایک انمول اور قیمتی تحفہ علمی وادبی دنیا کو عطا کیا۔

کتاب بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں 'احمد یوسف: ایک تعارف' کے عنوان سے احمد یوسف کے احوال وکوائف اور ادبی زندگی کو جامع انداز میں بڑی تحقیق سے پیش کیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ظاہر ہے مصنف نے اپنا دائرہ کار احمد یوسف کے افسانوں تک ہی محدود رکھا ہے۔ حالانکہ تعارف میں صاحب تذکرہ کے تمام علمی وادبی اور تحقیقی وتنقیدی پہلو کی شمولیت ایک مستحسن عمل ہے۔ افسانے کے علاوہ احمد یوسف کی شخصیت کے دیگر پہلو بھی لازمی طور پر شامل ہونے چاہیے تھے تاکہ ان کی شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آسکے۔ مگر اس کی تلافی مصنف نے اردو ڈائریکٹوریٹ، بہار سے شائع شدہ مونوگراف میں کردی ہے۔

دوسرے حصے میں 'تجزیے' کے عنوان سے احمد یوسف کے تین افسانوی مجموعوں: روشنائی کی کشتیاں، آگ کے ہم سائے، 23 گھنٹے کا شہر، میں شامل تمام افسانوں اور چوتھے افسانوی مجموعے 'رزم ہو یا بزم ہو' کے آدھے افسانوں کے ایک ایک پہلو اور اس کے مضمرات کو بڑے سلیقے اور دانش مندی سے قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ احمد یوسف کے افسانوں کے تعلق سے عام طور پر یہ باتیں کہی جاتی ہیں کہ ان کے افسانے مبہم، غیر واضح، استعاراتی، تمثیلی اور تجریدی لبادے میں پروئے ہوتے ہیں اور داستانی لب ولہجے کی کڑیاں اتنی بکھری ہوئی ہوتی ہیں کہ جس کے سبب قاری کو ذہنی کسرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن ڈاکٹر آصف سلیم نے جس انداز میں احمد یوسف کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا ہے، اس سے خود بخود مذکورہ خیال کی تردید ہوجاتی ہے۔

تیسرے حصے میں 'مجموعی احوال' کے عنوان سے دوسرے حصے کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ خلاصہ بہت ہی جامع ہے جس کے مطالعے سے بیک نظر احمد یوسف کی شخصیت اور ان کی افسانہ نگاری کے خدوخال واضح ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر آصف سلیم نے احمد یوسف کے افسانوں میں پنہاں پیغام کو نہ صرف وضاحت سے بیان کیا ہے بلکہ ان کے مفاہیم ومطالب کی تشریح کرتے ہوئے ان کے موضوعات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح احمد یوسف کے افسانوں کی تفہیم بہت آسان ہوگئی ہے اور اردو افسانہ نگاری میں احمد یوسف کے مقام ومرتبے کے تعین میں بھی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اگر اسے مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جس طرح حالی اور سید سلیمان ندوی نے سرسید اور شبلی کو 'حیات جاوید' اور 'حیات شبلی' کے توسط سے زندہ جاوید کردیا ہے، بالکل اسی طرح احمد یوسف جواب تک ناقدین کی سرد مہری کے شکار تھے، ڈاکٹر آصف سلیم نے ان کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب تفہیم احمد یوسف کا ایک معتبر حوالہ اور مستند ماخذ ہے، اس کے لیے مصنف یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب یقینی طور مقبولیت حاصل کرے گی۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

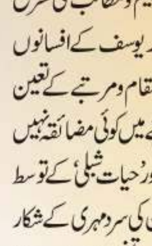

نقد و نظر کے درمیان

مصنف: ڈاکٹر عظیم راہی
صفحات: 200، قیمت: 129 روپے
مبصر: ڈاکٹر شکیل احمد خان
صدر شعبہ انگریزی، انکوش راؤ ٹوپے کالج، جالنہ، مہاراشٹر

عظیم راہی بطور ایک افسانہ نگار، افسانچہ نگار، تبصرہ نگار اور ناقد کے ادبی دنیا میں مقبول ہیں۔ اُنھوں نے رپورتاژ، خاکے اور ریڈیائی فیچرز بھی لکھے ہیں۔ اِس وقت میرے سامنے اُن کی نئی کتاب، 'نقد ونظر کے درمیان' موجود ہے۔ یہ کتاب مصنف کے تبصروں، ادبی مضامین اور رپورتاژ پر مبنی ہے۔ زیر نظر کتاب تنقید کے میدان میں اُن کی پانچویں کتاب ہے۔ بارہ تبصروں، بارہ مضامین اور ایک رپورتاژ پر مشتمل اِس کتاب کی ابتدا میں 'اپنی بات' کے تحت عظیم راہی نے اپنے ادبی سفر، ترجیحات اور پہلی کتابوں پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔

کتاب کا پیش لفظ نامور محقق، شاعر، ادیب، مترجم وناقد اسلم مرزا نے تحریر کیا ہے جو نہ مذکورہ کتاب کے مشمولات کو کوزے میں بند کرتا ہے۔

کتاب میں پہلا تبصرہ مظفر حنفی کے انٹرویوز پر مبنی کتاب 'گفتگو: دوبدو' پر ہے۔ عظیم راہی اپنے تبصروں میں صرف مشمولات کا ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ اُن سے کچھ نتائج اخذ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ جیسے مظفر حنفی کے سوانحی حالات سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ مظفر حنفی کی زندگی غیر محسوس طریقے سے 'نئی نسل کو تحریک دلاتی ہے کہ کوئی بھی بڑا شخص یوں ہی اچانک بڑا نہیں بن جاتا'۔ دوسرا تبصرہ اسلم مرزا کی کتاب 'دکن دیس کی پیش روغزلیں' پر ہے۔ یہاں اُنھوں نے اسلم مرزا کی کتاب کی علمی، تحقیقی، وتاریخی اہمیت وضرورت کو واضح کیا ہے۔ بعدازاں مناظر عاشق ہرگانوی کے سفر پونہ پر مبنی 'پونہ یاترا' پر مختصر ترین تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ 'مٹھی بھر ریت' دیپک بدکی کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ عظیم راہی نے جہاں دیپک بدکی کے کام اور بیشتر افسانچوں کی تعریف کی ہے وہیں کئی باتوں پر اُن سے اختلاف بھی کیا ہے۔ افسانچہ چونکہ عظیم راہی کی خصوصی دلچسپی کا میدان ہے لہٰذا یہاں دیپک بدکی کے حوالے سے فن افسانچہ نگاری کے متعلق خود اُن کے خیالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اِس کے بعد کا تبصرہ بھی افسانچوں کے مجموعہ محمد طارق کولہاپوری کے 'آتش پارے' پر ہے۔ مبصر نے محمد طارق کے موضوعات

سے بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مٹتی ہوئی انسانیت اُن کا اصل دکھ اور موضوع ہے۔ 'یتیم کی آواز' متین اچل پوری کی بچوں کے لیے لکھی گئی چودہ سبق آموز، معلوماتی اور اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ہے جن کی افادیت، سادگی، مقصدیت اور دلچسپی کو مبصر نے تفصیل سے آشکار کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید حسین پالوجی شارب کے افسانچوں کے مجموعے 'بے ساختہ' پر اپنے تبصرے میں عظیم راہی پالوجی شارب کے افسانچوں کی یہ خصوصیت بتاتے ہیں کہ اُن کے افسانچوں میں ''فرسودہ موضوعات سے شعوری طور پر اجتناب اور نئے موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش ہے''۔ مجیب احمد کے افسانوی مجموعے 'دل سے' پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے عظیم راہی محسوس کرتے ہیں کہ مجیب احمد کو ابھی ہنر مندی کی اُن منزلوں سے گزرنا باقی ہے جہاں پہنچ کر قلم کار کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ 'مراٹھواڑہ میں اردو غزل: آزادی کے بعد' محترمہ شاہین فاطمہ کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تلخیص ہے۔ عظیم راہی نے اس کتاب کے مختلف ابواب کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے کتاب کے موضوع، تحقیق اور پیشکش کی تعریف کی ہے۔ فصیح اللہ نقیب کی کتاب 'تاثرات' بقول عظیم راہی مصنف کے تعارفی وتوصیفی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں تاثراتی اور عملی تنقید کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔'' آزادی سے قبل کی مالیگاؤں کی ادبی شخصیتوں میں ایک اہم نام سہیل مالیگانوی کا رہا ہے۔ اُن کے دو شعری مجموعوں سفینہ(1948)اور 'درد و واغ' (1979) کو تلاش کر کے 'سفینہ درد و داغ' کے نام سے احمد عثمانی نے ترتیب دیا ہے۔ عظیم راہی نے سہیل مالیگانوی اور اُن کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے مرتب کی کوششوں کو بھی سراہا ہے۔ 'میمونہ علی چوگلے کا ادبی منظرنامہ' سہ ماہی اسباق کے مدیر نذیر فتح پوری کی کتاب ہے جس میں اُنھوں نے مصنفہ کی مختلف ادبی جہتوں کو موضوع بنایا ہے۔ عظیم راہی نے میمونہ علی چوگلے کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مضامین لکھنے پر زیادہ توجہ دے تو خاتون ناقدین کی کمی کا مداوا ہوسکتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون 'جوگیندر پال کی خدمات کو عقیدتوں بھرا اسلام' مبصر کے پال صاحب سے تعلقات اور اُن کی شخصیت کا احوال ہے۔ عظیم راہی نے واضح کیا ہے کہ جوگیندر پال نے ہی پہلی بار منی افسانہ کے بجائے 'افسانچہ' کی اصطلاح کو استعمال اور رائج کیا ہے۔ رفعت نواز اور ابراہیم اختر مراٹھواڑہ کی افسانوی روایت کے نہایت اہم نام ہیں۔ اُن پر اپنے مضامین میں عظیم راہی نے اُن کے فن پر اظہار خیال کیا ہے اور رفعت نواز کے 'محدود کینوس' اور ابراہیم اختر کے موضوعات پر دیگر اہم ناقدین کی آرا کو بھی پیش کیا ہے۔ اِسی طرح ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی اور ایم مبین کے افسانوں پر بھی دو مضامین لکھے گئے ہیں۔ جن میں اُن کے تعارف کے علاوہ اُن کے افسانوں پر بات کی گئی ہے۔ قاسم رضا پر ایک تعارفی مضمون میں اُنھوں نے موصوف سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا ہے تو ''اردو اور مراٹھی کے لسانی اور تہذیبی رشتہ: کوکن کے حوالہ سے'' میں عظیم راہی نے اردو اور مراٹھی کے رشتوں کو مضبوط کرنے والے کوکن کے ادیبوں کے کاموں کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ 'اردو میں مکتوب نگاری اور جدید ذرائع' ایک طویل، بہترین منضبط، مدلل اور نہایت معلوماتی مضمون ہے جس سے بلاشبہ عظیم راہی کی وسیع معلومات اور تحقیقی نظر کا پتہ چلتا ہے۔

'اکیسویں صدی میں اردو افسانچہ کی صورت حال کا جائزہ' میں عظیم راہی نے افسانچہ نگاری کے فن پر خیالات کا اظہار بھی کیا ہے اور اُسے درپیش مسائل پر گفتگو بھی کی ہے۔ 'سنگ بہ دست' حبیب احمد خان کے شعری مجموعے پر لکھے مضمون میں اُن کا تعارف اور اُن کی نظموں کے موضوعات سے واقف کرایا گیا ہے۔ نورالحسنین پر ایک طویل مضمون میں عظیم راہی نے اُن سے اپنے نجی و ادبی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ مضمون اگرچہ کہ بہت منضبط نہیں ہے لیکن نورالحسنین کی تمام ادبی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ آخری مضمون میں ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی تعلیمی خدمات اور ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے انھیں مبارک باد پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا اختتام بھیونڈی میں ہوئے ایک کتابی میلے پر لکھی گئی رپورتاژ پر ہوتا ہے۔ 'نقد و نظر کے درمیان' کی خوبی یہ ہے کہ اِس مختصر کتاب کو پڑھ کر قاری نہ صرف کئی ہم عصر ادیبوں اور کتابوں سے کماحقہ واقف ہو جاتا ہے بلکہ عظیم راہی کے تنقیدی رجحانات بھی اُس پر واضح ہوجاتے ہیں۔

بنگال میں اردو افسانہ - ایک جائزہ

مصنفہ: ڈاکٹر فاطمہ خاتون

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: اشرف احمد جعفری، دفتر بزمِ نثار، 16B۔ تالتلہ بازار اسٹریٹ، کولکاتا 700024

'بنگال میں اردو افسانہ - ایک جائزہ' ڈاکٹر فاطمہ خاتون کی دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب 'اردو میں ناول نگاری کی روایت اور گئو دان' 2018 میں شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر فاطمہ کے بارہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں 'مغز تحریر' کے تحت خود ان کا بیان اور 'مستقبل کی امید' و 'ڈاکٹر فاطمہ خاتون کا تخلیقی مزاج' کے زیر عناوین بالترتیب ابوالکلام رحمانی اور اصغر رضوی کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔

کتاب کا عنوان مختص کرنے کا جواز ان کے مضامین کے عنوانات پیش کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں: (1) مغربی بنگال میں اردو افسانے کا آغاز وارتقا (2) اکیسویں صدی کے اردو افسانوں کا سماجیاتی مطالعہ (3) ٹیابرج میں اردو افسانہ - ایک جائزہ (4) ل۔ احمد کے نمائندہ افسانے (5) مغربی بنگال کی اولین خاتون افسانہ نگار - راحت آرا بیگم (6) شاہ مقبول احمد کی افسانہ نگاری (7) شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت افسانہ نگار (8) ظفر اوگانوی کے افسانوں کا سماجی پس منظر (9) کھلے دروازے پر دستک - تبصرہ و تجزیہ (10) ڈاکٹر عشرت بے تاب کے منتخب افسانے (11) جلیل عشرت کا افسانہ 'اکیسویں صدی کا گوتم' پر ایک نظر (12) فہیم اختر اپنے افسانوں کے آئینے میں۔

ان عنوانات سے جہاں اس بات کا صاف پتہ چل جاتا ہے کہ مصنفہ نے بنگال کے اردو افسانوں کی نہ صرف تاریخ قلمبند کی ہے بلکہ اس کے کئی ادوار کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا بالتفصیل ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً جہاں آزادی سے پہلے کے دو افسانہ نگار، ل احمد و راحت آرا بیگم پر قلم اٹھایا، ترقی پسند تحریک کے دو نمائندہ افسانہ نگار، شاہ مقبول احمد اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے فن پر روشنی ڈالی۔ جدیدیت کے نمائندہ ظفر اوگانوی کے ساتھ نذیر احمد یوسفی، عشرت بے تاب اور جلیل عشرت کے فن کا محاسبہ کیا۔ وہیں اردو کی نئی بستی کے نمائندہ کے طور پر فہیم اختر کی افسانہ نگاری کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے لیکن اس فہرست سے یہ بات بھی ظاہر ہوجاتی ہے کہ کتاب، بنگال کے کئی قابل ذکر افسانہ نگاروں کے فن کا احاطہ نہیں کرتی ہے جیسے جاوید نہال، انیس رفیع، فیروز عابد، صدیق عالم اور کئی دیگران لیکن اس کی وجہ مصنفہ نے صاف لفظوں میں بیان کردی ہے۔ کہتی ہیں:

''یہ کتاب میرے طبع شدہ یا کسی سیمینار میں پیش کردہ مقالوں اور مضامین کا انتخاب ہے۔ لہٰذا یہاں موضوع وعنوانات کی قید تھی جس کی وجہ سے میں منتخب شدہ افسانہ نگاروں ہی کو یہاں شامل کرسکی ہوں۔''

یعنی بالخصوص، افسانہ نگاروں پر لکھے گئے ان کے مضامین یا تو کسی رسالے کے مدیر کی فرمائش یا کسی سیمینار کے کنوینر کی ہدایت کے نتائج ہیں، جن کی وہ پابند تھیں لہٰذا مذکورہ بالا افسانہ نگاروں

کی عدم شمولیت پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، تاہم یہ سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ ان پر مصنفہ نے آزادانہ طور پر مضامین قلم بند کیوں نہ کیے کہ ان کی شمولیت سے کتاب کے ادبی وقار میں بلاشبہ مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کا جواب بھی مصنفہ نے پہلے ہی دے دیا ہے کہ ''یہ کوشش چوں کہ پہلے سے طے شدہ کسی منظّم لائحہ عمل کا نتیجہ نہیں ہے اسی لئے بعض اہم افسانہ نگاروں کی عدمِ شمولیت قارئین کے ذوقِ تسکین کو احساسِ تشنگی دے سکتی ہے۔''

بہر حال ان سوال و جواب سے قطع نظر کتاب کا معروضی مطالعہ ان خوش آئند باتوں سے آگاہ کراتا ہے کہ یہ مضامین، اردو ادب کے طلباء و طالبات کے اور عام باذوق قارئین کی معلومات میں بھی اضافے کا باعث ثابت ہوتے ہیں اور اگرچہ بعض مقبول و معروف افسانہ نگاروں پر براہِ راست مضامین نہیں ملتے ہیں لیکن تاریخ افسانہ نگاری کے بیان میں، برسبیلِ تذکرہ ہی سہی، ان کا ذکر خیر، مع اعترافِ اہمیت وقدر و منزلت ضرور مل جاتا ہے۔

طوالت سے گریز کرتے ہوئے صرف 'کھلے دروازے پر دستک' والے مضمون سے ...... جو دراصل نذیر احمد یوسفی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے...... ایک اقتباس ملاحظہ ہو ''افسانوں کا مجموعہ 'کھلے دروازے پر دستک' میں مختلف النوع مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'بھوت بنگلہ کا آدمی، (جنسی مسائل)' بے رنگ پروں کی تتلی (اخلاقی قدروں کا زوال)، لکیروں کی جلن (دہشت گردی) جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں ہم جن مسائل سے دوچار ہیں، ان میں سب سے اہم مسئلہ سوشل میڈیا کا غلط استعمال ہے۔ نذیر احمد یوسفی نے اپنے افسانہ 'کھلے دروازے پر دستک' میں فیس بک سے جڑے مسائل کو بھی بڑے پراثر انداز میں پیش کیا ہے''

مختصر یہ کہ کتاب، بنگال کے اردو افسانوں کی مزاج شناسی کے علاوہ خود مصنفہ کے تنقیدی شعور سے بھی واقف کراتی ہے۔ طلبہ کے علاوہ ناقدینِ ادب کی تحویل میں بھی اس کتاب کا ہونا اس لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ اس کے ذریعہ بنگال میں تنقید نگاری، بالخصوص خاتون ناقدین کے افکار کی سمت و رفتار کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو صحافت آغاز تا حال

صفحات: 280، قیمت: 300 روپے
ناشر: منت پبلی کیشنز، پنچ کولہ، کشمیر
مبصر: عبدالمالک بلندشہری
A126/5، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں جہاں دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان عظیم آباد کا غیر معمولی کردار رہا ہے وہیں ریاست جموں و کشمیر اردو کی زلف گرہ گیر کو سنوارنے میں دیگر صوبوں اور ریاستوں سے پیچھے نہیں رہی۔ ریاست کی عظیم ادبی ولسانی خدمات و حصولیابیوں کی ہی وجہ سے ادبی دنیا میں باقاعدہ دبستان جموں و کشمیر کا خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ پیش نظر کتاب جموں و کشمیر میں اردو صحافت آغاز تا حال اسی داستان دلنواز کو منظر عام پر لانے کی ایک دلچسپ کوشش ہے، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری اپنی اردو نوازی اور علم دوستی کی بنا پر علمی و ادبی حلقوں میں خاصے معروف ہیں اور محکمہ اعلی تعلیم حکومت جموں کے اعلی عہدہ پر فائز ہیں، موصوف کا تعلق جموں و کشمیر کے بڑے صحافی اور ادیب محمد الدین فوق کے خانوادہ سے ہے، ان کی یہ اہم ترین کاوش چھ ابواب پر مشتمل ہے، پیش گفتار کے عنوان سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے جس کے تحت مرتب کتاب اس اہم دستاویز کی تیاری کے پس منظر کو بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں یہ کوئی روایتی یا تحقیقی مقالہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسائنمٹ ہے جسے میں نے پوری سنجیدگی اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں فن صحافت کے تعلق سے زیادہ تفصیلی بحث نہیں کی ہے اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فن پر اس لیے بات نہیں کی کیونکہ اول تو کتاب کی ضخامت میں زیادہ نہیں چاہتا تھا، دوم تب یہاں کے اخبارات کو اس فن کی کسوٹی پر پرکھنا میرے لیے لازمی ہو جاتا اس طرح یہ کتاب تاریخی، تحقیقی اور تعارفی کم بلکہ خالص تنقیدی بن جاتی جس سے مقصد فوت ہو جاتا۔

کتاب کا پہلا باب اردو صحافت آغاز تا حال کے عنوان سے ہے، جس کے تحت مرتب کتاب نے انتہائی جامع اور مختصر انداز میں اردو صحافت کی تاریخ دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے جس سے اردو صحافت کے متعلق بہت سی اہم معلومات حاصل ہو جاتی ہیں آپ اردو صحافت کے آغاز کے تعلق سے صفحہ نمبر پندرہ پر رقم طراز ہیں ''ہندوستان میں صحافت کی تاریخ یورپیوں کی آمد سے شروع ہوئی ہے، پرتگالیوں نے گوآ میں 1557 میں پہلا پریس قائم کر کے وہاں سے سب سے پہلے Jesuits of Goa نام کی کتاب چھاپی پھر 1684 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی میں پرنٹنگ پریس قائم کیا البتہ پہلا مطبوعہ اخبار James Augustus Hickey نے ہکیز بنگال گزٹ کے نام سے ہندوستان میں جاری کیا، 1822 میں اردو کا سب سے پہلا اخبار جام جہاں نما کلکتہ سے جاری ہوا اس کے بعد فوائد الناظرین اور محبّ ہند سمیت کئی اخبارات مختلف مقامات سے شائع ہونے شروع ہوئے۔ اس باب میں ان کے علاوہ دہلی اخبار، تہذیب الاخلاق، اودھ اخبار، سحر سامری، طلسم لکھنؤ، دبدبۂ سکندری، تسنیم، وکیل سمیت کئی اہم اخبارات کے متعلق اہم مباحث پیش کیے گئے ہیں، چالیس صفحات پر مشتمل یہ باب کتاب کی جان ہے۔''

باب دوم جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا آغاز تا حال ہے 'ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کی شروعات بہت بعد میں ہوئی' مرتب نے اس کی دو وجوہات بیان کی ہیں جدید تعلیم کی طرف سے عدم التفات اور مہاراجاؤں کی حوصلہ شکنی۔

ریاست کا پہلا اخبار بنکٹ رام شاستری بنارسی نے بدیا بلاس کے نام سے شروع کیا جو کہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا، اس کے بعد تحفہ کشمیر جاری ہوا پھر تو یہ سلسلہ نکل پڑا، ریاست میں اب تک سیکڑوں اخبارات شروع ہو رہے ہیں اور سیاسی و معاشی سمیت مختلف وجوہات سے بند بھی ہو رہے ہیں۔

باب سوم کے تحت جموں و کشمیر کے اہم اردو صحافیوں کی خدمات حسین پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے تحت منشی محمد الدین فوق، لالہ ملک راج صراف، پریم ناتھ بزاز، خواجہ ثناء اللہ بٹ، صوفی غلام محمد، شمیم احمد شمیم اور ڈاکٹر سید شجاعت بخاری کی صحافتی خدمات اور فن صحافت کے عروج وارتقا میں ان کے کردار کو عمدہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم ریاست کی ادبی صحافت اور پنجم ادبی صحافیوں کے ارد گرد گھومتا ہے، اس باب کے تحت ریاست کے سرکاری و غیر سرکاری محکموں سے شائع ہونے والے ادبی اور نیم ادبی رسائل و مجلّات کی تفصیلات اور یوسف ٹینگ، شبنم قیوم، ابن اسماعیل جیسے بڑے صحافی ادیبوں کی ادبی صحافت کی حصولیابیاں بیان کی گئی ہیں۔

آخری باب جموں و کشمیر کی اردو صحافت کا موجودہ منظر نامہ کے تحت صحافت کی موجودہ صورتحال اور موجودہ دور میں نکلنے والے مجلّات و رسائل پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ریاست میں صحافت کے روشن مستقبل کے تعلق سے اہم نکات پیش کیے گئے ہیں۔ مرتب کتاب کے بہ بقول اخبارات کے پاس اپنا تربیت یافتہ عملہ ہونا چاہیے، غیر جانبداری ہو، قارئین کی رائے حاصل کی جائے، نقد و مدح میں اعتدال کی راہ اپنائی جائے، سماج دشمن عناصر کی پول کھولی جائے، سنسنی خیز خبروں سے اجتناب کیا جائے۔ مرتب کے پیش کردہ نکات گراں قدر اہمیت کے حامل ہیں اور ہر صحافی کو ان تجاویز کی روشنی میں اپنا صحافتی سفر آگے بڑھانا چاہیے اور اخبارات و مجلّات کو ان اصول کی پاسداری کرنا چاہیے۔

اس کتاب کی معنویت پر از معلومات ضمیمہ جات کی وجہ سے بڑھ گئی ہے، مرتب کتاب نے پانچ ابواب میں بعض دیگر متعلق مباحث مثلاً جموں وکشمیر میں اردو ممکنات و میلانات، روبرو مکالمہ غلام نبی خیال اور ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، اہم صحافیوں اور اخبارات کی تصویریں، صحافت سے متعلق کتابیات اور مطبوعات زور کشمیری بیان کیے ہیں۔

کتاب اپنے موضوع کو محیط ہے اور صوبہ کی صحافتی تاریخ جاننے کے لیے اہم ہے اور صحیح معنوں میں دریا بہ کوزہ کی مصداق ہے، کتاب کے معلوماتی وتحقیقی مباحث مرتب کتاب کی عرق ریزی، جگر سوزی اور انتھک محنت جیسی اعلی صفات کی غماز ہیں، کتاب کا سرورق بھی عمدہ ہے اور کاغذ بھی معیاری ہے، سرورق پر کتابوں واخبار کے عکس نے اس کی کشش میں اضافہ کر دیا ہے۔ اسی طرح ضمیمہ جات کے تحت نامور ادبا وصحافیوں کی نادر تصاویر نے کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ الغرض مرتب کتاب اس قیمتی سوغات کے لیے پوری اردو برادری کی طرف سے سپاس وشکریہ کے مستحق ہیں۔

مظفر حنفی شخصیت اور فکر و فن

مصنف: جاوید اختر

صفحات: 199، قیمت: 300

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مظفر حنفی شخصیت اور فکر وفن' جاوید اختر کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس سے پہلے ان کی ایک اور کتاب جوان کے مختلف ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، 'تحقیقی وتنقیدی مضامین' کے عنوان سے سنہ 2015 میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ جاوید اختر نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے حاصل کی۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ پرائمری اسکول مریٹھا، جالے، دربھنگہ، بہار میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے میں منہمک ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب جس شخص کا احاطہ کرتی ہے اردو ادب میں وہ محتاج تعارف نہیں۔ مظفر حنفی اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں کہ انھیں کسی ایک خانے میں مقید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ بیک وقت محقق، ناقد، مترجم، افسانہ نگار، مکتوب نگار، سفرنامہ نگار، مدیر اور مرتب ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں مظفر حنفی کے مذکورہ تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔

جاوید اختر نے اپنی کتاب میں ابواب کی درجہ بندی مظفر حنفی کی شخصیت کے مختلف ادبی جہات کو پیش نظر رکھ کر کی ہے۔ کتاب میں کل سات ابواب شامل ہیں، جو بالترتیب شخصیت اور فکر وفن، شعری تخلیقات، نثری تخلیقات، تحقیق وتنقید، شاد عارفی پر کتابیں، مدیرانہ صلاحیت اور ترتیب وتدوین وتراجم ہیں۔

پہلے باب کا عنوان شخصیت اور فکر وفن ہے لیکن اس باب میں مظفر حنفی کی شخصیت یا فکر وفن پر گفتگو برائے نام کی گئی ہے۔ اس باب میں دراصل 'توقیت نامہ' پیش کیا گیا ہے۔ توقیت نامے کے ساتھ اگر ان کی شخصیت پر بھی تفصیلی گفتگو کی جاتی تو یہ کتاب کی اہمیت ووقعت میں مزید اضافے کا سبب ہوتا۔ دوسرا باب شعری تخلیقات کے عنوان سے تقریباً چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری میں چوں کہ جدیدیت کے ساتھ کلاسیکی رچاؤ بھی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اس لیے اس پر گفتگو کرنا ہر کس و ناکس کے لیے آسان نہیں۔ جاوید اختر اس ضمن میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مظفر حنفی کی شعری تخلیقات پر کافی دلچسپ اور بھرپور گفتگو کی ہے۔ تیسرا باب نثری تخلیقات پر مبنی ہے جس کے ضمن میں مظفر حنفی کی افسانہ نگاری، مکتوب نگاری اور سفرنامہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس باب میں مظفر حنفی کے تینوں افسانوی مجموعے اینٹ کا جواب، دوغنڈے اور دیدۂ حیراں پر نہایت مختصر گفتگو کی گئی ہے، جس کی وجہ سے ایک قسم کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی صورت ان کی مکتوب نگاری اور سفرنامہ نگاری کے ساتھ بھی روا رکھی گئی ہے۔ چوتھا باب مظفر حنفی کی تحقیق وتنقید کا احاطہ کرتی ہے۔ اس باب میں مصنف نے مظفر حنفی کی کتابوں اور مجموعۂ مضامین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان مجموعوں میں شامل مضامین کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ باب میں مظفر حنفی کے تحریر کردہ تبصرے اور پیش لفظ پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تبصروں کی ایک طویل فہرست بھی باب میں شامل ہے۔ پانچواں باب بعنوان 'شاد عارفی پر کتابیں' ہیں۔ مظفر حنفی چوں کہ شاد عارفی کے شاگرد تھے لہٰذا انھوں نے حق شاگردی ادا کرتے ہوئے شاد عارفی پر تقریباً سات کتابیں تحریر کیں جو بالترتیب 'ایک تھا شاعر' (1967)، 'نثر وغزل دستہ' (1967)، 'شوخی تحریر' (1970)، 'شاد عارفی کی غزلیں' (1974)، 'کلیات شاد شارفی' (1975)، 'شاد عارفی: فن اور فن کار' (1977)، 'شاد عارفی شخصیت اور فن' (پی ایچ ڈی کا مقالہ) ہیں۔ اس باب میں مظفر حنفی کی درج کردہ تمام کتابوں کا مختصر تعارف پیش گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں مصنف نے شاد عارفی کی عشقیہ غزلیں، شاد عارفی کی طنزیہ غزلیں، شاد عارفی کی منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں، شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں اور 'متفرق شعری تخلیقات' جیسے عنوانات کے تحت شاد عارفی کے تئیں مظفر حنفی کے خیالات پیش کیے ہیں۔ چھٹا باب مظفر حنفی کی مدیرانہ صلاحیت پر مشتمل ہے۔ جنوری 1959 میں مظفر حنفی نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک رسالہ 'نیا چراغ' کا اجرا کیا تھا۔ جس کے کل 17 شمارے ہی منظر عام پر آسکے، اس کے بعد رسالہ بند کر دیا گیا۔ ان سترہ شماروں میں 14 شمارے مظفر حنفی کے قلم کا نتیجہ تھے۔ مصنف نے کتاب میں رسالہ 'نیا چراغ' کے اداریوں کے ذریعہ مظفر حنفی کی مدیرانہ صلاحیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے شعرا وادبا کی ایک طویل فہرست بھی اس باب میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اسی باب میں 'وضاحتی کتابیات' کے عنوان سے تحت مظفر حنفی کی تیار کردہ 'وضاحتی کتابیات' جو انیس جلدوں پر مشتمل ہے اور جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذریعہ شائع کیا گیا، کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ ساتواں اور آخری باب 'ترتیب وتدوین اور تراجم' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ اس باب میں مظفر حنفی کی ترتیب، تدوین اور ترجمہ شدہ چند اہم کتابوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'کتابیات' شامل ہے۔

اس مختصر سی کتاب میں مظفر حنفی کی تمام ادبی خدمات کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے تقریباً تمام ابواب میں تشنگی کا احساس برقرار ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں قباحت نہیں کہ مظفر حنفی پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب نہایت مفید اور معاون ثابت ہوگی۔

فکشن

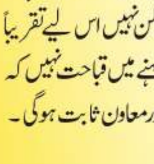

ایک ایسا بھی دور

مصنفہ: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

صفحات: 133، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ریحان کوثر، ماہنامہ 'الفاظ ہند' کاشانۂ کوثر، ڈاکٹر شیخ بنکر کالونی، کامٹی۔ 441001، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں ہم مقامی، قومی اور عالمی خبروں پر ہر ممکن نظر بآسانی رکھ سکتے ہیں۔ دنیا جہاں کی آگاہی اور شعور کے کئی ذرائع سے ہم وابستہ

ہیں۔لیکن آج یہ آ گاہی اور شعور ایک عذاب بھی بن گیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں انسانیت پر ہونے والی کوئی بھی زیادتی ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ کسی سانحے کے بعد رونما ہونے والے المیے کے بارے میں ہم فکرمند ہو جاتے ہیں اور اپنے سینے میں درد محسوس کرتے ہیں۔ بطور خاص کورونا وائرس کے وبائی دور نے ہمارے شعور و آ گہی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سب کچھ دیکھنے، سننے اور پڑھنے کے بعد بھی ہم بے بس اور لاچار ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے بیمار ہونے اور ان کی طبی اور سماجی خدمات تک رسائی نہ ہونے، کثیر تعداد میں اموات اور اموات کے بعد دو گز زمین یا آخری رسومات کے لیے لکڑیاں بھی میسر نہ ہونے کی خبروں سے ہمیں جو تجربہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو درد محسوس ہوتا ہے اسے 'اجتماعی درد' کہا جا سکتا ہے۔

اس وبائی بیماری کے نتیجے میں انفرادی درد بھی ہوتا ہے۔ قریبی دوستوں اور رشتے داروں کا نقصان، ہمارے معمولات کا نقصان، ہماری سماجی زندگیوں کا نقصان وغیرہ۔ اجتماعی درد ایک وسیع اصطلاح ہے جو اجتماعی غم، اجتماعی صدمے اور اجتماعی اضطراب کے سبب رونما ہوتا ہے۔ یہ ہم کسی بھی طرح کے بحران کے وقت انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی زیر نظر کتاب 'ایک ایسا بھی دور' مجموعی طور پر اسی اجتماعی درد کا مجموعہ ہے۔

انور مرزا نے نعیمہ جعفری کا افسانچہ 'مکافات عمل' مجھے بھیجا جو کتاب 'ایک ایسا بھی دور' کے صفحہ نمبر 55 پر موجود ہے۔ اس افسانچے کی ابتدا کچھ یوں تھی:

''دبیر فلک عطارد جو کچھ لمحوں کے لیے غنودگی کی کیفیت میں بے خبر ہو گیا تھا، چونک کر اٹھا، اس کے سامنے کرۂ ارض سے آئی ہوئی رپورٹوں کے دفتر کے دفتر جمع تھے۔ اپنی لاپروائی پر لرزاں، اس نے اوراق پلٹنے شروع کیے تو انگشت بہ دنداں رہ گیا۔ اتنی نافرمانیاں! اتنی بداعمالیاں، خدائی کے دعوے! مظلوموں کا استحصال! مذہب کے نام پر سیاست کا ننگا ناچ! شریفوں کی بے حرمتی اور رذیلوں کا عروج! یہ ابن آدم تو فرعون بے سامان ہو گیا ہے! اُف! کہیں اپنے تساہل کے لیے موردالزام نہ ٹھہرایا جاؤں۔'' فرض کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔ منتظر فرشتے کے ہاتھ رپورٹ بھیجی ہی تھی کہ 'کن' کے ساز کی آواز تیز ہو گئی، لیکن اس میں تعمیر کا نہیں بلکہ تخریب کا پہلو نمایاں تھا، غیظ و غضب تھا، حکم عدولی پر ناراضگی تھی، سزا کا اشاریہ تھا۔''

اس افسانے کا اقتباس پیش کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اپنا موقف پیش کر سکوں اور وہ یہ ہے کہ 'ایک ایسا بھی دور' میں بیان کیے گئے سات دنوں کا مختصر دور ہی درد کا سلسلہ نہیں ہے۔ سات دن کی یہ کہانی، یہ افسانہ، یہ روداد، یہ رپورتاژ یا جو کچھ بھی ہے، صرف سات دنوں کے درد و الم پر محیط نہیں، اور نہ ہی یہ درد مصنفہ کا انفرادی درد ہے۔ دراصل یہ کتاب 'ایک ایسا بھی دور' میں تین ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا دور مصنفہ کے دل کا مرض اور اس کے بعد آنکھوں کا آپریشن شامل ہیں۔ ساتھ ہی اس دور کے قوسین کے پہلے قوس آپ کے شریک حیات کی رحلت اور دوسری قوس آپ کے اکلوتے برادر کی رحلت ہے۔ دراصل اول الذکر افسانچہ پڑھ کر انور مرزا نے کہا تھا:

''افسانچہ پڑھ کر میں تو حیران رہ گیا تھا...... یہ افسانچہ کیسے وجود میں آیا ہوگا۔...... یہ راز شاید نعیمہ جی کے اس جملے میں ہے جو انھوں نے افسانچے کے نیچے لکھا ہے...... اسپتال کے بستر پر دل سے جنگ کرتے ہوئے، ایک افسانچہ ہو گیا۔''

یہ افسانہ آپ نے شاید انجیو پلاسٹی کے دوران اسپتال میں لکھا تھا۔ موصوفہ جب دوسری مرتبہ اسپتال میں داخل ہوئیں تو اجتماعی درد کا یہ سلسلہ ان سطور میں پوشیدہ ہے۔ دراصل کتاب کی روح اسی اقتباس میں قید ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''اتنی نافرمانیاں! اتنی بد اعمالیاں! خدائی کے دعوے! مظلوموں کا استحصال! مذہب کے نام پر سیاست کا ننگا ناچ۔''

ملک میں کورونا وائرس وبا کی دوسری لہر کے دوران جب لاکھوں پھیپھڑے آکسیجن کے لیے ترس رہے تھے، گنگا میں لاشوں کا ڈھیر تھا، گنگا کناروں پر سڑتی ہوئی لاشوں کو کتے نوچنے میں مگن تھے۔ ارتھیوں کی لمبی قطاریں شمشان میں داخل ہوا چاہتی تھیں۔ ایسے ماحول میں موصوفہ نے اسپتال میں قدم رکھا۔

پہلا دن اور پہلی رات، جیسے قیامت کی نشانیاں بن گئیں۔ ان سات دنوں کے دور کا یہ سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ یہ حصہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس حصے میں مصنفہ نے اپنے انفرادی اور اجتماعی درد کو جیسے خون سے لکھ کر بیان کر دیا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں پیش لفظ 'دو باتیں' کے ساتھ چالیس سے زائد افسانچے شامل ہیں جو اس وبائی دور اور لاک ڈاؤن کے دوران لکھے گئے تھے۔ تکمیل کائنات، مٹی کی خوشبو، مکافات عمل، ٹیچرس ڈے، ناممکنات کا امکان، پتھر کے صنم، امر بیل، گرود کشنا، میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں، یہ وفا کی سخت راہیں وفادار، سر کٹا، آخری عدالت، آنکھوں کی مہکتی خوشبو وغیرہ یہ سارے ہی منتخب افسانچے ہیں اور کوئی بھی افسانچہ اوسط یا اس سے نیچے کا بالکل نہیں ہے۔ تمام افسانچے معیاری ہیں اور مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ افسانچہ نگار نے قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ ان افسانچوں کو مختصر افسانے یا مائیکرو فکشن جو چاہیں نام دیں، لیکن میرے نزدیک یہ سب افسانچے ''اجتماعی درد'' کی عمدہ مثال ہیں اور قاری پر لازم ہے کہ ان کی قرأت کے بعد اس درد کو محسوس بھی کریں۔ کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انقلاب شعور و آ گہی کے بعد ہی آتا ہے۔

پاگل پن

مصنف: حسین قریشی
صفحات: 128، قیمت: 95 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
مبصر: عارفہ خالد شیخ، 59/61، زین ٹاور، تمکا راسٹریٹ، فلیٹ نمبر 702، ناگپاڑہ، ممبئی، مہاراشٹر

حسین قریشی صاحب ادبی فلک کے ایک ایسے منور و روشن ستاروں میں سے ہیں جنھیں اپنی تابناکی کے لیے روشنی مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھوں نے تخیل کی اڑان سے سماج اور حالات کی ستم ظریفی اور اس کے نکھرے پن کو اپنے قلم کی جنبش سے لفظوں میں قید کر لیا ہے۔ 'پاگل پن' میں معاشرے کا وہ چہرہ نظر آیا جو ہم وقتاً فوقتاً دیکھتے ہیں۔ اس کے خد و خال میں پیدا ہونے والے تغیرات کو محسوس کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل افسانوں و افسانچوں میں درد بھی ہے اور درس بھی۔ کہیں آ گاہی و آشنائی ہے تو کہیں طنز اور جرأت مندی بھی۔ کہیں کہیں کسک اور تشنگی راوی کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دیتی ہیں تو کہیں انجام پڑھ کر تسلی بھی ہو جاتی ہے۔ راقم کا پہلا افسانہ ہی کتاب پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے اور وہ ہے 'دلچسپی'...... کہتے ہیں ''دلچسپی کے خمیر سے گوندھی گئیں روٹیاں نہ صرف ملائم ہوتی ہیں بلکہ لذیذ بھی ہوتی ہیں۔'' یہاں اس جملے سے مراد ''خوش دلی سے کیا جانے والا کام ہے۔'' اس افسانے کے ذریعے محترم حسین قریشی صاحب نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کام کوئی ہو۔ گر اسے دلچسپی سے کیا جائے تو اس کے نہ صرف عمدہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بلکہ عامل اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی باور کرانا چاہا کہ یہ ان کی ادب سے دلچسپی ہی تھی جس نے ان کی تخلیقی ذہن کی آبیاری کی اور انھیں تخلیق کار بننے کے لیے راہیں ہموار کی۔ دوسرے الفاظ میں کہوں تو انھوں نے ادب سے اپنی محبت، شوق، لگن اور جنون کو 'پاگل پن' سے تشبیہ دے کر اپنے ذوق کا پتہ دیا ہے۔

دوسرا افسانہ 'دوڑ' جو کئی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ انسان کے بلند حوصلوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رکھ کر بیٹھنا۔ یا صرف یہ سوچ کر تسلی کر لینا کہ 'پالنہار' ہی سب دکھ دور کر دے گا اور خود کو حالات کے دھارے میں بہتا چھوڑ دینا عقلمندی نہیں۔

انسان تو وہ جو اپنی تدبیروں سے، عمل سے، حکمت سے اپنی تو کیا اوروں کی بھی تقدیر پلٹ دے اور کائنات بھی اس کی ہمت، بہادری وشجاعت کو دیکھ مسکرا اٹھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب جب عورتوں کے سہاگ پر آنچ آئی انھوں نے قدرت کو بھی للکارا ہے۔ اسی بات کی نشاندہی کرتا افسانہ... جس میں موصوف نے کرداروں کے نام بھی خوب رکھے۔ 'بھگوان کرے' اور'لتا' لتا کے روپ میں جواں مردی کے تمثیلی کردار کو سلام۔ 'ایک ملاقات میں' لفظ' آل راؤنڈر' پسند آیا۔ جو حسین صاحب کی شخصیت سے میل کھاتا ہے۔

'کورٹ میرج' آنکھیں کھولتا افسانہ ہے۔ ہمارا سماج اچھے اور برے دونوں قسم کے افراد سے بھرا پڑا ہے۔لیکن کیا صحیح ہے اور کیا غلط اس کا فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے۔ وقت رہتے گر سنبھل جاؤ تو پچھتاوا، پشیمانی اور شرمندگی سے بچا جا سکتا ہے۔

پھر افسانہ'میرے اپنے میں' مصنف نے سماج میں ناسور کی طرح پھیلتی'ام الخبائث' یعنی شراب کے مضر اثرات کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اور سیدھے سادھے طریقے سے یہ جتلایا کہ اس خرافات سے کیسے ازدواجی زندگی متاثر ہوتی ہے اور کیسے ایک عورت اور بچے کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے رشتوں کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ 'آنسو' افسانے کے تحت انھوں نے شادی بیاہ کے معاملات میں درپیش مشکلات نیز لڑکیوں کی شادی نہ ہونے کے مسائل کو اجاگر کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی اور اس بات پر زور دیا کہ اللہ کی خوشنودی اور رضائے الٰہی کے مدِ نظر ہمیں اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔

غرض افسانے اور افسانچوں کے اس ذخیرے میں کن کن خوبیوں کا ذکر کریں، سبھی انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں۔ موضوع کوئی پرانا یا یکساں نہیں ہوتا اس کو برتنے کا فن اسے منفرد اور جدید بناتا ہے۔جس میں موصوف کامیاب نظر آئے۔محبت، ہمدردی، نیک نیتی اور بھائی چارگی کا درس دیتے ہیں۔ قدیم وجدید روایات کی منظر کشی کرتے تمام ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

اسی طرح افسانچوں میں سوچ، حالات وخیالات، معصوم بچپن، قسمت اور فیصلے، حرص، ہمہ جہت ترقی، کسک، گاندھی جی کے بندر، تجربہ، گیم، دماغی قوت وغیرہ بھی اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو موصوف نے اپنی نوک پلک سے سنوار کر'پاگل پن' کی شکل میں پیش کیا ہے۔ گو کہ افسانوی رنگ اور زبان کی شیرینی وحلاوت کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آئندہ آنے والی تصانیف نہ صرف اچھی ہوں گی بلکہ بہترین اور عمدہ کے زمرے میں بھی نظر آئیں گی۔

سوانح و شخصیت

اک شخص دل ربا سا

مصنف: نایاب حسن
صفحات: 362، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: محمد انصار قاسمی، N-39، سکنڈ فلور، سیلنگ کلب روڈ (گلی نمبر 2) بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025

'اک شخص دل ربا سا' نہ صرف نام کے اعتبار سے بے مثال ہے، بلکہ منفرد انداز تحریر، لطافت وادبیت کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہے۔جس شخصیت کی سوانح حیات ہے اس موضوع پر یہ ایک جامع کتاب ہے، جس میں نایاب حسن نے یکتائے زمانہ معلم، ادیبِ باکمال، دیدہ ور صحافی، عظیم مربی اور مجلّہ'الداعی' عربی کے سابق مدیر اعلیٰ مولانا نور عالم خلیل امینی (1952-1021) کی تعلیمی، تدریسی، صحافتی، تالیفی اور تصنیفی زندگی کے نقوش اجاگر کیے ہیں۔

کتاب کا انتساب'نذر' کے عنوان سے مولانا کی والدہ محترمہ کے نام کیا گیا ہے۔ 'قرب اور کرب کا پر اثر بیانیہ' کے عنوان سے شامل تعارفی تحریر میں اردو کے معروف نقاد حقانی القاسمی نے نہ صرف کتاب کا تعارف کروایا ہے؛ بلکہ پوری کتاب کے خلاصے اور نچوڑ کے ساتھ مولانا نور عالم خلیل امینی سے اپنے گہرے رشتے کا اظہار بھی کیا ہے، حقانی القاسمی کی یہ تحریر انتہائی پر مغز اور لاجواب ہے۔

'جگر لخت لخت' کے عنوان سے مولانا نور عالم خلیل امینی کی رحلت اور المناک سانحہ کے تذکرہ کے ساتھ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ مولانا ایسے بافیض اور باکمال استاد تھے کہ جس نے ان کے پاس اپنی زندگی کے چند لمحات بھی بتائے، اس نے بھی ان سے طرز زندگی، تہذیب وشائستگی اور سلیقہ مندی ضرور سیکھی ہوگی۔

صفحہ نمبر 25 سے اصل کتاب کی شروعات ہوتی ہے، پہلا عنوان ہے: اے کہ تو شمع فروزاں، صورت پروانہ ام، اس کے تحت مولانا نور عالم خلیل امینی کا پہلی مرتبہ نام سننے، پہلی ملاقات، پہلا تعارف، پہلے دن کی شاگردی کے پرلطف تذکرے کے ساتھ مولانا کے رکھ رکھاؤ، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، لکھنے پڑھنے اور لباس وپوشاک تک کا خوب صورت تذکرہ ہے۔

اس کے بعد'عربی زبان وادب اور مولانا امینی: من تو شدم تو من شدی، کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا، عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں، نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری، خوشا لطافت لفظ وخوشا نزاکت معنیٰ' یہ سب وہ دل کش عناوین ہے، جن کے تحت مولانا امینی کی عربی زبان سے آشنائی، دلچسپی، وارفتگی اور ان کی غیر معمولی صلاحیت کیسے پروان چڑھی، ان کی زبان دانی میں کیسے نکھار آیا اور پھر انھوں نے عربی زبان میں کس طرح دسیوں موضوعات پر سیکڑوں مضامین لکھے، اس کی پوری داستان انوکھے اور البیلے انداز میں تحریر کی ہے۔مصنف مولانا کے فکر وادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ان کا عقیدہ تھا کہ لفظ کو لکھنے سے پہلے تولنا چاہیے، وہ فکر ہی نہیں حروف کی تطہیر وتنظیف کے بھی قائل تھے۔ ان کی تحریر کردہ ہر سطر سے علم کی گیرائی، ادب کی زیبائی وبرنائی، فکر کی بلندی وگہرائی، ملی وقومی ہمدردی، انسانی خیر خواہی، عالم اسلام کے تئیں غیر معمولی دردمندی وخیر اندیشی، دنیا بھر کے اہل علم وادب وفکر سے محبت کا وفور اور دل ونگاہ کی سرور بخش روشنی جھلکتی ہے۔(ص 85)

'خورشید مثال شخصیات سے ذہنی مناسبتیں' کے عنوان سے ان علمی، فکری وادبی شخصیات کا تذکرہ ہے، جن سے مولانا کو انسیت تھی اور اپنی تحریروں میں جن کا انھوں نے بارہا تذکرہ کیا ہے۔'مولانا کا اردو اسلوب نگارش اور خاکہ نویسی' کے تحت نہ صرف مولانا کی سوانح نگاری وخاکہ نویسی کا ذکر ہے؛ بلکہ برموقع خاکہ نویسی کی قدیم وجدید روایت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، جو معلومات کا خزینہ اور سیکڑوں صفحات کا خلاصہ ہے، اسی ضمن میں یہ بتایا ہے کہ مولانا کی تحریریں خشک اور سپاٹ نہیں ہوا کرتی تھیں؛ بلکہ برمحل اشعار سے لبریز ہوتی تھیں، اقبال اور غالب کے علاوہ بیشمار شعرا کے اشعار انھوں نے اپنی تحریروں میں موقع بہ موقع نقل کیے ہیں۔شعر کے ساتھ مولانا کے شاعر کا نام لکھنے کا انداز بھی خاص تھا، جو ہر پڑھنے والے کے علم میں اضافے کا سبب بنتا۔

مصنف نے مولانا امینی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ کم وبیش تین سو شخصیات پر انھوں نے عربی میں سوانحی مضامین لکھے ہیں، جن میں سے منتخب تحریروں کے دو ضخیم مجموعے (پس مرگ زندہ، رفتگانِ نارفتہ) اردو میں بھی شائع ہوئے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔

'مولانا کی مکتوب نگاری' کے عنوان کے تحت پہلے ادبا، علما اور صلحا کے مکاتیب وخطوط کا ضمناً ذکر کیا گیا ہے۔ پھر مصنف نے مولانا کے مکتوب نگاری کی جھلکی دکھائی ہے، مولانا امینی اکابرین ومعاصرین کے ساتھ اپنے عزیزوں اور شاگردوں کو باضابطہ خط لکھتے تھے، بلکہ خط کا جواب دیتے وقت ان کی اصلاح بھی کرتے اور مناسب مشورہ بھی دیتے تھے۔ ان کی سفرنامہ نگاری پر بھی خوب صورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا نور عالم خلیل امینی کی 11، اردو کتابوں 9، عربی کتابوں اور 11 اردو سے عربی تراجم کا اس انداز میں تعارف تذکرہ ہے کہ جس نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا ہوگا، یہ تعارف پڑھ کر انھیں پڑھنے کے لیے بیتاب ہوجائے گا۔

اک شخص دل ربا سا کی ایک اہم خصوصیت اور ہے کہ اس کی جامعیت ونافعیت میں چار چاند لگنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صفحہ 181 سے 249 تک 'یادداشتیں' کے عنوان سے خود مولانا کی تحریر شامل ہے، جو ایام طفولیت، تعلیمی ابتدا، بچوں کی فطرت اور احساس ذمہ داری، درجہ بہ درجہ ان کے علمی کمال اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بیان کرتی ہے، جس میں مولانا نے بغیر کسی مبالغہ آمیزی کے اپنے خاندان، علاقہ کے رسم ورواج اور اپنی بپتی تحریر کی ہے، یہ وہ سرگذشت ہے کہ پڑھنے والا ان کے الفاظ کی ترکیب، جملوں کی ساخت کے ساتھ مولانا کی تعبیرات پر نہ صرف عش عش کرتا ہے؛ بلکہ جوں جوں پڑھتے جایئے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور جی کرتا ہے کہ کاش مولانا اسے اور تفصیل سے لکھتے۔

مصنف نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ مولانا امینی کی مجلّہ 'الداعی' میں شائع شدہ تمام عربی تحریروں کا اشاریہ جلد وشمارہ نمبر، عنوان اور تاریخ کے ساتھ یکجا کردیا ہے، جو صفحہ: 255 سے 360 تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح مولانا کے فکروفن پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے انھوں نے بڑی آسانی پیدا کردی ہے۔

الغرض اپنے استاذ کو نہ صرف بہترین خراج عقیدت وتحسین پیش کیا ہے؛ بلکہ اصحابِ علم وادب کی خدمت میں ایک وقیع تحفہ پیش کیا ہے۔ کتاب کی طباعت نہایت خوب صورت اور دیدہ زیب ہے، جس کا اہتمام مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی نے کیا ہے۔

شاعری

چھاؤں سے دھوپ تک

شاعر: مصداق اعظمی

صفحات: 256، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: ڈاکٹر نورالصباح، مکان نمبر B-41/E، دوسری منزل، کنچن کنج مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ 2، سریتا وہار، دہلی۔ 76

انسانی جذبات واحساسات کے بیان کے لیے مختلف فنون لطیفہ کو اپنایا گیا۔ کسی نے مصوری کو اپنے جذبات کے بیان کے لیے تلاش کرلیا تو کسی نے بت تراشی کو اپنا ذریعہ بنایا، کسی نے آرٹ میں اپنے جذبات سموئے، لیکن شاعری انسانی جذبات واحساسات اور اس کے جمالیاتی حسن کو بیان کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کے عہد کی عکاسی ہوتی ہے۔ ماحول کے حالات وواقعات کا عکس ملتا ہے۔ اس میں تخیل کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہر لفظ شاعر کے جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔

شعر کا لفظ شعور سے ماخوذ ہے، یعنی کسی چیز کو جاننا، جدید اصطلاح میں ایسا کلام جو کسی واقعے یا موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہو اور اس کے کہنے کا کوئی مقصد بھی ہو۔ تو آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ زیر نظر تبصرہ ''چھاؤں سے دھوپ تک'' مصداق اعظمی کا سفر کس طرح شروع ہوا اور انھیں نیا محرک کہاں سے ملا۔ ان کی شاعری کا آغاز 14 سال کی عمر میں ہی ہوچکا تھا۔ انھوں نے اپنی ماں کی نرم چھاؤں تلے شاعری کے اٹھارہ سال گزار دیئے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ''فنی مشق کے ایام میں امی جان کو خدا نے میری شاعری کے لیے اول سامع اور مداح بنایا۔ ان کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں شوق شاعری اس طرح پروان چڑھا کہ اسکول سے گھر دیر رات تک لالٹین کی روشنی میں شاعری کے نام پر کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر غزل کے پیکر تراشنے لگا۔'' یہ کام انھوں نے تقریبا اٹھارہ سال کیے۔ جب ان کے والد محترم نے ان کی بیاض دیکھ کر فرمایا کہ ''ان سے کہیے وہ برہا وغیرہ لکھیں۔ غزل کہنا بہت مشکل فن ہے۔'' اس جملے کو انھوں نے مثبت طور پہ لیا اور شاہکار غزلیں ان کے مطالعہ کا حصہ رہیں۔ اس کے بعد وہ سعودی چلے گئے کچھ دن وہاں پر گزارنے کے بعد جب ہندوستان آئے تو ان کی دنیا ہی تہ و بالا ہوچکی تھی جہاں سے ان کی شاعری کو نیا محرک دستیاب ہوا اور شاعری ایک مقصد بن گئی۔

زیر نظر کتاب میں ان کی کئی برسوں کی مشقت میں سے 150 نظموں کو اس میں شامل ہونے کا حق ملا۔ ان کی نظمیں ملک، بیرون ملک کے مختلف رسائل وجرائد کا حصہ رہ چکی ہیں۔ موصوف نے نظم معری کا سہارا لے کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ پہلے تو انھوں نے خدا اور وحدانیت کے عنوان سے نظموں کو شامل کیا ہے۔ ان کے یہاں تاریخ کے کارنامے بھی نظر آتے ہیں، سچائی کی لہریں بھی چلتی ہیں اور اس سچائی کی وجہ سے موت بھی نظر آتی ہے۔ دوستوں کی دوستیاں بھی نظر آتی ہیں اور ان کی حق ادائیگی کی جلوہ سامانیاں بھی 'ساگر کے دریچے سے' دوستی کا حق جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کے تذکرے بھی ملتے ہیں اور دنیا 'قبر' کے مانند نظر آتی ہے اور دنیا کی یکسانیت انھیں ایک کیلنڈر کے مانند محسوس ہوتی ہے جس میں صبح کرنا اور شام کرنا کے تحت ضرورتیں تو مکمل ہوجاتی ہیں مگر زندگی ہار جاتی ہے اور اس ہار میں کیا کھویا کیا پایا کا راز پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ مسلسل اور مستحکم عزم کے در بھی وا ہوتے ہیں اور موت سے بے خوفی کا عالم بھی نظر آتا ہے۔ مذہبی دریچوں سے مذہبیت بھی نظر آتی ہے تو ہر مذہب کی توقیر کا جذبہ بھی پوشیدہ ملتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں ان کے مذہبی ہونے کی علامت بھی ہیں۔ چند مصرعے آپ کی نذر ہیں۔

جو بنادے حضرت آدم کو مردہ خاک سے — کردے جو آراستہ بے جاں کو روح پاک سے
نوح کی کشتی کو طوفاں سے بھی جو لے بچا — بحر میں جو حضرت موسیٰ کو دے دے راستہ

انھوں نے خدا کی تعریف اور اس کے معجزات کے نغمے گنگنا کر اپنے یقین کو مستحکم الفاظ دے دیے ہیں جو ان کے دل پر نقش تو ہے ہی زبان قلم سے صفحہ قرطاس پر بھی نقش ہوگئے ہیں۔

ان کی شاعری میں وحدانیت کے لحن کے ساتھ تاریخی شعور بھی موجود ہے جس سے ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، اس سے متعلق ان کی نظم 'وعدہ' دیکھی جاسکتی ہے۔

میرے ہاتھوں میں قلم ہے/ تو بھروسہ رکھیے/ اس رہ عدل سے/ میں بال برابر ہرگز
اب بھٹکنے کا تصور ہی نہیں کرسکتا/ میں کبھی دارورسن سے بھی نہیں ڈر سکتا
میرے ہاتھوں کو قلم لاکھ اندھیرے کردیں/ اپنے افکار سے ذہنوں کو ضیاء بخشوں گا
موت کے خوف نے پکڑا جو کبھی دامن زیست/ زہر کے ساتھ میں سقراط کا سچ رکھ دوں گا
بادشاہوں کے تکبر کے ہر اک قصے میں/ بے نیازی بھی فقیروں کی بیاں کردوں گا
شیر میسور کی عظمت کے کمالات کے ساتھ/ میر صادق کا میں چہرہ تو دکھا ہی دوں گا

ان کے یہاں مظلوم عورت کی داستان بھی نظر آتی ہے جس کو انھوں نے بہت ہی خوبصورت پیرایہ میں سمیٹا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کی آزادی کے چرچے صرف ایک واویلا کے طور پر ہے۔ ایک عورت اگر بیوہ ہے، مجبور ہے اس کا کوئی سہارا نہیں تو وہ ایک آخری قدم اٹھاتی ہے اور وہ قدم اسے جہنم کی گہرائی تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش کرنا چاہتی ہے انھیں دو وقت کی روٹی دینا چاہتی ہے اور سماج

آنکھیں بند کر کے اس کا فائدہ اٹھاتا ہے، یہ آزادی نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ہم نے مجبوری کو آزادی کا نام دے دیا ہے۔ معاشرے سے تعاون کا جذبہ ختم ہو چکا ہے اور خودغرضی نے جگہ لے لی ہے۔احساسات نہ جانے کس غار میں سو چکے ہیں اور مجبوریوں نے آزادی کا لبادہ پہننا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے سماج سے جذبۂ محبت، کسک، رحم دلی یہ ساری چیزیں ختم ہوتی جارہی ہیں، اخلاقی زوال مسلمانوں کا زوال ہے۔ ایک عورت پورے سماج کو سنوار سکتی ہے لیکن عورت کی ہر مجبوری اسے اندھے غار کی طرف لے جاتی ہے جہاں سے اس کا لوٹنا ممکن نہیں۔اس کی مجبوری کو موصوف نے عمدہ مگر باریک لباس پہنایا ہے۔

ایک بیوہ نے/ بے چارگی چھوڑ کر/ آج بچوں کی/ آنکھوں کو نم دیکھ کر
اپنے بے جان/ ہونٹوں میں/ رس بھر لیے

غرض یہ کہ ان کے یہاں حالات کی عکاسی اور واقعات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ایک گھٹیا سماج نظر آتا ہے تو کہیں کہیں بہتر سماج بھی سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر موضوع ان کی شاعری میں دھڑکتا ہے جو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔موجودہ ماحول میں مکروفریب اور خودغرضی کا جو بازار گرم ہے ان کے اشعار کا حصہ بن گیا ہے اگر یہی اشعار لوگوں کے دلوں کی زینت بن جائیں تو ان کی شاعری کا مقصد تمام ہو جائے کیوں کہ زینت بننے کے بعد شاید کچھ لوگ غوروفکر والے بھی بن جائیں اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ادب کا مقصد تو یہی ہوتا ہے مگر ادب کو بھی اب پیشہ بنالیا گیا ہے تو شاید ہی لوگ غوروفکر کریں۔ یہ بھی لمحہ فکریہ ہے۔

رسائل و جرائد

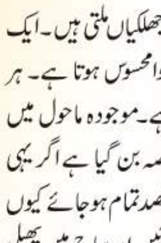

فکر انقلاب (خصوصی اشاعت بیاد اکابر دارالعلوم دیوبند-2)

مدیراعلیٰ: اسعد مختار، مدیر: احسن مہتاب
صفحات: 976، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: آل انڈیا تنظیم علماء حق، نئی دہلی
مبصر: ام کلثوم، پوسٹ اجرا، وایا رایام فیکٹری، ضلع مدھوبنی، بہار

عظیم اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند دین و مذہب، تعلیم و تدریس، تہذیب و ثقافت اور علم ودانشوری کی ایک واضح علامت ہے، یہ اپنے نصاب تدریس و نظام تعلیم اور اپنی منہجی وفکری انفرادیت کے سبب پوری دنیا میں حوالے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ام المدارس دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک چھوٹے سے قصبے دیوبند میں واقع ہے، مگر اس کا شہرہ اور چرچہ اقوام عالم میں ہوتا رہتا ہے۔

اسی دیوبند سے متعلق عبقری اور ممتاز شخصیات کو جدید عصری انداز میں بشکل کتاب مرتب کرنے اور اس کو بڑے پیمانے پر ملک و بیرون ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کا آل انڈیا تنظیم علماء حق کے پندرہ روزہ ترجمان 'فکر انقلاب' نے جو طویل مدتی منصوبہ ترتیب دیا ہے، وہ جبین صحافت پر کام یابی کی نئی عبارت رقم کر رہا ہے۔زیر نظر ضخیم خصوصی اشاعت بیاد اکابر دارالعلوم دیوبند بھی اسی کتابی سوانحی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔جس میں دیوبند اور فکر دیوبند سے وابستہ عظیم شخصیات پر تعارفی، تاثراتی قسم کے مضامین شامل ہیں، بعض مقالہ نما مضامین پر تحقیقی رنگ بھی غالب ہے۔فکر انقلاب کا اشاعتی سوانحی سلسلہ کافی طویل رہا ہے، ایک عرصہ سے وہ اکابر دیوبند پر خصوصی شمارے ترتیب دے رہا ہے، اس سے پہلے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، تحریک ریشمی رومال کے خاکہ ساز اور یکے از بانیان جامعہ ملیہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مشہور محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور مفتی مظفر حسینؒ وغیرہ کی حیات وخدمات اور ان کے علمی اور فکری نقوش وآثار کو محور بنا کر تنظیم کے زیرنگرانی ضخیم دستاویزی شمارے شائع ہو چکے ہیں اور انھیں عوام وخواص میں بے پناہ مقبولیت ملی ہے۔

اس ضخیم شمارے میں سب سے پہلے مدیر کے قلم سے مختصر اداریہ ہے۔جن ناموران صحافت و ادب کی تحریریں مرقومہ بالا شمارے میں شامل ہیں، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔اس موضوع کے تمام جہات واطراف کا احاطہ کرنے کے لیے ایک ہی نام سے کئی کئی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔مولانا ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر محمد اللہ خلیلی قاسمی، محمد عمران قاسمی بگیانوی، مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی، مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری، سید نجم الحسن تھانوی، مولانا ندیم الواجدی، مولانا زاہد الراشدی، مفتی ناصر الدین مظاہری، مولانا مجیب الرحمٰن انقلابی، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، سید عبید انور شاہ قیصر، محمد ساجد کھجناوری، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، مولانا امتیاز اقبال، مولانا عبداللہ طارق، حقانی القاسمی، سید حذیفہ نجم تھانوی، مولانا سالم اشرف قاسمی، علامہ اسید الرحمٰن سعید لاہور، مفتی محمد کراچی، مولانا سعید احمد جلال پوری، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا محمد اکرم کشمیری، مولانا اسجد قاسمی ندوی، مولانا شفیق احمد بستوی، مولانا محمد ناظم مظاہری، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا نور عالم خلیل امینی، حافظ خرم شہزاد پاکستان، محمد سلمان الخیر قاسمی، یوسف حیدر ندوی میواتی، کبیر الدین فاران مظاہری، مولانا اشرف عباس قاسمی، مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مولانا اجمل قاسمی، مولانا اعجاز مصطفیٰ کراچی، مولانا عبدالمالک ندوی، قاری ابوالحسن اعظمی، اسعد مختار، شکیل انصار، مفتی انور عالم۔ان میں سے کئی مضمون نگار ایسے ہیں جن کے مختلف شخصیات پر ایک سے زائد مضامین شامل ہیں۔تمام مضمون نگاروں نے دیوبند سے وابستہ قدیم و جدید علما وفضلا کا بھر پور تعارف کرایا ہے اور ان کے فکروفن نیز دینی وعلمی خدمات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔

مدیر اپنے اداریہ میں دیوبند کی اہمیت اور اس کی افادیت اور اس کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوبند کا عربی مدرسہ دراصل علم وحکمت کا ایک بحر بے کراں ہے، اس کی اتنی لہریں اور موجیں ہیں کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔ دیوبند کے تعلق سے اردو، عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بہت سی کتابیں، مقالات، مضامین تحریر کیے گئے پھر بھی دارالعلوم دیوبند کے تمام جہات اور زاویوں کا استقصا ممکن نہیں ہو پایا ہے۔ دنیا بھر کے رسائل وجرائد میں اکابر اور اسلاف دیوبند پر تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں، اس کے باوجود دیوبند سے جڑی ہوئی بہت سی شخصیات ایسی ہیں جن کے بارے میں مزید معلومات اور تفصیلات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اسی علمی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 'فکر انقلاب' نے تذکار رفتگاں کے تحت دیوبند کے اکابر اور فضلا پر خصوصی شماروں کی اشاعت کا آغاز کیا۔''

اکابر دیوبند کا موضوع بحر اوقیانوس کی طرح وسیع ہے، مختلف اہل قلم نے علماء و فضلائے دیوبند کے حوالے سے ہنگامی طور پر مضامین اور تاثراتی تحریریں قلم بند کی تھیں، مگر اس ہمہ گیر موضوع کو محور بنا کر اتنا نہیں لکھا گیا، جتنا کہ دارالعلوم اور اس کے وابستگان علما وفضلا مستحق تھے۔ لے دے کر سید محبوب رضوی کی تاریخ دارالعلوم دیوبند اور اکا دکا مختصر کتابیں/کتابچے ہی منظر عام پر آسکے ہیں، جو دارالعلوم کی خدمات کے تذکرے کے لیے حوالے کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔باقی ہر طرف سناٹا پسرا ہوا ہے، ضرورت تھی کہ ایک عرصے کے بعد ہی سہی، گاہے گاہے بازخواں کے جذبے کے تحت، پھر دارالعلوم اور اکابر دیوبند کی یاد تازہ کی جائے اور ان کی شخصیت اور ان کی تعلیمی وتدریسی، تعمیری وتبلیغی، تصنیفی وتالیفی اور دعوتی خدمات کے غیر ممسوس یا غیر مذکور گوشوں کا احاطہ کیا جائے، فکر انقلاب

کا زیرنظر خصوصی شمارہ اسی سلسلے کی طرف ایک مثبت اور قابل فخر پیش رفت ہے، مدیر محترم نے اپنے اداریے میں اس عندیہ کا اظہار کیا ہے کہ یہ اشاعت اہم ضرور ہے، مگر حرف آخر نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کی برق رفتار دنیا میں، اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت اور مزید دار العلوم سے وابستہ ایسے گمنام اشخاص کے کارناموں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے، جن کی ملی، سماجی، علمی اور سماجی خدمات نے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے اور جو ہماری خوئے فراموشی یا غفلت کے سبب منظرعام پر نہیں آسکا ہے۔ اسی لیے مدیر نے بجا لکھا ہے:

''دیوبند کی یہ وہ علمی وراثت ہے جس کی مبسوط اور مفصل تاریخ ہے، اسے چند صفحات میں سمیٹا نہیں جاسکتا۔ 'فکر انقلاب' میں اسی علمی وراثت کے تسلسل اور تاریخ کو سلسلہ وار پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ علمی دنیا ان اکابر اور مشائخ کی خدمات سے مکمل طور پر واقف ہو سکے جنھیں شاید وقت فراموش کرتا جارہا ہے۔ فراموش کاری کے اس عہد میں اپنے اسلاف اور اکابر کو یاد کرنا اور ان کی خدمات کو نئی نسل کے ذہن میں نقش کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔ یہ خصوصی شمارہ اسی فرض کی ادائیگی ہے۔ مجھے امید ہے کہ 'فکر انقلاب' کے اکابر دیوبند ایک اور دو سے دیوبند پر تحقیق کرنے والوں کو تحریک و ترغیب کے ساتھ علمی تقویت بھی ملے گی۔''

اس اشاعت خصوصی کی دستاویزی نوعیت سے انکار ممکن نہیں، امید ہے کہ فکر انقلاب کے سابقہ شماروں کی طرح اس ضخیم شمارہ کی بھی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ اور دار العلوم اور اکابر دار العلوم کی زندگی، ان کی سرگرمیوں اور ان کے کارناموں کو مرکز بنا کر تحقیقی اور تالیفی کام کرنے والوں کے لیے یہ خاص نمبر مشعل راہ ثابت ہوگا۔ ان کی علمی، تدریسی، تبلیغی، تربیتی اور فقہی خدمات سے نئی نسل کی آشنائی کا وسیلہ بنے گا، نیز یہ توقع ہے کہ اس پیش کش سے سبق لے کر نئے لوگ بھی اس میدان میں تحقیق کا حوصلہ دکھائیں گے اور مخفی گوشوں کو تحریر کا پیکر عطا کریں گے۔

اس کتابی شمارہ کا ٹائٹل دیدہ زیب، سرورق سادہ و جاذب اور طباعت بھی عمدہ ہے، کاغذ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی معیاری استعمال کیا گیا ہے۔

سہ ماہی انتساب عالمی (محمد خلیل نمبر)

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر سیفی سرونجی، مدیر: آفاق سیفی

صفحات: 312، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: اکتوبر تا دسمبر 2021

رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج۔ 464228 (ایم پی)

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

وسائل کے فقدان اور قاری کے بحران کے باوجود مجلّہ 'انتساب' سرونج (مدھیہ پردیش) نے ملک اور بیرون ملک میں اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ 40 سال سے یہ مجلّہ تواتر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا بھی جاتا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں انتساب کے کچھ خصوصی شمارے شائع ہوئے جو علمی اور ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ خاص طور پر زندہ شخصیات پر انتساب کی خصوصی اشاعتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، مگر بیشتر خصوصی شمارے علوم و ادبیات سے جڑی ہوئی شخصیات سے متعلق ہی تھے۔ پہلی بار سہ ماہی 'انتساب عالمی' نے ایک سائنس داں پر خصوصی شمارہ شائع کیا ہے جو محمد خلیل سے مختص ہے اور جن کی سائنسی خدمات سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ CSIR (کونسل آف سائنٹفک اینڈ ایڈسٹریل ریسرچ) کے انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والے مشہور رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی ایک شناخت ہے اور سائنسی موضوعات اور مسائل پر تصنیفات اور مقالات کی وجہ سے بھی اردو کے حلقے میں یہ ایک جانا پہچانا چہرہ ہے۔ محمد خلیل کی تقریباً 14 سے زائد کتابیں سائنسی موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں جن میں حیوانات کی دلچسپ دنیا، عجیب و غریب جانور، ڈاکٹر سی وی رمن ایک عظیم سائنس داں، سائنسی ایجادوں کی کہانی اور دوسری کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان کا یہ جذبہ اور جنون قابل رشک ہے کہ انھوں نے اس معاشرے میں سائنسی شعور اور ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی جو مکمل طور پر شعر و ادب میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو میں سائنسی مباحث اور موضوعات پر لکھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ ایسے میں خلیل صاحب اور ان کی قبیل کے وہ افراد جو اردو میں سائنس پر تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں، قابل مبارکباد ہیں۔ انتساب عالمی کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے عصر حاضر میں اردو اور سائنس کے رشتے کی اہمیت اور معنویت کے مدنظر ایک شمارہ محمد خلیل کی سائنسی خدمات کے لیے وقف کیا، یہ قابل تحسین عمل ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اردو اور سائنس سے جڑی ہوئی مقتدر اور معتبر شخصیات کی بیش قیمت تحریریں ہیں۔ اس میں اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ خاکے، مضامین، مشاہیر کی آرا اور قارئین کے خطوط پر مشتمل اس خصوصی شمارے میں محمد خلیل کے سائنسی مضامین پر تنقیدی اور تعریفی نگارشات ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''محمد خلیل صاحب ہمارے موجودہ علمی تناظر میں ان قلیل ترین حضرات میں سے ایک ہیں جنھوں نے عمر عزیز کا بڑا حصہ سائنسی علوم کی آگاہیوں کی نہ صرف تحصیل میں صرف کیا بلکہ 50-40 برسوں سے مسلسل سائنسی مضامین بھی لکھتے آرہے ہیں۔'' اسی طرح پروفیسر شارب ردولوی نے محمد خلیل کی سائنسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''محمد خلیل کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حیوانات اور دوسرے سائنسی موضوعات پر مضامین لکھ کر لوگوں میں سائنسی نقطہ نظر اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آج اردو کو ایک نہیں کئی محمد خلیل کی ضرورت ہے۔'' انگریزی میں جن اہم شخصیات نے محمد خلیل کو خراج تحسین پیش کیا ہے ان میں خوشونت سنگھ، ڈاکٹر عبید صدیقی، پروفیسر سید احتشام حسنین، انیتا جوشوا، ڈاکٹر اے پی مترا، ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر محمد خالد صدیقی جیسی اہم شخصیات قابل ذکر ہیں۔ علم و ادب کی مقتدر شخصیات نے محمد خلیل کی سائنسی کتابوں پر اپنے گراں قدر تاثرات بھی پیش کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد خلیل نے سائنسی موضوعات ہی کو نہیں بلکہ رسالہ 'سائنس کی دنیا' کو بھی مقبول اور مفید عام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور اس میں انھیں بہت حد تک کامیابی بھی ملی تھی۔ پدم شری پروفیسر اے رحمٰن (سابق ڈائرکٹر نستاڈس، سی ایس آئی آر) جو رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے بانی اور نگراں تھے، انھوں نے بھی محمد خلیل کی سائنسی تحریروں اور تصانیف کو سراہتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''ان کا تحریری انداز پڑھنے کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے، ان کی زبان سلیس ہے، وہ مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے موضوعاتی کینوس پر گفتگو کرتے ہوئے محمد خلیل کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''محمد خلیل کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ ان کی ڈگری نباتات پر ہے لیکن انھوں نے سائنس کے تقریباً تمام موضوعات پر آسان، عام فہم تحریریں لکھی ہیں— ان میں حیوانیات، ماحولیات، کیمیا، صنعتی کیمیا، علم ہیئت، فلکیات اور فلکیاتی طبعیات جیسے مضامین شامل ہیں۔''

انتساب عالمی کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب پوری اردو دنیا کی طرف سے تہنیت اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے محمد خلیل کی سائنسی خدمات پر ایک وقیع شمارہ شائع کیا۔ اس شمارے کو بامعنی اور معتبر بنانے کے لیے نائب مدیرہ استوتی اگروال کو بھی مبارکباد دی جانی چاہیے کہ اس میں ان کی خاص محنت، لگن اور جذبہ بھی شامل ہے۔ ■

عالمی اردو نامہ

دنیائے ادب میں پنچ تنتر کی معنویت وافادیت

تاجکستان: تاجک اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز دوشنبہ کے زیراہتمام 'دنیائے ادب میں پنچ تنتر کی معنویت وافادیت' کے موضوع پر ایک خصوصی لکچر کا انعقاد کیا گیا جسے تاجک نیشنل یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیائے ادب میں پنچ تنتر کے گراں قدر رول اور اس کی معنویت وافادیت صدیوں سے برقرار ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے بچے، جوان اور بوڑھے سب دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر صدف نے کہا کہ پنچ تنتر میں عقل اور حکمت کی باتیں بھری پڑی ہیں اور اس میں انسان کی فکری اور ذہنی تاریخ محفوظ ہوگئی ہے نیز ہندوستان کے دانشوروں کے تجربات کا اسے نچوڑ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ کتاب حکمرانوں کی توجہ کا مرکز بھی بنتی رہی ہے۔ پہلوی، فارسی، عربی، شامی وغیرہ سے لے کر کم وبیش دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مشتاق صدف نے مزید کہا کہ پنچ تنتر کا اسلوب اپنی برجستگی کے سبب ہمارے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ کتاب دراصل انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بیشتر کردار جانور ہیں جو انسان کی طرح حرکتیں کرتے ہیں۔ ان میں حسد، نفرت، محبت، دوستی، لالچ، رشک، چالاکی، فریب غرض کہ آدمی کا ہر نفسیاتی پہلو موجود ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لیے پنچ تنتر سے بہتر کوئی تصنیف نہیں۔ اس اعتبار سے اس کی کہانیوں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ کہانیاں دلچسپ اس لیے بھی ہیں کہ ہر کہانی کے اندر دوسری کہانی اور دوسری کہانی میں تیسری کہانی شامل ہے۔ یہ انداز الف لیلہ میں بھی ملتا ہے۔ اس تقریب کی صدارت انسٹی ٹیوٹ میں شعبۂ ہندی کے چیئرمین ڈاکٹر سید زادہ اویس الدین نے کی۔ انھوں نے پروفیسر مشتاق صدف کے اس بے حد معلوماتی خصوصی لکچر کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالی۔ اس محفل میں تاجک اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز بنام سوتم الغزادہ کے اساتذہ ڈاکٹر بابا رجب جمعہ، ڈکٹر احدوف بہمنیار، مس رخسانہ وغیرہ نے خصوصی طور پر شرکت کی جب کہ ہندی، عربی، فارسی اور چینی زبانوں کے طلبہ وطالبات نے اپنی موجودگی درج کرائی۔ اس لکچر کا تاجکی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر اہتم شاہ یونسی نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مئی 2022

خلیج اردو کانفرنس

دوحہ قطر: گزشتہ دنوں دوحہ میں بزم صدف کی شاخ نے اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد خلیج اردو کانفرنس منعقد کی اور ساتھ ہی کل خلیج مشاعرہ بھی کروایا۔ پروگرام کے افتتاحی اجلاس کی صدارت بزم صدف انٹرنیشنل کے سرپرست اعلی جناب حسن عبدالکریم چوگلے نے کی، انھوں نے اپنے خطاب میں تنظیم کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام ذمہ داران کی ستائش کی اور بطور خاص کتابوں کی اشاعت کا ذکر کیا جو تنظیم کے زیر اہتمام شائع ہوتی ہیں، کتابوں کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کتابیں انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔ بزم کے چیئرمین شہاب الدین احمد کے حوصلوں کی انھوں نے داد بھی دی۔ محترمہ صوفیہ بخاری (اہلیہ مرحوم صبیح بخاری) نے اردو زبان کی ترسیل اور اس کی وسعت پر خاطر خواہ گفتگو کی۔ مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر ثروت زہرا نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض محترمہ عائشہ شیخ عاشی نے ادا کیے۔ اس کے علاوہ بحرین سے ریاض شاہد، عمان سے طفیل احمد، کویت سے مسعود حساس اور شارجہ سے سمیعہ ملک ناز نے شریک ہوکر مشاعرے کے وقار میں اضافہ کیا۔

پروگرام کے افتتاحی اجلاس کی نظامت معروف شاعر احمد اشفاق نے کی جس میں ڈاکٹر ثروت زہرا نے 2019 میں اعلان شدہ اپنا؛ بزم صدف نئی نسل ایوارڈ، بہ نفس نفیس قبول کیا۔ بزم صدف دوحہ چیپٹر کے صدر ڈاکٹر ندیم جیلانی دانش نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس سیشن میں مہمان خصوصی معروف سماجی شخصیت اور بزنس مین جناب عظیم عباس اور مہمانان اعزازی محترمہ صوفیہ بخاری اور پروفیسر سید جاوید زیدی تھے۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں خلیج کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے شعرا وادبا کے ساتھ ایک دلچسپ اور معلوماتی مذاکرہ بعنوان ؛خلیج اردو کا نیا دبستان؛ منعقد کیا گیا جس کی میزبانی احمد اشفاق اور ڈاکٹر ندیم جیلانی دانش نے مشترکہ طور پر بخوبی انجام دی، اس سیشن میں شرکا نے اپنے اپنے ملک میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے جاری سرگرمیوں کا احاطہ کیا، زبان کی وسیع تر ترسیل کے لیے تراجم کی اہمیت اور اردو کے رسم الخط کو برقرار رکھنے کے ضمن میں جاری بحث پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ہندی کی ناول نگار گیتانجلی شری کو ان کے ناول کے ترجمے پر بین الاقوامی بکر انعام کے اعلان پر بھی شرکاء نے مسرت کا اظہار کیا۔

عالمی مشاعرے میں طاہر جمیل، راقم اعظمی، مانسی شرما، مقصود انور مقصود، ندیم جیلانی دانش، احمد اشفاق، سمیعہ ناز ملک، عائشہ شیخ عاسی، مسعود حساس، ریاض شاہد، طفیل احمد، ثروت زہرا نے اپنا کلام سنایا۔

آخر میں بزم صدف دوحہ چیپٹر کے صدر ڈاکٹر ندیم جیلانی دانش نے مہمانوں اور بزم صدف کی دوحہ کی مجلس عاملہ کے اراکین بطور خاص پروگرام کوآرڈینیٹر محمد عرفان اللہ، نائب صدر صباح الدین اور بزم صدف بین الاقوامی امور کی صدر رفعت جہاں علی کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب میں دوحہ کی ادبی و نیم ادبی تنظیموں کے ذمہ داران اور خاص شخصیات نے شرکت کی جن میں بطور خاص جناب شکیب ایاز، جناب گوہر الطاف، جناب بلال احمد خان، جناب نجم الحسن خان، جناب بلچندانی، جناب بہاء الدین، جاوید عالم صدیقی، جناب لیاقت ملک، جناب جاوید احمد، جناب سجاد احمد، عمران اسد، اوپ پرکاش پریڈا، رحمت اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: شہاب الدین احمد، چیئرمین بزم صدف، دوحہ، 10 جون 2022

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

’اے پی جے عبدالکلام کے خوابوں کا بھارت‘ کے عنوان سے منعقدہ مسابقہ مضمون نگاری میں کامیاب ہونے والے طلبہ وطالبات کو انعامات

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کے زیراہتمام سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش 15 اکتوبر کی مناسبت سے اسکولی طلبہ وطالبات کے مابین مضمون نگاری کے قومی مسابقے کا اعلان کیا گیا تھا، جس میں کامیاب ہونے والے طلبا وطالبات میں تقسیمِ انعامات کے لیے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں خصوصی

تقریب کا انعقاد کیا گیا، اس پروگرام کے مہمان خصوصی مسلم راشٹریہ منچ کے سرپرست اور آر ایس ایس لیڈر اندریش کمار تھے۔

تقریب تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے اندریش کمار نے کہا کہ آج کا پروگرام سیاسی یا مذہبی نہیں ہے بلکہ سماجی اور تعلیمی ہے، جس کے لیے میں کونسل اور اس کے ڈائرکٹر پروفیسر عقیل احمد کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے اس مسابقے میں حصہ لینے اور کامیابی حاصل کرنے والے تمام طلبہ وطالبات کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر کلام کی شخصیت اوران کی فکر پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر کلام کی شناخت میزائل مین اور ملک کے صدر جمہوریہ کی ہے، مگر ساتھ ہی وہ تعلیم کے بہت بڑے پیامبر اور داعی تھے، کیونکہ تعلیم نے ہی انھیں ایک عام مچھلی پالنے والے خاندان سے اٹھا کر ملک کا صدر جمہوریہ بنایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام اور انسانیت دونوں چیزیں ان کی زندگی کا اہم جز تھیں اور انھوں نے دونوں راہوں پر چل کر کامیابیاں حاصل کیں، کردار کی پختگی ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھی اور اپنے کاموں سے انھوں نے اس کا مظاہرہ کیا۔ اندریش کمار نے کہا کہ کلام آج کی بڑی ضرورت ہیں اور ان کی فکر ہماری نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کی تعمیر وترقی، اس کی ہمہ گیر فلاح اور امن وامان کے قیام کے لیے اے پی جے عبدالکلام کی زندگی کو نمونہ بنانا ضروری ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیت عبدالکلام کی شخصیت کا بنیادی عنصر ہے اور یہی ہر ہندوستانی کی شخصیت کا حصہ ہونا چاہیے۔

اس سے قبل پروگرام کے شروع میں تعارفی خطاب کے دوران کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مختصراً اندریش کمار کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی سماج کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں اندریش جی کا اہم کردار ہے۔ مضمون نگاری کے اس مسابقے کا انعقاد انھی کے کہنے پر کیا گیا ہے اور اس کے لیے سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کی شخصیت کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ وہ اس ملک کے تمام طبقات کے لیے آئیڈیل ہیں۔ شیخ عقیل نے اے پی جے عبدالکلام کی ہمہ گیر شخصیت اور ملک کی تعمیر و ترقی کے تئیں ان کی فکر پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی سائنسی و روحانی حیثیت کو بالخصوص آشکار کیا۔

مسابقۂ مضمون نگاری میں اول پوزیشن ابوعبیدہ خان بن حکیم عرفان خان (شاہ پور اندرا مئو، یوپی)، دوم پوزیشن علوی ذکیہ ثروت بنت افسر امام (ایس کے وی اسکول نور نگر، دہلی) اور سوم پوزیشن وافیہ شہزین بنت محمد تقی (ایم ایس کریٹیو ہائی اسکول، مہدی پٹنم، حیدرآباد) نے حاصل کی۔ ان تینوں طلبہ و طالبات کو مہمانِ خصوصی کے ہاتھوں بالترتیب دس ہزار، سات ہزار پانچ سو اور پانچ ہزار کے نقد انعام اور سندِ توصیفی سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ پانچ طلبہ و طالبات کو تشجیعی انعامات 1000 روپے اور توصیفی سند سے نوازا گیا، جن میں عاتکہ فہیم (کوٹہ، راجستھان)، نوشین عائشہ (کولکاتا، مغربی بنگال)، عرفات رابعہ (اسرارآباد، جموں و کشمیر)، محمد ذاکر حسین (فیض آباد، یوپی)، اور محمد یوسف کمال (مظفرپور، بہار) شامل تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر وسیم راشد نے انجام دیے۔

آخر میں شیخ عقیل احمد نے کلمات تشکر پیش کیے اور کامیاب ہونے والے تمام طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اپنی زندگی کو کارگر بنانے اور بلندیوں سے ہم کنار ہونے کے لیے آپ بھی انھی کی طرح سخت جدوجہد کی عادت ڈالیں اور ایسے اونچے خواب دیکھیں جو آپ کو سونے نہ دیں اور انھیں شرمندۂ تعبیر کر کے دم لیں۔ اس تقریب میں کونسل کے تمام اسٹاف اور منتخب اہلِ علم و دانش شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 مئی 2022

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لسانیات و سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج لسانیات و سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر ابوذر عثمانی نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام شرکا اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل چوں کہ اردو زبان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے سرگرمِ عمل ہے، اسی لیے مختلف عنوانات کے تحت باقاعدہ پینل تشکیل دیے گئے ہیں تاکہ

ان پر عمدہ اور معیاری کتابیں مرتب کروا کے شائع کی جائیں اور اردو زبان کے علمی و ادبی ذخیرے میں اضافہ کیا جائے۔ لسانیات اور سماجی لسانیات بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس موقعے پر پچھلی میٹنگ میں پیش کردہ تجاویز کی تائید کی گئی اور پینل کے تحت جاری مختلف تصنیفی و تحقیقی پروجیکٹس پر تبادلۂ خیال اور غور و خوض کیا گیا۔ جن تحقیقی و تصنیفی پروجیکٹس پر اس دوران گفتگو ہوئی ان میں تیلگو اردو لغت، اردو ملیالم لغت اور اردو کشمیری لغت بطور خاص قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ اردو زبان، لسانیات اور اردو تدریس سے متعلق مختلف منصوبے زیر بحث آئے جن پر کونسل کے زیر اہتمام کتابیں شائع کی جائیں گی۔ پروفیسر ابوذر عثمانی نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ سماجی لسانیات پر انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں سے استفادہ کر کے اردو میں ایک جامع کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پینل کی طرف سے جو علمی و تحقیقی پروجیکٹ منظور ہوں انھیں وقت مقررہ پر پورا کرنے پر زور دیا جائے۔ انھوں نے اس میٹنگ کے انعقاد پر ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف اس موضوع سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور ان شاء اللہ ان کی سربراہی میں اس پینل کے تحت عمدہ کتابیں منظر عام پر آئیں گی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر اے آر فتیحی، پروفیسر امتیاز حسنین، پروفیسر اودیش کمار مشرا، پروفیسر اعجاز محمد شیخ، پروفیسر نذیر احمد، جناب محمد اشرف نندن اور کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) محمد شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 مئی 2022

نندلال نیرنگ سرحدی کے مجموعۂ کلام 'تعمیر بقا' کی تقریبِ اجرا

نئی دھلی: نندلال نیرنگ سرحدی اپنے عہد کے نابغۂ روزگار فنکار، تخلیق کار، شاعر، ادیب، نثر نگار اور مترجم تھے۔ اردو کے علاوہ دگر کئی زبانوں میں درک رکھتے تھے، انھوں نے اردو شاعری کو اپنے نتائجِ تخلیق سے مالا مال کیا اور غزلوں کے علاوہ دوسری متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شخصیت کو ادبی دنیا سے متعارف کروانا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں نیرنگ سرحدی کے مجموعۂ کلام 'تعمیر بقا' کے اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ نیرنگ لال سرحدی کی زندگی کے بہت سارے پہلو ہیں، ان کی

شخصیت گویا ایک انجمن تھی جس میں مختلف اصناف جگنو کی طرح جگمگا رہے تھے۔

شیخ عقیل نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو والوں پر احسان کیا ہے کہ اپنے عہد کے اتنے اہم، مخلص اور بڑے شاعر و ادیب کی تخلیقات حاصل کر کے انھیں سلیقے سے جمع کیا اور پھر ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع کر کے اردو دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مہرا نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی پرانی یادیں شیئر کیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نندلال نے کئی اصناف پر شاعری کی اور اردو ادب کو مالا مال کیا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے بہترین نمائندہ تھے۔ نیرنگ سرحدی کے صاحبزادے نریش نارنگ نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے والد کی یادیں تازہ کیں اور بتایا کہ کیسے انھوں نے اپنی زندگی گزاری، ان کے اخلاق، چال ڈھال، لباس و پوشاک وغیرہ میں انفرادیت اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ اس پروگرام کے انعقاد کے لیے انھوں نے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ معروف دانشور اور ایکٹوسٹ سیدہ سیدین حمید نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نیرنگ سرحدی کی شاعری دل کو چھونے والی ہے

اور حقیقی معنوں میں وہ ہمارے سماج اور معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی زندگی میں جو اخلاقی و انسانی قدریں پائی جاتی تھیں، آج ہمیں انھیں اپنانے کی ضرورت ہے۔اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ اور نیرنگ سرحدی کے بیٹے، بہو اور دیگر اہل خانہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 جون 2022

کرشنا شرما دامنی کے شعری مجموعے 'شدت عشق' کا اجرا

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں ہندی و اردو کی شاعرہ کرشنا شرما دامنی کے شعری مجموعے 'شدت عشق' کا اجرا کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد و دیگر شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے شیخ عقیل کہا کہ دامنی صاحبہ کی شاعری میں حسن و عشق اور زندگی کے تمام رنگ پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر عقیل نے کہا کہ اپنی شاعری میں انھوں نے اردو کے ساتھ ہندی شاعری کی علامات و استعارات کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے اور اس طرح ہندی اور اردو کو قریب لانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔

افضل منگلوری نے کہا کہ کرشنا شرما دامنی اپنی شاعری اور شخصیت کے ذریعے سماجی اتحاد

کا پیغام دیتی ہیں جو ان کا امتیاز ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے شاعرہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیق غیر معمولی ریاضت، تخلیقی جدوجہد اور عمدہ فن کاری کا نمونہ ہے۔ اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کی حصولیابیوں پر بھی مبارکاد پیش کی کہ اس سے دونوں زبان والوں میں بھی اتحاد و اشتراک پیدا ہوگا۔انھوں نے کہا کہ ان کی شاعری زبانِ اردو سے ان کے عشق کی شدت کی نمائندہ ہے اور اس میں سادگی کے ساتھ حسن بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔

حقانی القاسمی نے مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرشنا شرما دامنی نے اپنی شاعری کے ذریعے عورت کی داخلی سائیکی اور عشق کی وجدانی کیفیات کی بہترین عکاسی کی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں محبت کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ عشق کے اس باب کو زندہ کیا ہے جو ہمارے ذہنوں سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا کہ دامنی کی شاعرانہ فکر وحدت پرستی پر قائم ہے اور وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے سماجی ہم آہنگی کے قیام کے لیے قابل قدر کوششیں کر رہی ہیں، آج ہر گھر کو ایسی دامنی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مسرت نے کہا کہ کرشنا شرما دامنی نے اپنی غزلوں میں حسن و محبت کے معاملات کے علاوہ گرد و پیش کے حالات کی بھی بہت خوب ترجمانی کی ہے۔کرشنا شرما دامنی نے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حوصلہ افزائی میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔انھوں نے اردو زبان سے اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہر ہندوستانی کے اندر اردو زندہ ہے، بھلے ہی وہ اس کا اظہار نہ کرتا ہو۔انھوں نے کہا کہ ہندی والوں کو بھی ضرور اردو سیکھنی چاہیے کیونکہ اردو سیکھنے کے بعد وہ اپنی ہندی کو بھی سنوار سکتے ہیں۔

اس موقعے پر آل انڈیا ریڈیو کے عرفان اعظمی اور ہریانہ کے سابق ایڈیشنل کمشنر محمد عرفان نے بھی اظہار خیال کیا اور شعری مجموعے کی اشاعت پر کرشنا شرما دامنی کو مبارکباد پیش کی۔آل انڈیا اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کے سربراہ فرید احمد فرید نے اس خوبصورت تقریب کے انعقاد کے لیے کونسل اور ڈائرکٹر کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور فروغ اردو کے حوالے سے اپنے ٹرسٹ کی کارگزاریوں کا مختصراً تذکرہ کیا۔اس تقریب کی نظامت معروف شاعرہ اور صحافی ڈاکٹر وسیم راشد نے کی۔اس موقعے پر کونسل کے عملے کے علاوہ زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 جون 2022

اردو کے عہد ساز ناقد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی وفات پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشست

نئی دہلی: اردو کے عہد ساز ناقد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی وفات پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔اس موقعے پر پروفیسر نارنگ کی شخصیت و خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ نارنگ صاحب مشہور و معروف ادیب، بین الاقوامی دانشور اور اعلی درجے کے ناقد تھے۔شیخ عقیل نے کہا کہ ان کی مادری زبان گو کہ اردو نہیں تھی، مگر انھوں نے اپنی غیر معمولی کاوش سے اس زبان میں ایسا ملکہ حاصل کر لیا کہ وہ اردو دنیا کے عظیم ناقد و ادیب کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔انھوں نے کہا کہ نارنگ صاحب کی شخصیت کئی اعتبار سے ہم سب کے لیے سبق آموز ہے۔انھوں نے مشکل حالات میں بھی اپنی صلاحیت و قابلیت کی بدولت اپنے آپ کو منوایا اور اپنی وقعت و افادیت کو ثابت کیا۔ان کی قوت ارادی، ان کی جدوجہد اور حصولِ منزل کی ان کی کوشش اور لگن قابل تقلید تھی۔ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مابعد جدیدیت کے ادبی نظریے سے اردو دنیا کو متعارف کروایا، بلکہ اسے ایک تحریک کی شکل دی جس کے وہ سرخیل تھے۔ان کا علمی قد بہت بڑا تھا۔ وہ ایک ٹرینڈ سیٹر ناقد و ادیب تھے، جنھوں نے ادب کے تقریباً ہر پہلو پر کتابیں لکھیں، ان کی خدمات کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں، ایسے لوگوں کو ہی 'یگ پرش' کہا جاتا ہے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ نے نارنگ صاحب کے تعلق سے اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو زبان و ادب کی تو غیر معمولی شخصیت تھے ہی، مگر جب وہ کونسل کے وائس چیئرمین تھے تو ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ کرکے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بہترین منتظم اور مخلص مشیر بھی تھے۔کونسل کے ابتدائی دنوں میں اس کی خاکہ سازی میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا بھی اہم کردار رہا ہے۔اس موقعے پر کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے بھی اظہار خیال کیا اور کہا کہ ادبی و تنقیدی صلاحیت کے علاوہ نارنگ صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ ان کی زبان بہت اچھی تھی اور ان کی گفتگو بہت شائستہ، تلفظ بہت صاف اور اندازِ بیان بہت شگفتہ ہوتا تھا۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے نارنگ صاحب کی وفات کو ذاتی خسارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی بڑے انسان کے انتقال سے ایک پورا عہد متاثر ہوتا ہے، بلاشبہ نارنگ صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ان کی عظمت و علمیت کا اعتراف ان کے موافقین و مخالفین سبھی کرتے تھے، ان کی مادری زبان سرائیکی تھی، مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیمی و اقتصادی زبان کے طور پر اردو کو اختیار کیا اور اس میں غیر معمولی کمال حاصل کیا، وہ اردو زبان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اسے زبانوں کا تاج محل کہتے تھے۔انھوں نے کہا کہ نارنگ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ قوی و عمیق تھا اور ان کی شخصیت حقیقی معنوں میں نفع بخش اور فیض رساں تھی۔ان کی وفات سے اردو تنقید اور دانشوری کا ناقابل تلافی خسارہ ہوا ہے۔اس موقعے پر نارنگ صاحب کی آتما کی شانتی کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جون 2022

کمرہٹی میں یک سالہ ڈپلوما کورس برائے اردو زبان کا آغاز

کولکاتا: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی کے اشتراک سے کمرہٹی ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیرنگرانی یک سالہ ڈپلوما کورس برائے اردو زبان 23-2022 بمقام مرزا غالب اردو پرائمری اسکول 27 رحمت نگر، ایریہ دہ، کولکاتا 57، یکم اپریل 2022 سے آغاز ہوا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمد حدیث

اور نظامت کے فرائض مولانا آزاد کالج کے پروفیسر خالد محمد زبیر نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا محمد تاج الدین مصباحی، امام وخطیب، غریب نواز مسجد اور ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد رضی الدین موجود تھے۔ افتتاحی تقریب میں ادارے کے سکریٹری ماسٹر محمد شمیم نے یک سالہ اردو ڈپلوما کورس اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پر طلبا وطالبات کے درمیان مختصر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ کمرہٹی میں اردو اسٹڈی سنٹر کے قیام کے لیے خاص طور سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا شکریہ ادا کیا۔ ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسیٹی کے پروفیسر محمد رضی الدین، مولانا محمد تاج الدین مصباحی کے علاوہ ماسٹر شرف الدین نے اردو اسٹڈی سنٹر کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ ان طلبا وطالبات کے لیے سنہرا موقع ہے جو بنگلہ، انگلش اور ہندی میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس اردو اسٹڈی سنٹر سے وہ طلبہ اردو زبان سیکھ سکیں گے۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر محمد حدیث نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا۔ اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں ادارے کے دیگر ارکین ماسٹر جمیل احمد، ماسٹر انور جمال، محمد حفیظ، محمد منیر اور اظہر امام دلکش کے علاوہ مہتاب عالم خان نے بھی کافی محنت کی۔

محمد شمیم، سکریٹری، کولکاتا، 10 مئی 2022

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

انٹرنیشنل صوفی لیکچر اور عید ملن

پٹیالہ: 12 اپریل 2022 کو بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹیڈیز، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی (NCPUL) کے تعاون سے انٹرنیشنل صوفی لیکچر اور عید ملن پروگرام منعقد کیا گیا، جس کا عنوان 'Philosopy of Sufism: Comparative Perspective of Iban-e-Arabi and Rumi' رکھا گیا تھا۔

پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹیڈیز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حبیب نے پروگرام میں شرکت کرنے والے سبھی مہمانِ گرامی کو خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی انھوں نے بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹیڈیز کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ اس کے بعد ڈین کالجز پروفیسر گورپریت سنگھ لیہل نے صوفی شاعر ابن عربی اور رومی کے علم و ادب سے حاضرین کو متعارف کروایا۔ انھوں نے بتایا کہ صوفی شاعر اور اخلاقی تعلیمات کو عام کرنے میں اِن صوفی شعرا کا اہم رول رہا ہے۔

پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اَروِند نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ابن عربی اور رومی نے اپنی شاعری سے نہ صرف صوفی ازم کو فروغ دیا بلکہ ایسے شعرا کی بدولت ہندوستانی زبان اور فارسی زبان کی بھی نزدیکیاں بڑھیں۔ آج بھی ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں کہیں نہ کہیں فارسی کے الفاظ ملے ہوئے ہیں۔ اردو کے نامور شاعر مرزا غالب اور ڈاکٹر علامہ اقبال کی شاعری میں ساٹھ فیصد الفاظ فارسی ہی کے ہیں۔ اِس کے علاوہ فارسی زبان کے ہندوستان میں آنے سے عظیم صوفیوں کی حکایات اور شاعری یہاں پڑھی جانے لگی، اسی طرح ہندوستانی کلچر کے اثرات ایرانی تہذیب پر بھی پڑے۔ اِس پروگرام میں امریکہ سے تشریف لائیں ڈاکٹر لیلہ چمن خاں نے اپنا مقالہ فارسی میں پڑھا جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر زین العباء، لیکچرار پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی طرف سے کیا گیا۔ ڈاکٹر لیلہ خاں نے اپنے مقالے کے ذریعے بتایا کہ ابن عربی اور رومی کی شاعری

خدا کی وحدانیت اور بلندی کو بیان کرتی ہے اور اِن صوفیاء کرام کی حکایات اور شاعری کو پڑھنے کی بعد ہمیں عشق حقیقی، عشق مجازی اور عشق روحانی کا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

پروگرام کے اختتام میں پنجابی یونیورسٹی کی رجسٹرار ڈاکٹر درشن کور نے صوفی شاعری اور صوفیاءِ کرام کی دینی اور اخلاقی خدمات پر روشنی ڈالی اور پروگرام میں شرکت کرنے والے سبھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر عابد علی خاں، بابا فرید سینٹر فار صوفی اسٹیڈیز، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ پنجاب، 15 مئی 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

امیر خسرو یادگاری خطبہ

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیراہتمام بہ تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ امیر خسرو یادگاری خطبہ بعنوان 'کلام امیر خسرو میں حقوق بشر، قومی یکجہتی اور انسان دوستی' کا انعقاد کیا گیا۔ اردو کے معروف دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو نے آج سے

تقریباً سات سو برس پہلے جن نکات کو بیان کیا تھا آج دنیا انھیں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یونائٹڈ نیشن کے صدر دفتر میں سعدی کا وہ شعر لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی آدم ایک دوسرے کے اعضا ہیں، لیکن اس کے باوجود آج ہم تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہمارے اقدام اور ظاہری تصورات میں اتنا تضاد کیوں ہے۔ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم نے دنیا کو یہ بتایا ہی نہیں کہ امیر خسرو نے اس ملک کی کیسی تعریف کی ہے اور حقوق زن کے بارے میں کیا تصورات پیش کیے ہیں۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر اردو اور فارسی ادبیات پر بہت گہری ہے۔ قدرت نے انھیں یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مسائل کو بہت گہرائی میں اتر کے دیکھتے ہیں۔ آج کا یہ خطبہ بہت سے سوال پیدا کرتا ہے اور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم نے خسرو فہمی کے تقاضوں کو کتنا کم پورا کیا ہے۔ ہم اس گفتگو کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس موضوع پر ایک بڑے سمینار کا انعقاد کر سکتے ہیں تاکہ تشنہ گوشے سامنے آجائیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی ہمارے عہد کے بہت ممتاز اسکالر ہیں۔ انھوں نے جس موضوع کو ہاتھ لگایا اس میں ایسا اضافہ کیا جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ غالب، ذوق، اور دیگر اہم شعرا کے فکری اور فنی پہلوؤں پر لکچرس کا انعقاد کیا جائے تاکہ لوگ ادب کے اہم موضوعات پر نئے پہلوؤں سے غور کریں۔ جناب خورشید عالم نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یادگار خطبہ اپنے موضوع اور مقرر کی علمی حیثیت دونوں وجہ سے بہت عمدہ اور معلوماتی تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں آپ سب نے شرکت کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 مئی 2022

ونود کمار ترپاٹھی بشر کی حیات وشاعری

نئی دھلی: انجمن ترقی ردو (ہند) کے زیراہتمام اردو گھر میں دور حاضر کے مشہور شاعر ونود کمار ترپاٹھی بشر کی حیات و شاعری پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ونود کمار ترپاٹھی بشر کا گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا جب کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے عملے نے دوسرے مہمانان کا استقبال کیا۔ تقریب کے آغاز میں معروف شاعر محمد انس فیضی نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ موجودہ دور میں انجمن ترقی اردو (ہند) اردو کی جو خدمات کر رہی ہے وہ اردو کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھی جائیں گی۔

معروف شاعر معین شاداب نے پروفیسر ترپاٹھی کی حیات و شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب ہم ونود کمار ترپاٹھی بشر کا ذکر کرتے ہیں تو الہ آباد یونیورسٹی کو فراموش نہیں کر سکتے، الہ آباد یونیورسٹی نے ملک کو ایسے بہت سے افراد دیے ہیں جو افسران ہونے کے ساتھ علم و ادب اور شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں، ونود کمار ترپاٹھی بھی ان افراد میں شامل ہیں۔ ان کی دونوں کتابیں 'میری زمین میرا آسمان' اور 'میری زمین کی دھوپ' بہت مقبول ہوئیں، ان کتابوں میں وہ اشعار پڑھنے کو ملے ہیں جو موجودہ دور کی شاعری میں نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ بشر نے اپنی شاعری میں سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کی اعلیٰ قدروں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دوران ٹی وی جرنلسٹ صائمہ خان اور معروف شاعر انس فیضی نے ونود کمار ترپاٹھی سے ان کی حیات و شاعری پر گفتگو بھی کی۔ تقریب کے آخر میں معروف گلوکار شکیل احمد نے ونود کمار ترپاٹھی کا کلام پیش کر کے تقریب کو رونق بخشی۔ اس موقعے پر علم و ادب سے وابستہ افراد نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2022

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں استقبالیہ

نئی دھلی: اردو کے معروف نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ (مقیم حال امریکہ)

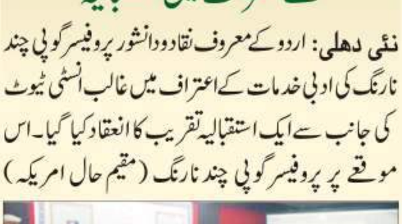

نے آن لائن شرکت کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو میرے لیے ایک بھید بھرا بستہ ہے میں حیران ہوں کہ مجھے سرائیکی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانیں آتی ہیں لیکن نہ معلوم اس زبان میں کیا جادو ہے کہ مجھے کسی زبان کی طرف ایسی رغبت نہیں جیسی اردو کی طرف ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو غزل نے 20 سے زیادہ ممالک کا سفر کیا لیکن کسی دوسرے ملک میں ایک ثقافتی مظہر کے طور پر لوگوں کے ذہن میں اپنی جڑیں اس طرح پیدا نہیں کر سکی جیسا ہندوستان میں کیا۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام اراکین اور جلسے میں موجود تمام حاضرین کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری اتنی عزت افزائی فرمائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو

کے ایسے دانشور ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی ایسا کوئی طالب علم ہوگا جس نے ان سے استفادہ نہ کیا ہواور کوئی ایسا ادیب نہ ہوگا جس نے ان سے تعلق پر فخر نہ کیا ہو۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ صاحب اس دور کے اردو کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں بڑی بصیرت اور ریاضت شامل ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے میرے دیرینہ مراسم ہیں اور میں نے انھیں علمی سفر میں ہمیشہ تازہ دم دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ ریاضت پر بھروسہ کیا اور شخصی تنقید سے گریز کیا۔ یہی سبب ہے کہ آج پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے، ان کا نام بطور رہنما لیا جاتا ہے۔ جناب سیفی سرونجی نے کہا کہ میں نے زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا جو اردو سے ٹوٹ کے محبت کرتا ہو۔ وہ بڑے عالم ہی نہیں بڑے انسان بھی ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو ایسی بات کہتا ہے جو سب سے ہٹ کر ہو اور بصیرت میں جلا پیدا کرے۔ یہ وصف نارنگ صاحب کے یہاں بخوبی موجود ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مجھے نارنگ صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے اور انھوں نے مجھے کئی سطح پر بہت متاثر کیا، وہ جید عالم، بہترین مقرر اور اچھے منتظم ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 مئی 2022

اتر پردیش

ساحر: فن اور شخصیت

لکھنؤ: ساحر لدھیانوی ترقی پسند شاعروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت ومقبولیت آج بھی پوری آب و تاب سے قائم ہے۔ ان کی نظمیں اثرانگیز اور دلوں میں اتر جانے والی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام 'تلخیاں' نوجوان نسل کو متاثر کرنے والی شعری کتابوں کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ ہندوستان کی فلمی شاعری کے معیار کو بلند کرنے اور فلمی نغموں میں ادبی حسن پیدا کرنے کے حوالے سے بھی ان کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار نوشاد سنگیت ڈیولپمنٹ سوسائٹی کے زیراہتمام واتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد دو روزہ سمینار 'ساحر لدھیانوی فن اور شخصیت' کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب وشاعر حسن کمال نے ہوٹل میزبان میں کیا۔ کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور کنوینر پروگرام اطہر نبی نے مہمانان اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی اور استقبالیہ خطاب پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساحر جتنے بڑے شاعر، ادیب اور مشہور گیت کار تھے، اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی یونیورسٹی) نے سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ساحر کی شاعری میں مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے کچلے ہوئے طبقوں سے ہمدردی کے جذبات ملتے ہیں۔ معروف ادیب وفلم رائٹر سہیل اختر وارثی نے کہا کہ ساحر کی شاعری کا محور انسانیت کا فروغ ہے، اس کے فلمی گیتوں کا مرکزی خیال یہی ہے کہ اس نے فلم کو ادب سکھایا، یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ سمینار کے دیگر مقالہ نگار ومقررین میں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ارشاد احمد خان، حسن کاظمی، سلیم خان (ممبئی)، اسلم خان (ممبئی)، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، صحافی پردیپ کپور وراج ویررتن وغیرہ تھے۔ سمینار میں معززین شہر کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 مئی 2022

ایک شام یوم انقلاب کے نام

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور سوانگ شالا ایکٹنگ اکادمی، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام سے 9/مئی 2022ء کو بمقام اپلائڈ سائنس آڈیٹوریم،

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں پہلی جنگ آزادی کی سالگرہ (10/مئی، 1857) کے موقع پر ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت کے فرائض معروف ڈرامانگار اور ہدایت کار نیرج شرما نے کی۔ مہمان خصوصی کے بطور روزنامہ ہندوستان کے ایڈیٹر سوریہ کانت ترویدی اور مہمان ذی وقار کے بطور سابق وزیر حکومت اتر پردیش ڈاکٹر معراج الدین احمد نے شرکت کی اور خصوصی مقرر کے بطور معروف تاریخ داں پروفیسر کے ڈی شرما شریک ہوئے۔

پروگرام کے انعقاد میں ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی وغیرہ کا خاص تعاون رہا۔

پروگرام کا آغاز پروفیسر کے ڈی شرما اور دیگر مہمانان نے شمع جلا کر کیا۔ بعد ازاں مہمانان کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا اور سوانگ شالا ایکٹنگ اکادمی کے سرپرست اور صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا استقبال اور سوانگ شالا، میرٹھ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس تنظیم نے اپنے کامیاب سفر کے دوران شہر کے متعدد مقامات پر سماجی مسائل پر مبنی مختلف ڈرامے پیش کر کے تہذیبی وراثت اور اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جسے شہر کے غیور عوام نے خوب سراہا ہے اور آج کا یہ پروگرام بھی ان شہیدوں کی عظیم قربانیوں کے نام ہے جنھوں نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا بلکہ انگریزوں کے دانت کھٹے کردیے تھے اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے زبردست قربانیاں پیش کی تھیں۔ ان شہیدوں کی قربانیوں اور ان کی عظمت کو سلام۔

بعد ازاں معروف ادیب سریش بسو کی انعام یافتہ کہانی 'آداب' پر مشتمل ڈراما 'کالی رات کے ہمسفر' کھیلا گیا جس میں بھارت بھوشن شرما کی ہدایت پر ہیمنت گویل، جتن کمار، شاداب ویٹوی، وشال شرما، سنیل سینی، دیویندر پرتاپ رانا، محمد شمشاد، محمد عمران، فیضان ظفر وغیرہ نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ جب کہ پردے کے پیچھے لائٹ مین جیتیندر رسی۔ راج۔ ساج سجا عابد سیفی، میک اپ ساجد عرف لوی، گلوکار ابھیشیک بھاردواج اور موسیقی انل شرما نے پیش کی۔

اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر کے ڈی شرما نے کہا کہ 1857 میں پورے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف زبردست غم وغصہ اور نفرت کی لہر اندرونی سطح پر موجزن تھی۔ اس میں علما، سیاسی رہنما، سماجی کارکن، کسان مزدور سبھی افراد میں ملک کو آزاد دیکھنے کی خواہش تھی اور اس جذبے کو میرٹھ میں تعینات فوجوں نے چربی لگے کارتوس کا استعمال نہ کر کے تقویت

بخشی۔ آخر میں مہمانان اور فن کاروں کو ٹرافی پیش کی گئی۔

اس موقعے پر ڈاکٹر سدھا شرما، ڈاکٹر عفت ذکیہ، فرح ناز، آفاق خاں، وارث وارثی، اسرار الحق اسرار، ایڈوکیٹ شعیب احمد، سواتی شرما، شاہ نور علی، فاروق شیروانی، سعید احمد سہارنپوری، عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ 10 مئی 2022

ایک شام رشید قریشی کے نام

لکھنؤ: آل انڈیا بزم جوہر لکھنؤ کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن ہال امین آباد میں معروف شاعر اور ماہنامہ لاریب کے بانی و مدیر رشید قریشی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'ایک شام رشید قریشی کے نام' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر رشید قریشی کو سابق ڈی جی پی رضوان احمد اور معروف صحافی احمد ابراہیم علوی اور محمد وصی صدیقی کے ہاتھوں شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت روزنامہ آگ کے سابق مدیر احمد ابراہیم علوی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر سابق ڈی جی اتر پردیش رضوان احمد اور ڈاکٹر مرزا عمیر بیگ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ادیب، صحافی وشاعر ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ تقریب کے آغاز میں احمد ابراہیم علوی نے اردو صحافت کے مسائل اور چیلنجز پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ رشید قریشی ہونا بہت مشکل ہے جس طرح وہ اپنی فکر اور اپنی سوچ پر قائم رہتے ہوئے لاریب کو تین دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ سے مستقل نکال رہے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ واصف فاروقی نے کہا کہ رشید قریشی ایک بے باک اور جرأت مند صحافی ہیں۔ رحمت لکھنوی نے رشید قریشی کی شاعری اور ان کے صحافتی سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ رضوان احمد فاروقی نے اردو رسائل کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کسی کو رشید قریشی کی فکر سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن رشید قریشی نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقعے پر پرویز ملک زادہ، ڈاکٹر مرزا عمیر بیگ، محی بخش قادری، ڈاکٹر ہارون رشید وغیرہ نے اپنے خیالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں ساحل عارفی، سلیم تابش، سلمان ظفر، عزم گونڈوی، محمد علی علوی، طارق سخا، سلیم ہمدم فیض آبادی، زبیر ادریسی سیتاپوری کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 مئی 2022

ترجمہ نگاری پر آن لائن پروگرام

میرٹھ: فکشن کے ترجموں میں یکسانیت نہیں ہوتی اس میں صرف کہانی کا کردار اہم ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت تسلسل کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کیونکہ کہانی میں تسلسل ہوگا تو قاری ضرور متاثر ہوگا۔ یہ الفاظ تھے بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو اور معروف فکشن نگار و ترجمہ نگار پروفیسر یعقوب یاور کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد پروگرام میں 'ترجمہ نگاری' پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر میں ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت معروف ادیب عارف نقوی، جرمنی نے کی اور خصوصی مقررین کی حیثیت سے این سی ای آر ٹی کے پروفیسر فاروق انصاری اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کی پروفیسر کہکشاں لطیف نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، تعارفی کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم سیدہ مریم الٰہی نے انجام دی۔ پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ترجمہ نگاری وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آج وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کو سمجھیں، دوسری زبانوں میں کیا تحریر کیا جارہا ہے انگریزی، ہندی، عربی، فارسی اور دیگر بہت سی زبانوں میں آج ترجمے کی بڑی ضرورت ہے۔ این سی ای آر ٹی کے پروفیسر فاروق انصاری نے کہا کہ مختلف تراجم کے لیے اصول تو وضع کردیے گئے ہیں لیکن جو بات سب سے اہم ہے یعنی تربیت سازی وہ ابھی نامکمل ہے اس پر کام ابھی نہیں ہوسکا ہے۔ یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ترجمہ کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جانا چاہیے کیونکہ تقابلی مطالعہ بھی ترجمے کا حصہ ہے اور ترجمہ عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ پروفیسر کہکشاں لطیف نے کہا کہ اگر اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے تعلق سے بات کریں تو تقریباً پندرہویں صدی میں ترجمہ نگاری اپنی ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس عہد میں جو ترجمے ہوئے ان میں بیشتر شعری ترجمے ہیں۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کی بہت سی تخلیقات کو تراجم کی شکل میں ڈھال کر مثنویات کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان کو خوب اچھی طرح سے سکھایا جائے کیونکہ مترجم کو گہرے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں عارف نقوی نے کہا کہ بلاشبہ آج کا موضوع بہت ہی عمدہ ہے اور یہ وقت کی ضرورت بھی ہے لیکن ہمیں ایسا ادب پیش کرنا چاہیے جو دوسرے لوگوں کے دلوں کو چھولے۔ ساتھ ہی موضوع کا انتخاب بھی ایسا ہی کرنا چاہیے جو دوسرے لوگوں کو متاثر کرسکے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر ریشما پروین، ڈاکٹر شہناز قادری، ڈاکٹر ہما مسعود، ڈاکٹر فرحت خاتون، ڈاکٹر صوفیہ شیریں، ڈاکٹر آمرین، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، نورین، ثانیہ صدیقی، ریاض انور، عبدالواحد، محمد شمشاد وغیرہ آن لائن موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 جون 2022

بہار

ڈراما کا فن اور صورت حال

پٹنہ: ''ڈراما زندگی کا عکاس اور سماج کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس میں تقریباً تمام فنون لطیفہ ایک ساتھ جمع ہوجاتے ہیں۔ تمام اصناف ادب ایک میز پر لکھی اور دوسری

میز پر پڑھی جاتی ہیں لیکن ڈراما صرف میز سے میز کا سفر نہیں ہے بلکہ بیچ میں اسٹیج بھی ہے جو ڈرامے کا بنیادی جزو ہے۔ اس کے بغیر ڈرامے کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔'' ان خیالات کا اظہار شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر محمد کاظم نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس طریقے سے انجینئر کے ذریعہ کاغذ پر بنائے گئے نقشے کو عمارت نہیں کہا جاسکتا اسی طرح صرف کاغذ پر لکھے گئے ڈرامے کو مکمل ڈراما نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ڈرامے میں سب کچھ عملی طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اس میں حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات وغیرہ بھی زبان کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس میں بے معنی الفاظ بھی معنی دار ہوجاتے ہیں۔ ایکٹر جب اپنے مکالمے میں موقع ومحل کے لحاظ سے بے معنی الفاظ کو زبان سے ادا کرتا ہے تو گویا ادائیگی کا طرز ان میں معنی کی روح پھونکتا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مورخہ 13 مئی کو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں 'ڈراما کا فن اور صورت حال' پر ایک خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے پروفیسر محمد کاظم کے سلسلے میں تعارفی کلمات پیش کیے۔ اس دوران انھوں نے بتایا کہ پروفیسر محمد کاظم کی دلچسپی اور تحقیق وتنقید کا خاص موضوع ڈراما ہے۔ وہ صرف ڈرامے پڑھتے اور اس پر صرف تنقید ہی نہیں لکھتے ہیں بلکہ ڈراموں میں عملی حصہ بھی لیتے ہیں۔ کلیدی خطبے کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا جس میں طلبہ وطالبات نے ڈرامے کے

فن اوراس میں امکانات کے سلسلے میں سوال وجواب کے ذریعہ معلومات بہم پہنچائیں۔ آخر میں پروفیسر جاوید حیات نے شکریے کی رسم ادا کی۔ انھوں نے کلیدی خطبہ کی اہمیت وافادیت اوراس کی معنویت پر روشنی ڈالی اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر مسعود کاظمی اور ڈاکٹر سرور عالم ندوی کے علاوہ شعبہ کے تمام ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

پریس ریلیز: شہاب ظفر اعظمی، صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، 14 مئی 2022

زبیر رضوی: شخصیت اور خدمات پر مذاکرہ

دربھنگہ: زبیر رضوی نے بطور شاعر اور ادبی صحافی اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی تھی اور ڈاکٹر عبدالحی کی یہ کتاب زبیر رضوی کی زندگی اور ان کی خدمات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ کتاب دیکھنے سے ہی ترتیب کا حسن اور دلکشی ظاہر ہوجاتی ہے۔ یہ باتیں معروف بزرگ شاعر، ناقد اور صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ سبکدوش استاد پروفیسر عبدالمنان طرزی نے

المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام عبدالحی کی مرتبہ کتاب 'زبیر رضوی شخصیت اور خدمات' پر منعقدہ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مذاکرے میں منظوم خطبہ صدارت پیش کیا اور مزید کہا کہ زبیر رضوی کی نظمیں اور غزلیں بہت مقبول رہی ہیں اور وہ 1960 کے بعد کے شعری منظرنامے میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں زبیر رضوی کے حوالے سے معتبر ناقدین کی معیاری تحریریں تو ہیں ہی ساتھ ہی ان کا غیر مطبوعہ کلام اور ان کے مضامین بھی شامل ہیں۔ کتاب میں زبیر کی یادگار تصاویر بھی ہیں جو کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

مذاکرے میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے معروف شاعر اور ایم آر ایم کالج کے استاد ڈاکٹر جمال اویسی نے کہا کہ زبیر رضوی کا رسالہ ذہن جدید اپنی نوعیت کا واحد رسالہ تھا جس کا سارا کام وہ خود کرتے تھے۔ ان کی اداریہ نویسی بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ عبدالحی کی یہ کتاب زبیر شناسی میں بہترین اضافہ ہے اور اب دوسرے لوگوں کو بھی ان کے حوالے سے کام کرنے کی ترغیب ملے گی۔

مذاکرے کے مہمان ذی وقار پروفیسر سید محمد احتشام الدین نے اپنا تبصراتی مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ زبیر رضوی کے حوالے سے یہ ایک دستاویزی نوعیت کی کتاب ہے۔ عبدالحی نے اس کتاب کے ذریعہ زبیر رضوی کے مختلف کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مثبت سوچ کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ کتاب پڑھ کر ان کی زندگی کے تمام پہلو روشن ہوجاتے ہیں۔ مذاکرے میں ملت کالج دربھنگہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد شاہنواز عالم نے کہا کہ میں حقانی القاسمی صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ عبدالحی نے پوری اردو دنیا کی جانب سے یہ کام کرکے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر محمد احسان عالم نے کہا کہ زبیر رضوی پر عمدہ مضامین سے مزین یہ کتاب زبیر رضوی کے پرستاروں کو یقیناً پسند آئے گی۔ معروف شاعر اور افسانہ نگار جناب انور آفاقی نے کہا آج فراموش کاری کا دور ہے اور ایسے وقت میں زبیر رضوی پر اس کتاب کی اشاعت سے انھیں زندہ جاوید کردیا گیا ہے۔ مذاکرے میں امریکہ کی نبراسکا یونیورسٹی میں سائنٹسٹ اور زبیر رضوی کی بیٹی ڈاکٹر فارحہ رضوی نے آن لائن شرکت کی اور سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی اپنے والد کی بہت ساری یادیں شیئر کیں اور کہا کہ وہ مشاعرے میں ان کے ساتھ جاتی رہی ہیں۔ وہ بہت محبت کرتے تھے، انھیں ہندوستان کی مٹی سے بہت پیار تھا اور اسی پیار نے ان سے یہ ہے میرا ہندوستان لکھوایا جسے میں امریکہ میں رہ کر ہمیشہ گنگناتی رہتی ہوں۔ آج اس کتاب کو پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے کہ میرے والد کو لوگ یاد کر رہے ہیں۔ المنصور ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر نے بھی زبیر رضوی کی خدمات پر روشنی ڈالی اور کتاب کے مرتب ڈاکٹر عبدالحی کو مبارکباد دی اور کہا کہ کتاب بہت عمدہ ترتیب دی گئی ہے۔ اس مذاکرے میں معروف شاعر اور مترجم جناب محمود احمد کریمی، پورنیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر مجاہد حسین، مظفر پور یونیورسٹی سے ڈاکٹر مستفیض احد عارفی اور ڈاکٹر کامران غنی صبا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نفاست کمالی، ادیبہ ہدیٰ، عائشہ ناز، محمد شمشاد، محمد امداداللہ وغیرہ نے بھی شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔ مذاکرے کی نظامت معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے اپنے خوبصورت انداز میں بحسن وخوبی انجام دی اور مذاکرے ومہمانان کا تعارف بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالحی نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی کتاب پر مختصر روشنی ڈالی اور کہ آج زبیر رضوی کی اہلیہ ہوتیں تو کتاب کی اشاعت سے بہت خوش ہوتیں، گذشتہ برس ان کا انتقال ہوگیا، انھیں کتاب کا بے صبری سے انتظار تھا۔ انھوں نے اس کتاب کے لیے اپنا ایک مضمون بھی عنایت کیا تھا۔ اسی طرح شمس الرحمان فاروقی، مجتبیٰ حسین، شمیم حنفی اور عباس انصاری سکندر صاحبان بھی اپنے مضمون کی شمولیت پر بہت خوش ہوتے لیکن کتاب کی اشاعت سے قبل ان سبھی کا انتقال ہوگیا۔ زبیر رضوی نہ صرف یہ کہ ایک عظیم شاعر تھے بلکہ وہ ایک عظیم انسان بھی تھے اور ان پر کام ہونا چاہے۔ مجھے امید ہے کہ لوگ مستقبل میں انھیں اور ان کے کاموں کو ریسرچ کا موضوع بنائیں گے۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، دربھنگہ، 27 مئی 2022

انور آفاقی کی کتاب 'میزانِ فکر وفن' پر گفتگو

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام معروف شاعر وافسانہ نگار انور آفاقی کی کتاب 'میزانِ فکروفن' پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر عبدالمنان طرزی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر

احتشام الدین رہے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے بحسن وخوبی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اپنی تمہیدی گفتگو میں ڈاکٹر آزاد نے انور آفاقی کی کتاب 'میزانِ فکروفن' کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر کیا۔ کتاب کے تعلق سے گفتگو کرتے

ہوئے ڈاکٹر عبدالحی نے کہا کہ کتاب کے مضامین توجہ طلب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر مصنف مزید محنت جاری رکھیں تو یقینی طور پر تحقیقی کام انجام دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شہنواز عالم نے کتاب کے مشمولات پر گفتگو کی۔ پروفیسر سید احتشام الدین نے بہت اچھے انداز میں گفتگو کی اور کتاب کے مختلف مضامین پر روشنی ڈالی۔ صفی الرحمٰن راعین نے کہا کہ انور آفاقی نے ڈاکٹر ہرگانوی، ڈاکٹر طرزی، سید محمود احمد کریمی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر منصور خوشتر وغیرہ کی تخلیقات کے فکر انگیز تجزیے کیے گئے ہیں۔ سید محمود احمد کریمی نے کہا کہ انور آفاقی کی تحریر میں جامعیت، حقیقت بیانی اور تاریخی شواہد کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے انور آفاقی کی تحقیقی صلاحیت پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے صدر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے اپنے منظوم تاثرات میں کہا کہ۔

انور جناب لائے ہیں میزانِ فکر و فن
نسریں ہے کوئی نقش تو کوئی ہے نسترن
آفاقی اُن کے نام کا حصّہ ہے ثانوی
آفاقیت شعار ہے کاوش جناب کی
اظہارِ مدّعا کا سلیقہ ہے خوب ہی
تاثیر سے بیان کا رشتہ ہے خوب ہی

ڈاکٹر سلیم خان نے کہا کہ کئی نادرۂ روزگار شخصیات اور ان کے فن کا بہترین انداز میں تعارف کروایا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ انور آفاقی کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، دربھنگہ، 30 مئی 2022

پنجاب

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بیت بازی

چنڈی گڑھ: پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام بیت بازی کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبۂ اردو فارسی کے طلبا نے حصہ لیا۔ بیت بازی کے اس مقابلے میں غالب گروپ اور حافظ گروپ کی طرف سے دس دس طلبہ نے حصہ لیا۔ پروگرام میں دو راؤنڈ رکھے گئے۔ طلبہ نے اس دوران اردو زبان کے ممتاز شعرا کے معیاری اشعار سنائے اور ایک دوسرے کے شعروں کا جواب محض پندرہ سیکنڈ کے اندر دینے میں کامیاب رہے۔ مقابلہ آخر تک بہت دلچسپ رہا۔ جانبین کے مسابقین نے کشمکش والا ماحول بنائے رکھا جس میں بالآخر جج صاحبان نے غالب گروپ کو کامیاب قرار دیا۔ اس گروپ میں راشد امین ندوی، خلیق الرحمٰن، جسپریت سنگھ، ناظر احمد بشیر، احمد، سمیکھا ویدرام، وینا آہوجہ، مانک آہوجہ اور جے پی سنگھ شریک رہے۔ اس کے علاوہ حافظ گروپ کو بھی تشجیعی انعام کے طور پر ٹرافی وسلور میڈل اور سرٹیفکٹ سے نوازا گیا۔ اس گروپ میں محمد سلطان، سدیپ سنگھ، وودشی چندیل، منیز، ترنجوت سنگھ، مندیپ سنگھ، پرم ویر سنگھ، رمن پریت، من پریت سنگھ کارتک شریک رہے۔ پروگرام کے کوآرڈینیٹر وصدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی عباس نے اپنی ابتدائی تقریر میں میں بیت بازی کے اصول وضوابط بتاتے ہوئے کہا شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار بیت بازی کا مقابلہ اردو زبان وادب سے عوام کو مزید قریب کرے گا۔ اس سے طلبہ میں شعری ذوق اور درست شعر گوئی کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ پروگرام میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کرتے ہوئے ڈاکٹر ریحانہ پروین نے کہا کہ امید سے زیادہ پروگرام کامیاب رہا۔ طلبہ نے بہت اچھے انداز میں معیاری اشعار سنائے۔ بحیثیت حکم تعمیر ہریانہ کے سابق ایڈیٹر وشاعر ڈاکٹر سلطان انجم نے کہا کہ بیت بازی کسی زمانہ میں اردو والوں کی شناخت ہوا کرتی تھی۔ اساتذہ کے اشعار کو یاد رکھنا، انھیں محفلوں میں برجستہ سنانا لائق تحسین عمل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ کائستھ گھروں میں شادی کی تقاریب میں بیت بازی ایک لازمی رسم تھی، لیکن اب فی زمانہ اردو کے ساتھ بیت بازی کے شوق پر بھی گرد جمتی جارہی ہے۔ شعبۂ اردو میں منعقدہ بیت بازی واقعی قابل ستائش ہے۔

مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر رینو بہل نے کہا کہ اردو کے تئیں نوجوان کا ذوق وشوق دیکھتے ہوئے یقین ہوگیا ہے کہ پنجاب میں اردو کا مستقبل روشن ہے، یہاں اردو کے نئے چراغ جلتے رہیں گے اور اردو زبان برابر ترقی کرتی رہے گی۔ ڈاکٹر ارچنا سنگھ نے کہا کہ یونیورسٹی میں اس نوعیت کا پروگرام آج ہی دیکھا اور سنا ہے جس میں شرکت کرکے بہت خوشی ہوئی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں شعبہ اردو سے ڈاکٹر زرین فاطمہ وشعبۂ فارسی سے ڈاکٹر ذوالفقار علی کا کلیدی کردار رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مئی 2022

جموں و کشمیر

فراق گورکھپوری: ممتاز غزل گو شاعر

جموں و کشمیر: نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر کی طرف سے 3 جون کانفرنس ہال، نظامت فاصلاتی تعلیم میں ایک توسیعی خطبے 'فراق گورکھپوری: ممتاز غزل گو شاعر' کا انعقاد کیا گیا کے۔ اس خطبے میں ہندوستانی نژاد کنیڈین

اردو اسکالر اور معروف محقق و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ناظم اعلیٰ، نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی پروفیسر طارق چشتی بحیثیت میزبان کے اس ادبی مجلس میں حاضر رہے۔ پروفیسر مشتاق احمد (سابق ناظم اعلیٰ اور ڈین، نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر) نے صدارت کی ذمہ داری انجام دی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر اعجاز احمد شیخ، ناظم اعلیٰ شعبۂ اقبالیات برائے فلسفہ وثقافت ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر کوثر رسول (شعبہ اردو)، ڈاکٹر حبیب اللہ شاہ، ڈاکٹر تنویر احمد درزی، ڈاکٹر اشفاق احمد، ڈاکٹر عنیدہ جان، ڈاکٹر داؤد احمد، ڈاکٹر سلیم یوسف (نظامت فاصلاتی تعلیم) کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور طلبہ نے اس توسیعی خطبے میں شرکت کی۔

اس ادبی پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر الطاف انجم (سینئر اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم جامعہ کشمیر) نے انجام دیے۔ پروگرام کے آغاز میں میزبانِ مجلس پروفیسر طارق احمد چشتی نے استقبالیہ کلمات ادا کر کے تمام سامعین اور مہمانان وغیرہ کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر توصیف احمد ڈار نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مقررہ موضوع پر اپنا توسیعی خطبہ پیش کیا۔ خطبے میں ڈاکٹر موصوف نے فراق گورکھ پوری کی غزلیہ شاعری کی فکری وفنی خوبیوں کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا۔ اردو غزل گوئی کی روایت میں فراق کی اہمیت، معنویت، عظمت اور انفرادیت کو استدلالی انداز میں واضح کیا۔ علاوہ ازیں فراق کی غزل گوئی کی عصری معنویت کیا اور کیوں کر ہے؟ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے مناسب طور طریقے کیا ہو سکتے ہیں؟ اس سے متعلق مزید تحقیق وتنقید کی ضرورت کس حد تک ہے؟ وغیرہ جیسے غور طلب اور لازمی استفسارات کے حوالے سے بھی ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بالتفصیل روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے خطبے کے اختتام پر سوالات و جوابات کا ایک اہم اور دلچسپ سلسلہ شروع ہوا جس میں اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پریس ریلیز: الطاف انجم سینئر اسسٹنٹ پروفیسر، نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر، 3 جون 2022

مدھیہ پردیش

کشمیری پنڈتوں کا اردو زبان وادب میں حصہ

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام 'کشمیری پنڈتوں کی اردو زبان و ادب میں حصہ داری' موضوع پر سمینار، افسانوں کی قرأت، مشاعرہ اور تقریب رسم اجرا کا انعقاد 16 مئی کو گورانجنی آڈیٹوریم، رویندر بھون کنونشن سینٹر بھوپال میں کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات میں اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے مہمان خصوصی ڈائرکٹر سنسکرتی ادیتی کمار ترپاٹھی کا استقبال کیا اور ادیتی کمار ترپاٹھی نے تمام مقررین کا کتابیں پیش کر کے استقبال کیا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر نصرت مہدی نے پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ کشمیری پنڈت کئی دہائیوں سے اردو ادب کی مختلف اصناف پر لگاتار کام کررہے ہیں اور انھوں نے اردو زبان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے مزید ثروت مند بنایا ہے لیکن اردو زبان میں ان کی حصہ داری پر کبھی کہیں گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے اس موضوع پر گفتگو کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مدھیہ پردیش اردو اکادمی، محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام متذکرہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا ہے۔ سمینار کی صدارت فرما رہے برج ناتھ بیتاب جموں نے کہا کہ کشمیری پنڈت دنیا کے ہر کونے میں سکونت پذیر ہیں اور اردو کے حوالے سے ان کا کردار مختلف سطحوں پر اور مختلف مرحلوں پر نمایاں رہا ہے مگر صحافت کے شعبے میں یہ کردار شاید دیگر شعبوں سے کہیں زیادہ ہے۔ سمینار کے مہمان ذی وقار راجیش رینا نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اسے کسی مذہب سے جوڑنا مناسب نہیں، کشمیری پنڈتوں نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اپنے مذہب سے اوپر اٹھ کر کردار نبھایا ہے۔ معروف فکشن نگار دیپک بدکی سری نگر نے اس موقعے پر اپنا افسانہ 'جڑوں کی تلاش' پیش کیا۔ خالد حسین جموں نے کہا کہ مغلوں، پٹھانوں اور سکھوں کے دور میں جو کشمیری پنڈت دوسری ریاستوں میں آباد ہوئے ان میں پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت آنند نرائن ملا اور گلزار دہلوی وغیرہ نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور فروغ کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان معتبر شخصیات نے اردو زبان کی نوک پلک سنواری۔ کشمیری پنڈتوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعمان خان بھوپال، ڈاکٹر عزیز عرفان، رافعہ محی الدین اننت ناگ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر مہتاب عالم نے اپنے مخصوص انداز میں ادا کیے۔ سمینار کے بعد کل ہند مشاعرے کا انعقاد سید صلاح الدین دہی کی صدارت میں کیا گیا جس میں برج ناتھ بیتاب، نعیم اختر خادمی، رئیس نظامی، ڈاکٹر پروین کیف، ڈاکٹر قمر سرور، ارونا چوہان، کنور جاوید، جیوتی آزاد کھتری، سہیل عمر، سندیپ شریواستو جیسے نامور شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض رئیس نظامی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ جن ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کا اجرا ہوا ان میں نعمت اللہ ندوی، شاہد ساگری، خالد عابدی، یعقوب صابر، عبدالعزیز روشن، حنیف اول اور آدرش دوبے کے نام شامل ہیں، ساتھ ہی کشمیر کے معروف فکشن نگار دیپک کے نئے ناول 'اپنا اپنا سچ' اور تنقیدی مضامین کی کتاب 'عصری رجحانات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 مئی 2022

مغربی بنگال

اردو صحافت کا ماضی، حال اور مستقبل

آسنسول: پچھم بردوان ضلع ہیڈ کوارٹر آسنسول میں واقع مغربی بنگال اردو اکادمی آسنسول شاخ میں جمعرات کے دن اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے کی خوشی میں یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ دو ادوار پر مشتمل قومی سیمنار میں اردو صحافت کے ماضی حال اور مستقبل پر مبنی مقالے صحافیوں کے ساتھ مختلف کالج کے پروفیسروں نے پیش کیے۔ پہلے افتتاحی اجلاس کی صدارت مغربی بنگال اردو اکادمی کے چیئرمین فنکشن سب کمیٹی سید محمد شہاب الدین حیدر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض کولکاتا سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر اور اکادمی کے رکن نسیم عزیزی نے اپنے منفرد لب ولہجہ میں انجام دیے۔ سمینار کے آغاز سے قبل افتتاحی تقریب میں روزنامہ انقلاب کے معروف صحافی احمد جاوید نے اردو صحافت کی دوصد سالہ تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ اکادمی کے رکن اشتیاق احمد، سہیل داد خان اور صدر مجلس سید شہاب الدین حیدر نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور زبان کے فروغ کے سلسلے میں اکادمی کے ذریعہ کی جانے والی کاوشوں کا ذکر کیا۔ اجلاس کا پہلا دور نسیم عزیزی وانجینئر خورشید غنی کی مشترکہ نظامت سے شروع ہوا۔ ریسرچ اسکالر سیمیں رخسار نے 'اردو کے پہلے صحافی میر باقر علی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ وجیہہ الدین جمال نے 'بردوان ضلع میں اردو صحافت' کے عنوان سے اپنا مقالہ سامعین کے گوش گزار کیا۔ اخبار مشرق آسنسول ایڈیشن کے انچارج وسنیئر صحافی ریاض آنکلی نے اپنا مقالہ بعنوان 'اردو صحافت ماضی اور حال کے آئینے میں- ایک جائزہ' پڑھا۔ آسنسول بی سی کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد جمشید احمد نے 'حسرت موہانی کی صحافت نگاری' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ٹی ڈی بی کالج رانی گنج شعبہ اردو کی لکچرر ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا نے 'اردو صحافت کا دوسو سالہ سفر' پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ پہلے دور کے صدر احسان ثاقب نے تمام مقالہ نگاروں کے ذریعہ پیش کیے گئے مقالوں پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ پہلے دور کے اختتام سے قبل مغربی بنگال اردو اکادمی کے رکن الحاج انجینئر خورشید غنی نے اظہار تشکر پیش کیا۔ ظہرانے کے بعد احمد جاوید کی صدارت اور نسیم عزیزی کی نظامت میں دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ اخبار مشرق آسنسول ایڈیشن کے صحافی، شاعر و معلم امتیاز احمد انصاری نے پہلے مقالہ نگار کے طور پر 'اردو صحافت کے دوسو سال- مسائل اور امکانات' کے عنوان سے پر مغز مقالہ پیش کیا۔ آسنسول بی بی کالج

شعبہ اردو کے ڈاکٹر مشکور معینی نے 'مولانا ظفر علی خان کی صحافت نگاری' کے عنوان سے ایک معلوماتی مقالہ پیش کیا۔ حاجی قدم رسول ہائی اسکول سے تعلق رکھنے والے محقق عمران قریشی نے '1900 سے 1947 تک کولکاتا سے شائع ہونے والے اردو اخبارات اور رسائل کا مختصر جائزہ' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ سامعین کے گوش گزار کیا۔ ہگلی محسن کالج کے ڈاکٹر محمد محسن خان نے 'تحریک آزادی اور اردو صحافت' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ آسنسول کے سینئر صحافی، شاعر و نثر نگار احسان ثاقب نے 'آسنسول سب ڈویژن میں اردو صحافت' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ احمد جاوید نے تمام مقالہ نگاروں کے مقالوں پر اپنی رائے دی۔ اجلاس میں شامل تمام مہمانوں اور مقالہ نگاروں کو اکادمی کی جانب سے مومنٹو، شانہ زیب اور اسناد شوکت علی، انجینئر خورشید غنی اور طلعت شہمید کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ دوسرے دور کے اجلاس کے اختتام پر مغربی بنگال اردو اکادمی کی رکن طلعت شہمید نے اظہار تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز: مشتاق اعظم، مغربی بنگال، 20 مئی 2022

اکیسویں صدی میں اردو سفرنامے

کلکتہ: پروقار و تاریخی تقریب میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیر کفالت دو روزہ سیمینار 'دی مسلم انسٹی ٹیوٹ' کے قادر نواز ہال میں بعنوان 'اکیسویں صدی میں اردو سفرنامے اور

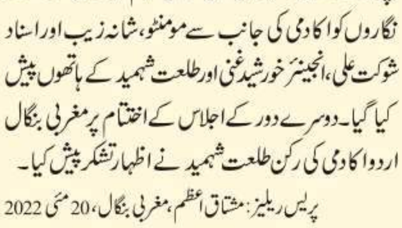

رپورتاژ' کا شاندار افتتاح کیا گیا جس کی صدارت ماہنامہ 'انشا' کے مدیر ف س اعجاز نے کی۔ افتتاحی کلمات محمد ندیم الحق (ایم پی و صدر، مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے پیش کی۔ استقبالیہ کلمات کا فریضہ نثار احمد نے حسن اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے سفرنامے پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' (1837) جو اردو ادب میں اولین سفرنامہ کی حیثیت رکھتا ہے کے حوالے سے کافی دلچسپ باتیں بیان کیں۔ انھوں نے بتایا کہ سفر بیک وقت تاریخ بھی ہے، تہذیب بھی ہے اور جغرافیائی منظرنامے کا آئینہ دار بھی ہے۔ ایک اچھے سفرنامے میں سماجی، معاشرتی، سیاسی اور رسم و رواج کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے۔ بعد ازاں ف س اعجاز نے اپنے تخلیق کیے سفرنامے مثلاً انگلینڈ کا سفر، امریکہ کا سفر، ماریشس کا سفر، سعودی عرب کا سفر اور چین یاترا کا ذکر کیا اور بتایا کہ کسی بھی مقام کا سفرنامہ تحریر کرنا کوئی سہل کام نہیں بلکہ وہاں کے حالات و واقعات صداقت کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے جس سے قرأت کرنے والے قاری کو بالکل حقیقی تصویر معلوم ہوتی ہے۔" محمد نورالدین نے بزم میں تشریف لائے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح پہلے اجلاس کی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ دوسرے اجلاس کا آغاز پہلے اجلاس کے فوراً بعد یعنی بوقت 5 بجے شام عمل میں آیا جس میں رسمی طور پر مہمانوں کو گلدستے عنایت کیے گئے۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر دبیر احمد (صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا) نے کی۔ شاہد اقبال نے 'بنگال کے مختلف سفرنامے'، اشتیاق احمد نے 'اکیسویں صدی میں اردو سفرنامہ'، ڈاکٹر سید وسیم الارشاد القادری نے 'مغربی بنگال کے معروف سفرنامہ نگار' اور ڈاکٹر امتیاز وحید نے 'پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی سفرنامہ نگاری' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 29 مئی 2022

انشاء اللہ خاں انشا: شخصیت اور فن

باراسات: شعبۂ اردو ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی، باراسات نے 'انشاء اللہ خاں انشا شخصیت اور فن' کے موضوع پر 23-24 مئی کو دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا جس میں شہر کلکتہ، مضافات اور ملک کی دیگر ریاستوں سے کئی اہم شخصیات نے شرکت کی اور انشا کی شخصیت اور شاعری پر علمی و ادبی بحث کی۔ دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے انشا کی شخصیت کے مختلف پہلوان کی شاعری کی انفرادیت، ان کی نثری، لسانی اور علمی صلاحیتوں کا اعتراف اور اردو ادب میں ان کے اختصاص کا تعین بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ انشا کو از سر نو پڑھے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ سیمینار مغربی بنگال اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منعقد ہوا جس کا افتتاح یونیورسٹی کی وائس چانسلر عزت مآب پروفیسر مہوا داس کے انتہائی مختصر اور جامع گفتگو کے ساتھ ہوا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے فرمائی۔ شعبۂ اردو کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر تسلیم عارف نے شعبے کی کارگزاریوں کا تعارف کرایا اور یونیورسٹی کے آئی کیو اے سی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر ستا پا چٹرجی کے استقبالیہ کلمات پڑھ کر سنائے۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلر نے شہر اور مضافات شہر

سے تشریف لائے ہوئے مہمانوں کی موجودگی میں یہ خوش خبری دی کہ اس سال سے شعبۂ اردو میں پی ایچ ڈی اور ریسرچ کے لیے داخلے لیے جائیں گے۔ انھوں نے شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر تسلیم عارف اور ڈاکٹر رضی شہاب کی کوششوں کو سراہا اور مستقبل میں شعبے کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ انشا جیسا فنکار کسی خطے تک محدود نہیں رہتا، اس کی شہرت سرحدوں کے پار تک پہنچ جاتی ہے۔ افتتاحی اجلاس میں یونیورسٹی کے دیگر شعبوں کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی رجسٹرار، یونیورسٹی انجینئر، لائبریرین، اگزام کنٹرولر اور دیگر عہدیداران نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضی شہاب نے کی۔ دو روزہ قومی سیمینار میں افتتاحی اجلاس کے علاوہ تین تکنیکی سیشن ہوئے جن میں پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت کا فریضہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم اور ڈاکٹر دبیر احمد نے انجام دیا جب کہ دوسرا اور تیسرا تکنیکی اجلاس بالترتیب پروفیسر احمد محفوظ اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پہلے تکنیکی سیشن میں سدرہ رئیس نے اپنا انگریزی میں تحریر کردہ مقالہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ جناب کلیم حاذق، ڈاکٹر درخشاں زریں، جناب نسیم اشک، ڈاکٹر صابر خاتون حنا اور ڈاکٹر احمد معراج نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر دبیر احمد نے کی۔ دوسرے تکنیکی اجلاس میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔ اس سیشن میں ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر احمد کفیل، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر عزیر اسرائیل، ڈاکٹر محمد علی حسین شائق اور ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی نے انشا کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن کی صدارتی تقریر میں پروفیسر احمد محفوظ نے کئی اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ انشا کی بات کرتے ہوئے عموماً تذکرہ ان کی نثری خدمات کا ہوتا ہے لیکن بہرحال یاد رکھنا چاہیے کہ انشا کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے اور خوشی ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے بھی یہاں گفتگو کی گئی۔ تیسرے اور آخری اجلاس میں ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر محسن خان،

ڈاکٹر علیم ہاشمی، جناب محمد ارشاد اور شعبۂ اردو ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی کے ایم اے سال اول کے طالب علم محمد فیروز عالم نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سبھی مقالوں کو سننے کے بعد اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ یہ امر خوش آئند ہے کہ دو نوجوان ساتھیوں نے انشاء اللہ خاں انشا پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کرنے کی ٹھانی اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے ان کے حوصلے کو مالی امداد فراہم کر کے پر لگا دیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 مئی 2022

اعزاز و اکرام

انٹرنیشنل بوکر ایوارڈ

نئی دهلی: ہندی کی نامور مصنفہ گیتانجلی شری کو بین الاقوامی بوکر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ انھیں یہ ایوارڈ ان کے ناول ٹومب آف سینڈ (ریت سمادھی) کے لیے دیا گیا ہے۔

ریت سمادھی ہندی کا پہلا ناول ہے جسے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ناول ریت سمادھی کا انگریزی میں ترجمہ ڈیزی راک ویل نے کیا ہے۔ یہ کتاب دنیا کی 13 تخلیقات میں شامل تھی، جنھیں انٹرنیشنل بکر ایوارڈ کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ لندن میں ایک تقریب میں مصنفہ گیتانجلی نے کہا کہ وہ 'بولٹ فرام دی بلیو' سے مکمل طور پر اضطراب کی کیفیت میں تھیں، اپنا 50000 برٹش پاؤنڈ کا انعام لیا اور اسے کتاب کی انگریزی مترجم ڈیزی راک ویل کے ساتھ شیئر کیا۔ گیتانجلی شری نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں نے بوکر ایوارڈ کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خوشی کے ساتھ میں حیران بھی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے آپ پر فخر محسوس کرتی ہوں۔ مصنفہ نے کہا کہ یہ ایوارڈ ملنے سے مجھے ایک الگ طرح کی خوشی کا احساس ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریت سمادھی (ریت کا مقبرہ) دنیا کے لیے ایک غم ناک نظم ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ بوکر یقیناً اس کتاب کو بہت سے لوگوں تک پہنچائے گا۔ گیتانجلی شری نے کہا کہ میرے اور اس کتاب کے پیچھے ہندی اور دیگر جنوبی ایشیائی زبانوں میں ایک بھرپور اور ادبی روایت ہے۔ ان زبانوں کے بہترین مصنّفین کی تخلیقات سے عالمی ادب زیادہ مالا مال ہوگا۔ امریکہ کے وارمنٹ میں رہنے والی راک ویل ایک پینٹر، مصنف اور مترجم نے گیتانجلی کے ساتھ اسٹیج شیئر کیا۔ گلک فیم گیتانجلی کلکرنی نے انکشاف کیا کہ وہ کبھی گھریلو خاتون نہیں بننا چاہتی تھیں۔ ایوارڈ کا انتخاب کرنے والے پینل کے چیئرمین فرینک وائن نے کہا کہ ہم گیتانجلی شری کے ناول ٹومب آف سینڈ اور ڈیزی راک ویل کے ترجمہ کی طاقت، شائستگی اور چنچل پن سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا یہ ہندوستان اور تقسیم پر ایک شاندار ناول ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2022

دانش صدیقی

نئی دهلی: فوٹو جرنلسٹ دانش صدیقی مرحوم کو دوسرا پلتزر ایوارڈ دیے جانے کے بعد ان کے والد نے اپنے بیٹے کو یاد کرتے ہوئے انھیں بہادر، دنیا میں دکھ اور درد کے تئیں ہمدردی رکھنے والے اور ایک سنجیدہ پیشہ ور اور اس کے ساتھ ہی اپنے کنبہ کی سیکورٹی کی فکر کرنے والا بیٹا بتایا۔ دانش کے والد اختر صدیقی نے کہا کہ ہمیں اس پر فخر ہے لیکن ہمیں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ دانش سمیت 4 ہندوستانیوں کو فیچر فوٹوگرافی زمرے میں باوقار پلتزر ایوارڈ 2022 سے نوازا گیا ہے۔ دانش صدیقی (38) کی گزشتہ سال جولائی میں افغانستان میں موت ہوگئی تھی۔ افغانستان میں افغان فوجیوں اور طالبان کے درمیان گولی باری کی تصویریں لیتے وقت ان کی موت ہوگئی تھی۔ صدیقی کو دوسری بار پلتزر ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ 2018 میں بھی رائٹرس کے ساتھ کام کرتے ہوئے انھیں روہنگیا پناہ گزین بحران سے متعلق تصویروں کے لیے پلتزر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ انھوں نے افغانستان اور ایران میں جنگ، ہانگ کانگ میں مظاہرے اور نیپال میں زلزلہ جیسے اہم واقعات کی تصویریں لی تھیں۔ ان کے والد نے کہا کہ ... اس ایوارڈ کے بارے میں جان کر اسے ضروری خوشی ہوتی۔ اس نے اپنی انکساری، سخت محنت، اقدار پر مبنی کاموں سے ہمیں، ہمارے کنبہ کو اور صحافتی برادری کو فخر کا احساس دلایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا بیٹا اپنے کام سے امر ہوگیا ہے اور دنیا اسے اعزاز سے نواز رہی ہے۔ اسے اس سال اپریل میں بوسٹن یونیورسٹی کے ذریعہ اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سے قبل کئی دیگر ایوارڈ دیے گئے۔ دنیا اس کے کام اور خدمات کو تسلیم کر رہی ہے۔ بدقسمتی سے وہ اپنا کام اور خدمات جاری رکھنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ ہمیں صبح سے بہت سارے پیغامات مل رہے ہیں۔ اسے وقار کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہے۔ کنبہ نے ان کی وراثت کا احترام کرنے کے لیے دانش صدیقی فاؤنڈیشن کا قیام کیا ہے۔ دانش کے والد نے کووڈ 19 وبا کی دوسری لہر کے دوران اپنے بیٹے کے کام کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ سبھی طرح کے خطرات کے باوجود دانش نے کام جاری رکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ملک بھر میں، اسپتالوں میں، کووڈ وارڈوں، مردہ گھروں، قبرستانوں میں گیا۔ اس نے ان دنوں کافی کام کیا۔ اس کا نظریہ یہ دکھانا تھا کہ لوگ کس طرح متاثر ہیں... اس نے اپنی ذاتی صحت اور اپنے کنبہ کی قیمت پر خطرہ مول لیا۔ اختر صدیقی نے کہا کہ ان کا بیٹا اپنے 2 چھوٹے بچوں اور اپنے معمر ماں باپ کی سیکورٹی یقینی بنانے کو لے کر بھی بہت الرٹ تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مئی 2022

استوتی اگروال

نئی دهلی: پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ استوتی اگروال اس قول کی مصداق ہیں۔ ان خیالات کا اظہار فورم فار انٹلکچوئل ڈسکورس اور دی ونگس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سیفی سرونجی اور استوتی اگروال کے اعزاز میں منعقدہ نشست میں سابق پرو وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور

ممتاز سائنس داں پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس زبان میں سیفی سرونجی جیسے سخت جدوجہد کرنے والے لوگ موجود ہوں اس زبان کو کبھی موت نہیں آسکتی۔ اس موقعے پر معروف ادیب و شاعر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ استوتی اگروال نے بارہویں جماعت کے بورڈ امتحان کے اردو کے پرچے میں پچانوے نمبر حاصل کر کے نہ صرف ریاست مدھیہ پردیش کا نام روشن کیا ہے بلکہ اردو کے حوالے سے آج کے منفی پروپیگنڈے کے دور میں اس مفروضے کی بھی تردید کردی ہے کہ اردو کسی خاص مذہبی اقلیت کی زبان ہے۔ اس حوالے سے ان کے علمی مربی سیفی سرونجی اور ان کے والد انل اگروال قابل صد مبارکباد ہیں۔ تہنیتی نشست کے صدارتی کلمات میں مشہور صحافی سہیل انجم نے کہا کہ اتنی کم سنی میں ایک غیر اردو خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود استوتی اگروال

کا اردو میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کرنا اور اردو کے اہم رسالہ 'انتساب' کی نائب مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دینا یقیناً استوتی اگروال کا لائق تحسین کارنامہ ہے۔ مشہور شاعر اور ناظم مشاعرہ معین شاداب نے کہا کہ استوتی اگروال کی اردو سے والہانہ محبت، بے پناہ ذہانت اور اردو کتابوں کے مطالعے کا غیر معمولی شغف اردو کے نونہالوں کے لیے قابل تقلید مثال ہے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ جیسی نفیس و نستعلیق اردو میں استوتی اگروال تقریر کرتی ہیں اس کا نمونہ ہمیں بڑے بڑے اردو گھرانوں میں بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ انھوں نے سیفی سرونجی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس قدر استقلال کے ساتھ چالیس برسوں سے 'انتساب' جاری رکھنا اپنے آپ میں ادبی صحافت کی ایک قابل قدر کاوش ہے۔ اس تہنیتی جلسے میں فورم فار انٹلکچوئل ڈسکورس کے جنرل سکریٹری منظر امام، دی ونکس فاونڈیشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر انوار الحق اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم جمیل سرور نے استوتی اگروال، انل اگروال اور سیفی سرونجی کی خدمت میں ڈائری، قلم اور گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 مئی 2022

اجرا

اک شخص دل ربا سا

سیتامڑھی: صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ مولانا نورعالم خلیل امینی کی ادبی اور فکری صلاحیت کا احاطہ کرنا مشکل

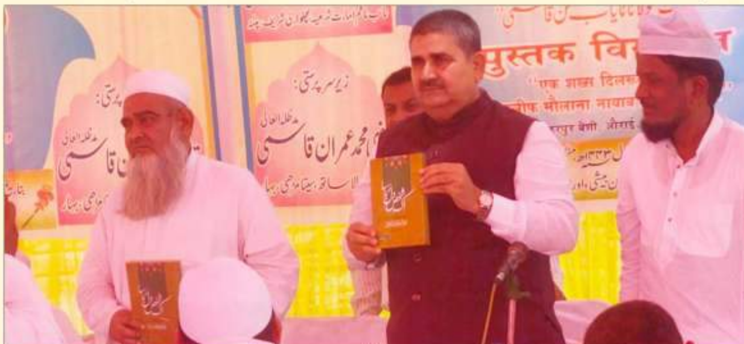

ہے۔ مولانا جہاں عربی زبان وادب کے اپنے انداز کے ایک بڑے ادیب تھے وہیں انھوں نے 'وہ کوہ کن کی بات' لکھ کر یہ باور کرادیا کہ اردو ادب سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان خیالات کا اظہار امارت شرعیہ پٹنہ کے نائب ناظم مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے ضلع کے اورائی بلاک میں واقع ہرپور بیشی میں منعقد مولانا نور عالم خلیل امینی کی حیات وخدمات پر لکھی گئی کتاب 'اک شخص دل ربا سا' کے اجرا کی تقریب کے دوران کیا۔ قاضی محمد عمران قاسمی استاذ دارالعلوم بالا ساتھ نے کہا کہ بزرگوں کے کمالات اور علمی میدان میں کی گئی خدمات نئی نسل کے لیے مشعل کا کام کرتی ہیں۔ مولانا اظہار الحق مظاہری ناظم جامعہ اشرف العلوم کنہواں نے کہا کہ بڑے ادارے میں رہ کر مواقع ملے جن کا مناسب استعمال کرکے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ادبی خدمات کے ذریعے انھوں نے پوری دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت بنائی، علاقے کا نام روشن کیا۔ مولانا عبدالمنان قاسمی بانی و ناظم مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی نے کہا کہ مولانا مرحوم خداداصلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑا کام اور بڑا نام بھی کمایا۔ وزیر اصلاحات اراضی حکومت بہار رام صورت کمار رائے نے اجرا کے دوران کہا کہ ہمارے علاقے کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ ہمارے ہی حلقہ اسمبلی کی مٹی کے لال نے صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ ہونے کے ساتھ عربی اسکالر ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پروگرام صرف ایک کتاب کا اجرا نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کا پیغام ہے۔ عربی ادب کے پروگرام میں میری شرکت اس کی زندہ مثال ہے۔ انھوں نے مؤلف کتاب مولانا نایاب حسن قاسمی اور تقریب کے انعقاد میں پیش پیش رہنے والے محمد ثاقب، محمد توقیر محمد نور عین سمیت اہلیان بیشی کو مبارکباد دی۔ انھوں نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ بہتر سماج کی تشکیل کے لیے تعلیم نہایت ضروری ہے۔ مؤلف کتاب مولانا نایاب حسن قاسمی نے کہا کہ اک شخص دل ربا سا میں مولانا نور عالم خلیل امینی کی علمی، فکری، ادبی اور صحافتی خدمات کے علاوہ ان کی یادداشت اور الداعی میں جن موضوعات پر انھوں نے لکھا اور اردو تحریروں اور کتابوں کے ترجمے کیے ان کا اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ تقریب کی صدارت مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور سرپرستی قاضی محمد عمران قاسمی نے کی۔ مولانا عبدالمنان قاسمی کی دعا پر تقریب کا اختتام ہوا۔ تقریب میں بطور خاص معروف صحافی مولانا رضوان الحق قاسمی، مفتی انصار صدر المدرسین جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول، مولانا حسین احمد قاسمی استاذ دارالعلوم بالا ساتھ، مولانا صفی الرحمٰن استاذ مدرسہ اسلامیہ شکرپور، مولانا نعمت اللہ ناظم قاسمی، محمد صہیب چیئرمین الامداد چیری ٹیبل ٹرسٹ مادھوپر، مولانا ثناء اللہ استاذ دارالعلوم بالا ساتھ، مولانا احمد ضیاء ندوی، مولانا انوار اللہ فلک قاسمی، مولانا نظام الدین، استاذ مدرسہ اشاعت العلوم اکل کوا، صحافی نور اللہ جاوید قاسمی، قاضی زکریا قمر ممبئی، مولانا حسان جامی قاسمی رامپور، آفتاب عالم بدھنگرا نے شرکت کی جب کہ تقریب کے انعقاد میں عبدالماجد ولی، مولانا محمد سرفراز قاسمی، قاری عزیر اختر قاسمی سمیت نوجوانان بیشی پیش پیش رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2022

منتخب اصنافِ ادب

لکھنؤ: بزم اردو انڈیا کے زیر اہتمام یو پی پریس کلب، میں بین الاقوامی شہرت یافتہ پروفیسر صابرہ حبیب کی کتاب 'منتخب اصناف ادب' کے اجرا کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے کہا کہ پروفیسر صابرہ حبیب نے بہت اچھے طریقے سے دوسرے لوگوں کے خیالات کو ترتیب دے کر کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مہمان اعزازی اطہر نبی نے کہا کہ پروفیسر صابرہ حبیب کی منتخب اصناف ادب طلبا کو اصناف ادب کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ طلبا کے لیے یہ کتاب بہت ہی مفید ہے۔ ریحان خان نے کہا کہ یہ کتاب نئی نسل کو گہری معلومات دینے والی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 مئی 2022

اردو مرثیہ کے پانچ سو سال

امروهه: جدید مرثیہ کے حوالے سے اہم سرزمین امروہہ پر اردو مرثیہ کے پانچ سو سال نامی تاریخی کتاب کا اجرا

عالمی مرثیہ سینٹر کی جانب سے امروہہ میں عمل میں لایا گیا جس میں علم وادب سے وابستہ اہم شخصیات نے حصہ لیا۔ تنظیم المکاتب کے سکریٹری اور جید عالم دین مولانا صفی حیدر زیدی کی موجودگی میں انہی کے ہاتھوں اس تاریخی

کتاب کا اجرا عزاخانہ میمونہ خاتون محلّہ مجاپوتہ میں انجام پایا۔ اس موقعے پر مولانا صفی حیدر نائب امام شیعہ جامع مسجد مولانا ڈاکٹر احسن اختر سروش۔ معروف قلمکار ناشر نقوی ادبی سنگم سے وابستہ شاعر اہل بیت پنڈت بھون شرما ادبی وثقافتی تنظیم کاروان خلوص کے محبوب حسین زیدی اور سماجی کارکن اور اردو کے خدمت گار اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کے صدر کوثر عباسی کو کتاب کا ایک ایک نسخہ پیش کیا گیا۔ عبدالرؤف عروج کی یہ کتاب 1961 میں کراچی سے شائع ہوئی تھی، لیکن موجودہ دور میں دستیاب نہیں ہے۔ صفی پور سے تعلق رکھنے والے ایئر فورس کے سابق فلائنگ افسر سید اختر حسین نقوی کی خواہش پر معروف قلمکار فاروق ارگلی نے اس مجموعے کو موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں کے رثائی کلام کے اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس طرح 'اردو مرثیہ کے پانچ سو سال' عنوان کی یہ کتاب مزید اہم اور تاریخی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔ اس کتاب کے اضافہ شدہ ایڈیشن میں امروہہ کے کچھ شعرا عظیم امروہوی، ناشر نقوی، شان حیدر بے باک، حسین رضا حسنین امروہوی، سلیم امروہوی اور پیمبر نقوی کے مراثی شامل ہیں۔ پرانے ایڈیشن میں نسیم امروہوی اور رئیس امروہوی کا رثائی کلام شامل تھا۔ کتاب 'اردو مرثیہ کے پانچ سو سال' اس لحاظ سے تاریخی اور وقیع ہے کہ اس میں انیس و دبیر اور خانوادہ انیس کے مرثیہ گویوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے تقریباً مشاہیر قدیم وجدید شعرا کا کلام موجود ہے۔ کتاب کے محرک سید اختر حسین نقوی، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر، ریاست گول کنڈہ کے بانی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ، ریاست محمود آباد کے مہاراجہ علی محمد خاں، ریاست حیدرآباد کے نظام میر عثمان علی خاں، بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر اور والی ریاست رامپور رضا علی خاں کا رثائی کلام بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 مئی 2022

ارمغان

دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اردو دنیا میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور یہ ملک کا نمایاں شعبہ ہے۔ اس شعبے کی ایک اہم علمی شناخت اس کا مجلّہ 'ارمغان' بھی ہے۔ کسی رسالے کا اپنے معیار سے مفاہمت کے بغیر پابندی سے جاری رہنا بہت اہم ہے۔ جریدہ 'ارمغان' کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ مختلف اہم موضوعات پر اس کے کئی خصوصی شمارے اردو کے علمی حلقے میں بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ شعبۂ اردو سے کئی قومی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیات وابستہ رہیں، جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، قرۃ العین حیدر، پروفیسر سی ایم نعیم اور پروفیسر شمیم حنفی وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ شعبۂ اردو کے علمی وقار و اعتبار کے پیش نظر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک چیئر شعبہ سے مختص کی جائے جس سے کوئی ممتاز شخصیت وابستہ ہو۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سالنامہ 'ارمغان' (شمارہ دس) کا اجرا کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کیا۔ وائس چانسلر آفس کے یاسر عرفات ہال میں منعقدہ تقریب اجرا میں رجسٹرار پروفیسر ناظم حسین جعفری نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ بلا مبالغہ شعبۂ اردو کا شمار ملک کے ممتاز ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اس شعبے کی علمی اور ادبی سرگرمیاں دیگر شعبوں کے لیے مثالی نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ پروفیسر نجمہ اختر کی سربراہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور شعبۂ اردو ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرماتی ہیں۔ شعبۂ اردو کا قیام 1972 میں عمل میں آیا تھا۔ اس شعبے نے پچاس برسوں کا سفر طے کرلیا ہے۔ ہم اس موقعے پر وائس چانسلر کی سرپرستی میں اس شعبے کے شایان شان گولڈن جبلی کا جشن بھی منانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس سال خدائے سخن میر تقی میر کی ولادت کے تین سو برس مکمل ہو چکے ہیں۔ ہم اس اہم تاریخی موقعے پر تین سو سالہ جشن کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ مجلّہ 'ارمغان' (شمارہ دس) کے مدیر پروفیسر خالد جاوید نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اس شمارے کو فکشن تحقیق وتنقید کے لیے مختص کیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اردو ناول اور افسانے کے حوالے سے اردو میں جتنے اہم نظری اور عملی مباحث سامنے آئے ہیں ان کو اس شمارے میں جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ ان سے متعلق ممتاز شخصیات کے موقر مقالات اس شمارے میں شامل ہیں۔ اظہار تشکر کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم نے وائس چانسلر کی علم دوستی اور قدر دانی کا اعتراف کیا اور شعبۂ اردو کی قابل فخر علمی وراثت کے حوالے سے کہا کہ شعبے سے نہ صرف ماضی بلکہ حال میں بھی ممتاز تخلیقی اور تنقیدی شخصیات وابستہ ہیں۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ یو جی سی، ڈی آر ایس کے تین فیز اور ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے تحت انجام دیے گئے علمی کارناموں کو پوری دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر احمد نصیب خان، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر روبینہ شاہین زبیری، ڈاکٹر آس محمد صدیقی، ڈاکٹر آفتاب احمد اور اقبال حسین کے علاوہ ایم سی آر سی، سی آئی ٹی اور وی سی آفس کے اراکین شریک تھے۔

پریس ریلیز: خالد مبشر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 26 مئی 2022

برار کے گوہرِ قدیم: اکبر و وسیم

اورنگ آباد: عالم گیر ادب (کتابی سلسلہ) اورنگ آباد اور تفہیم پبلی کیشنز، اورنگ آباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر عظیم راہی کی مرتب کردہ کتاب 'برار کے گوہرِ قدیم: اکبر و وسیم' کی رسم رونمائی، بیت الیتیم کے عالم گیر ہال میں 14 مئی کو شب ساڑھے آٹھ بجے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر ارتکاز افضل (سابق ڈائریکٹر باموِ یونیورسٹی) کے ہاتھوں انجام پائی۔ جب کہ تقریب کی صدارت معروف محقق و ناقد محترم اسلم مرزا نے کی۔ تقریب کا آغاز صدر تقریب محترم اسلم مرزا اور ڈاکٹر ارتکاز افضل کے ساتھ مہمانانِ خصوصی نور الحسنین، خالد سیف الدین، پروفیسر شیخ عظیم الدین، ڈاکٹر شہاب افسر خان، ابوبکر رہبر اور مہمانانِ اعزازی محمد شمیم الدین، محمد منتظم الدین (ممبرا)، اور محمد ناظم الدین کا شال اور گلدستہ دے کر استقبال کیا گیا۔ اسی طرح صاحب کتاب ڈاکٹر عظیم راہی کا بھی ڈاکٹر ارتکاز افضل کے ہاتھوں پھول اور شال پیش کر کے اعزاز کیا گیا۔ بعدازاں تمام مہمانانِ خصوصی نے کتاب 'گوہرِ قدیم: اکبر و وسیم' پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کتاب کی رسم اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر ارتکاز افضل نے کہا کہ ماضی میں اچل پور اور ملکاپور برار کے علاقے میں ادب کے دو اہم مرکز تھے اور اچل پور میں 'میلا دِ اکبر' کے ذریعہ اکبر میاں کا نعتیہ کلام بڑی کثرت سے پڑھا جاتا تھا اور اُن کی نظم 'ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز' بہت مقبول ہوئی تھی۔ عظیم راہی نے اپنے دادا مولوی اکبر میاں اور چچا محمد وسیم الدین کی ادبی خدمات کو کتابی شکل میں محفوظ کر کے ایک بڑا کام کیا ہے۔ صاحب کتاب ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنے ادبی سفر کی شروعات کے بارے میں تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس درمیان ڈاکٹر محمود صدیقی (رجسٹرار مانو یونیورسٹی حیدرآباد)، محسن احمد (سابق کارپوریٹر) اور جواد احمد خان (پونہ) کا بھی استقبال کیا گیا۔ آخر میں محترم اسلم مرزا نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر عظیم راہی کی اس اہم تحقیقی کاوش پر ان کی خدمات کو سلام کرتا ہوں اور دلی

مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ محمد تسلیم الدین نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے جبکہ ڈاکٹر صائم صدیقی کے اظہار تشکر پر اس کامیاب رسم رونمائی کی تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: محمد تفہیم الدین، مہاراشٹر، 19 مئی 2022

منظر پس منظر

امروهه: امروہہ کی معروف ادبی شخصیت ماہر اسلوبیات، ناقد، مترجم، محقق اور مرثیہ نگار پروفیسر منظر عباس نقوی مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کرنے والی کتاب 'منظر پس منظر' کی رسم اجرا امروہہ کے محلّہ حقانی میں قائم عزاخان میں عمل میں لائی گئی۔ تقریب میں بطور مہمانان خصوصی پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے حصہ لیا جب کہ رسم اجرا کی تقریب کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی نے کی۔ میر تقی میر کے استاد میر سعادت کے خانوادے کے چشم و چراغ پروفیسر منظر عباس نقوی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر یہ کتاب ان کی سب سے چھوٹی دختر زیب السحر نقوی عرف زیبا نے ترتیب دی ہے۔ قابل ذکر بات ہے کہ گزشتہ سال پروفیسر منظر عباس اس عالم فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ اس کتاب میں پروفیسر منظر عباس نقوی کی شخصیت اور اردو ادب کے حوالے سے ان کی خدمات پر معروف ادیبوں اور اہل قلم افراد کے تحریر کردہ مضامین، مقالے، تاثرات اور ان کے سانحہ ارتحال پر خراج عقیدت شامل ہے۔ رسم اجرا کی تقریب میں جن اہل قلم اور ادیبوں نے پروفیسر منظر عباس نقوی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ان میں مہمان خصوصی اور ان کے شاگرد رشید پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر سیادت نقوی، ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی اور شان حیدر بیباک امروہوی شامل ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی تقریر میں پروفیسر منظر عباس نقوی کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایک شفیق اور ہمدرد استاد تھے۔ تقریب کی نظامت معروف شاعر اور امام المدارس انٹر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جمشید کمال نے کی۔ اس دوران شہر کی معزز شخصیات جلسہ رونمائی میں موجود تھیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 مئی 2022

اشارت

نئی دهلی: دبستان دہلی کے نمائندہ اور منفرد لب و لہجے کے شاعر شاہد انور کے پہلے مجموعہ کلام 'اشارت' کے اجرا کے موقعے پر تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام مشیر سخن، دہلی اور دوہا موومنٹ، دہلی نے مشترکہ طور پر تقریب اجرا و محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت تسمیہ سوسائٹی کے صدر اور ہمالیہ ڈرگس کے مینیجنگ ڈائرکٹر محترم ڈاکٹر سید فاروق صاحب نے فرمائی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر فاروق ارگلی، ڈاکٹر خالد مبشر اور راشد الحامدی نے اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے حقانی القاسمی، صہیب فاروقی اور اردو اکادمی، دہلی سے محمد ہارون حسینی اور عزیر حسن قدوسی نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ معین شاداب نے نہایت خوبصورت اور منفرد انداز میں انجام دیے۔ بعد ازاں فاروق ارگلی، محترم ڈاکٹر خالد مبشر، عفیف سراج اور محمد ہارون حسینی نے اپنے اپنے مقالوں میں 'اشارت' کے فنی نکات، انداز بیان و دیگر خصوصیات پر اظہار خیال فرمایا۔ محفل مشاعرہ میں شرکت فرمانے والے دیگر شعرائے کرام میں عرفان اعظمی، منیر ہمدم، جاوید مشیری، انس خان، اقبال فردوسی، عفیف سراج، محمد ناصر، عمران راہی، محترمہ آشکارہ خانم کشف اور محترمہ چشمہ فاروقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 مئی 2022

یہ سب پھول تمھارے نام

مراد آباد: ادبی تنظیم اکشرا کے زیر اہتمام مشہور و معروف شاعر ضیا ضمیر کے مجموعہ غزل 'یہ سب پھول تمھارے نام' کی تقریب اجرا مشہور شاعر ضمیر درویش کی ہمگیری کالونی واقع رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ پروگرام کی صدارت معروف نغمہ نگار ڈاکٹر مہیشور تیواری نے کی۔ بطور مہمان خصوصی منصور عثمانی اور بطور مہمانان ذی وقار شاعر ضمیر درویش، مزاحیہ شاعر ڈاکٹر مکھن مراد آبادی اور سینئر شاعر انور کیفی موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت یوگیندر ورما ویوم نے کی۔ اس موقعے پر ضیا ضمیر نے کتاب 'یہ سب پھول تمھارے نام' کی غزلیں سنائیں۔ اس موقعے پر مجموعۂ غزل پر منعقدہ مباحثے میں معروف نوگیت نگار ڈاکٹر مہیشور تیواری نے کلیدی مقرر کے طور پر کہا کہ ضیا ضمیر کے پاس گہرے پانیوں جیسا بہاؤ ہے، یہ عام فہم بھی ہیں، جس کے لیے لغت کی ضرورت نہیں ہے۔ منصور عثمانی نے کہا کہ ضیا ضمیر عہد حاضر میں نئی غزل کی نئی فکر اور نئی نظر کی مضبوط شناخت ہیں جو نہ صرف آج میں زندہ ہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کا ماضی بھی ہے اور آنے والے وقت کے رنگین خواب بھی۔ ضمیر درویش نے کہا کہ ضیا ضمیر کی شاعری میں حقیقت اور تخیل کا خوبصورت استعمال پایا جاتا ہے۔ سینئر شاعر ڈاکٹر مجاہد فراز نے کہا کہ ضیا نے اپنی غزلوں کے لیے دل کی راہ کا انتخاب کیا، وہی دل جس نے میر سے لے کر میرا تک لاتعداد شاعروں کو ادب کے صفحات پر سجایا، یہی وجہ ہے کہ ضیا کی شاعری میں دل اور عشق کی کارفرمائیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر مکھن مراد آبادی نے کہا کہ ضیا ضمیر مراد آباد کی مٹی میں پیدا ہونے والے ایسے نوجوان شاعر ہیں جن کی شاعری کی خوشبو ملک بھر میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اپنا مقام حاصل کر رہی ہے، دنیا کو ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر کرشن کمار ناز نے کہا کہ ضیا ضمیر کی غزلیں اس بات کی مثال ہیں کہ وہاں محبت بھی ہے، معاشرہ بھی ہے، ثقافت بھی ہے، روحانیت اور سیاسی شعور بھی ہے۔ سینئر شاعر انور کیفی نے کہا کہ نوجوان نسل میں جن شاعروں نے اردو، ہندی زبان اور ادب میں کامیابیاں حاصل کیں اور گیسوئے سخن کو سنوارا ہے، ان میں ضیا ضمیر ایک ایسا نام ہے جو محفلوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد آصف حسین نے کہا کہ ضیا ضمیر کی شاعری میں اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ مراد آباد کو آنے والے وقتوں میں شاعری کے حوالے سے بڑا نام ملنے والا ہے۔ یوگیندر ورما ویوم نے کتاب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ضیا ضمیر کی شاعری میں موجود ہندوستانیت اور تہذیب کی خوشبو ان کی غزلوں کو تاریخ کی ضرورت بناتی ہے۔ کلمات تشکر ضیا ضمیر نے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 مئی 2022

آدھی دنیا کا مکمل جہان

بھیونڈی: اردو کی معتبر اور معروف ادیبہ شمع اختر کاظمی کی تیسری تصنیف 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' کی تقریب رونمائی بزم یاران ادب کے زیر اہتمام عمل میں آئی۔ اردو بسیرا ہال (رئیس ہائی اسکول کیمپس) بھیونڈی میں منعقدہ اس تقریب اجرا کے صدارتی خطبے کے دوران معروف صحافی، محقق، ادیب اور شاعر شمیم طارق نے کہا کہ شمع اختر کاظمی صاحبہ کی اس کتاب کو پڑھ کر یہ علم ہوتا ہے کہ اردو میں لکھنے والی خواتین میں ہر خطہ، ہر نسل اور ہر مذہب کی خواتین شامل ہیں اور ان کی کتاب تاریخ و تذکرہ اور انٹرویو سے بھی تعلق رکھتی ہے اور تنقید و احتساب سے بھی۔ یہ کتاب اہل علم کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ آفتاب احمد آفاقی (صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی یوپی) نے کہا کہ آدھی دنیا کا مکمل جہان بنیادی طور پر انٹرویو پر مبنی تاریخی نوعیت کی کتاب ہے جس کے مطالعے سے معاصر 80 خواتین

قلمکاروں کے علمی و ادبی نقطۂ نظر، ان کی خدمات اور ان کے علاقے کے تاریخی، تہذیبی اور جغرافیائی حالات کا علم ہوتا ہے۔ مصنفہ کی محنت شاقہ کا کمال یہ ہے کہ سارے سوالات الگ الگ ہیں اور نئے ادبی نکتے کو اجاگر کرتے ہیں۔ اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت بہت پرانی ہے، لیکن یہ تصنیف روایت شکن بھی ہے اور نئی روایت کی طرح بھی ڈالتی ہے جس میں دلائل اور براہین کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 جون 2022

ہجرت کے تماشے

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اردو کے ممتاز ڈرامانگار اور تھیٹر آرٹسٹ جناب جاوید دانش کی کتاب 'ہجرت کے تماشے' کی رسم رونمائی اور مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ہمارے عہد کے ایک ممتاز ڈرامانگار اور تھیٹر کی دنیا میں منفرد شناخت رکھنے والے ادیب و فنکار جناب جاوید دانش کی کتاب پر مذاکرے کا اہتمام کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ جاوید دانش صاحب نے ایسے خانوادے میں آنکھ کھولی جہاں پہلے سے علم و ادب کا چرچا تھا۔ ان کے والد خود مصنف تھے جنھوں نے انھیں لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا۔ جاوید دانش کے شوق سفر نے انھیں کناڈا میں بسا دیا۔ وہ ملک سے دور تو ہوئے لیکن اس سرزمین نے ان کے قلم کو ایسی آزادی دی کہ شاید وہ کہیں اور میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ان کی کتاب 'ہجرت کے تماشے' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جناب جاوید دانش نے کہا کہ میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور تمام شرکا، خصوصاً پروفیسر محمد کاظم اور ڈاکٹر جاوید حسن کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کتاب کے سلسلے میں ایسی بزم آراستہ کی اور اس پر گفتگو کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ اردو میری مادری زبان ہے اور مجھے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ جاوید دانش سے میری پرانی رفاقت ہے۔ میں نے ان میں اپنے کام کے تئیں ایسی سپردگی دیکھی کہ اس کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ جس میں کچھ اصناف زیادہ ترقی کرتی ہیں اور ان کی بہ نسبت دیگر اصناف کو ترقی کا کم موقع ملتا ہے۔ اردو کا مزاج ہے کہ اس میں شاعری خصوصاً غزل نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ہمیں جاوید دانش جیسے فنکاروں کی اس لیے بھی قدر کرنی چاہیے کہ ان جیسے فنکاروں کی وجہ سے اردو ڈراما اس لائق ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے جدید مسائل کی پیشکش میں اردو کسی سے کم نہیں ہے۔ جاوید دانش جتنا فن سے واقف ہیں موجودہ دنیا کے مسائل سے بھی اسی طرح آگاہ ہیں۔ میں اس کتاب کے مصنف اور غالب انسٹی ٹیوٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس جلسے میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جون 2022

جنوں آشنا

پٹنہ: حسن امام قاسمی کی شاعری سچی شاعری ہے۔ ان کی شاعری زمانے کی آواز ہے۔ ان خیالات کا اظہار مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ وصدر اردو میڈیا فورم نے 'جنوں آشنا' کی رسم اجرا تقریب کی صدارت فرماتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ شاعر کے فن میں نمو اور عروج کے امکانات روشن ہیں۔ تقریب کا اہتمام ضیائے حق فاؤنڈیشن کی طرف سے اقراہال شریف کالونی پٹنہ میں کیا گیا تھا۔ نظامت کا فریضہ کامران غنی صبا نے انجام دیا۔ اس موقعے پر امتیاز احمد کریمی رکن بہار پبلک سروس کمیشن پٹنہ وسابق ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ نے 'جنوں آشنا' کی اشاعت پر حسن امام قاسمی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو علم و ادب کی دنیا میں ترقی کرتا ہوا دیکھ کر انھیں اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید نے حسن امام قاسمی کی شاعری کو صالح فکر کا ترجمان قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ جناب قاسمی ایک عالم دین اور استاد بھی ہیں ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی۔ لہٰذا ان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ معروف ناقد پروفیسر صفدر امام قادری نے 'جنوں آشنا' پر گفتگو کرتے ہوئے حسن امام قاسمی کی شاعری کے فن پر بہت ہی معروضیت کے ساتھ گفتگو کی۔ انھوں نے ایک طرف جہاں شاعر کے تخلیقی شعور پر روشنی ڈالی وہیں انھیں مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ حسن امام جیسے صالح فکر نوجوانوں کی تخلیقی ہنرمندی قابل رشک ہے۔ کاروانِ اردو حاجی پور کے جنرل سکریٹری انوار الحسن وسطوی نے کہا کہ شاعری گرچہ میرا میدان نہیں ہے لیکن حسن امام قاسمی جیسے نوجوان شعرا کو پڑھ کر امید کی دنیا روشن ہوتی ہے۔ پروگرام کے آغاز میں ضیائے حق فاؤنڈیشن کے برانچ اونر ضیاء العظیم نے افتتاحی کلمات پیش کیے جبکہ فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے تنظیم کا تعارف پیش کیا۔ رسم اجرا کے فوراً بعد نوجوان عالم دین مولانا نظر الہدیٰ قاسمی نے کتاب کا تعارف پیش کیا۔ اس موقع پر ضیاء حق فاؤنڈیشن کی طرف سے سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان کو عثمان غنی صحافتی ایوارڈ اور ایس ایم اشرف فرید کو عمر فرید صحافتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ساتھ ہی ناشاد اورنگ آبادی، خورشید اکرم سوز، مرغوب اثر فاطمی، مشتاق سیوانی اور نیاز نذر فاطمی کو ان کی شعری خدمات کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے شکریہ کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: ضیائے حق فاؤنڈیشن، پٹنہ، 5 جون 2022

سید انور جمال انور دانش وروں کی نظر میں

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر منصور حسن خاں کی مرتبہ کتاب 'سید انور جمال انور دانشوروں کی نظر میں' کی رسم اجرا زینت کدہ، سینک نگر، تیلی باغ میں پورے تزک و احتشام کے ساتھ ہوئی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست کا انعقاد بھی ہوا۔ خانقاہ شاہ عبدالرحمٰن کے سجادہ صوفی سید اظہار علی کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی اس تقریب کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب واصف فاروقی نے کی جب کہ مہمان خصوصی پروفیسر صابرہ حبیب اور مہمان اعزازی محمد خالد صدیقی صبر حدی تھے۔ نظامت کا فریضہ خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے ادا کیا۔ اظہار تشکر ڈاکٹر ثروت تقی نے کیا۔ شاعروں میں ڈاکٹر منصور حسن خاں، عاصم ملیح آبادی، شکیل گیاوی، عاشق

رائے بریلوی، ڈاکٹر رضوان الرضا، ڈاکٹر ہارون رشید، رفعت عزمی، رضوان فاروقی، گرجر لکھنوی، سرور لکھنوی، قمر سیتاپوری، محمد علی علوی، وقار کاشف اور ظہور فیضی نے اپنے کلام سنائے۔ معززین شہر میں پروفیسر عتیق احمد فاروقی، راشد مسعود خاں، ڈاکٹر اسرار الحق قریشی، ڈاکٹر خورشید احمد، محمد ابراہیم خاں، رضا حسین، انور حسین، اتل کمار سریواستو اور مسز سعید کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر صدر تقریب واصف فاروقی نے کہا کہ انور جمال نہ صرف شاعر ہیں بلکہ انجینئر بھی ہیں۔ انور صاحب بنیادی طور پر ردولوی ہیں مگر ملازمت کا بیشتر حصہ گجرات میں گزرا اور ان کی شاعری بھی وہیں پروان چڑھی۔ اودھ سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی شعری و ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ مہمان خصوصی پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا کہ انور جمال شاعری اور نثر دونوں ہی میدانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان پر لکھے مضامین کو ڈاکٹر منصور حسن خاں نے مرتب کرکے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ صوفی سید اظہار علی نے کہا سید انور جمال تقریباً چار کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی شاعری ملتی ہے۔ اگر ڈاکٹر منصور حسن خاں نے ان پر لکھے گئے مضامین کو جمع نہ کیا ہوتا تو میں یقین سے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انور صاحب کی زندگی کے بہت سے روشن پہلو اجاگر نہ ہو پاتے۔ مہمان اعزازی خالد صدیقی صبرحدی نے کہا کہ میں انور صاحب سے بہت زیادہ واقف نہیں تھا مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک انجینئر ملازمت میں رہتے ہوئے تقریباً چار کتابوں کا مصنف بھی ہوسکتا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 جون 2022

راستے خاموش ہیں

حیدرآباد: اردو زبان کبھی ختم نہیں ہوگی، تاقیامت زندہ رہے گی کیونکہ اس زبان میں پڑھنے لکھنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد عابد صدیقی (لندن) نے کیا۔ وہ 22 مئی کی شام میڈیا پلس آڈیٹوریم میں مکرم نیاز کے افسانوں کے اولین مجموعہ 'راستے خاموش ہیں' کی تقریب رونمائی سے مخاطب تھے۔

یہ تقریب ادارہ ہفت روزہ گواہ کے زیر اہتمام میڈیا پلس آڈیٹوریم میں بروز اتوار 22 مئی کی شام منعقد ہوئی۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے صدارت کی۔ انھوں نے مکرم نیاز کے والد مرحوم رؤف خلش سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ مکرم نیاز نے نثر کو اپنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'راستے خاموش ہیں' افسانوں کے مجموعہ میں شامل 13 افسانوں میں مکرم نیاز نے جن احساسات کا اظہار کیا وہ غیر معمولی ہیں۔ محترمہ قمر جمالی صاحبہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور مکرم نیاز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیقات میں افکار و خیالات کا بہاؤ ہے۔ کہانی لکھنے کے لیے خون جگر جلانا ہوتا ہے۔ مکرم نیاز نے جو بھی لکھا واحد متکلم میں لکھا ہے۔ افسانہ کی زمین سنگلاخ ہوتی ہے۔ مکرم نیاز کی زبان میں سلیقہ اور افسانوں میں شائستہ فکر ہے۔ انھوں نے کہا کہ 21 ویں صدی ناولوں کی صدی ہے اس لیے قارئین کی گھٹتی تعداد کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ آنے والے برسوں میں مکرم نیاز اپنے فن کی بلندی کو چھو لیں گے۔ ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز نے بعض افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مکرم نیاز نے یہ افسانے 25-20 برس پہلے لکھے اور عجیب اتفاق ہے کہ انہی پلاٹس سے ملتی جلتی کہانیوں پر 'باغبان' اور 'تارے زمین پر' جیسی فلمیں بنی ہیں۔ عظیم قریشی نے مکرم نیاز کے ساتھ اپنی 37 سالہ دوستی اور مشترکہ ادبی سفر کا ذکر کیا۔ پروفیسر مصطفی علی سروری نے بھی خطاب کیا۔ سہیل عظیم نے دلچسپ انداز میں پروگرام کی کارروائی چلائی۔ سامعین میں سجاد الحسنین، ڈاکٹر ناظم علی، احمد ارشد حسین، یوسف روش، معظم راز، سید جلیس، معروف تعلیمی درسگاہ ادارہ ملیہ کے رشید اسرار کے علاوہ کئی سرکردہ ہستیاں بھی

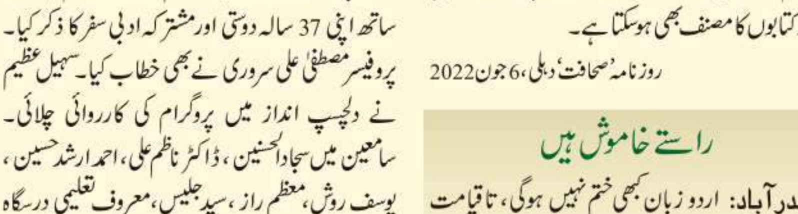

شامل رہیں۔ مکرم نیاز نے اپنی تقریر میں زبان اور ادب کا موازنہ کرتے ہوئے وضاحت کی کہ بات صرف زبان کی نہیں ہے بات تو شعر و ادب کی بھی ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ادب کا خزانہ ہوتا ہے۔ ادب، جو انسان کو بہتر زندگی کی راہ بتاتا ہے، سمجھاتا ہے، اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جب زبان ہی نہیں رہے گی تو ادب کہاں سے پیدا ہوگا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مکرم نیاز نے جذبات اور احساسات کا ایک وسیع سمندر سمیٹ کر اپنے افسانوں میں رکھ دیا ہے۔ ان کی کتاب کا پیش لفظ 'جو کہا نہیں وہ سنا کرو' بھی دلچسپ اور احساسات سے بھرپور بیانیہ ہے جس کے ذریعے انھوں نے بظاہر کچھ نہیں کہا اور بہت کچھ سنا دیا ہے۔ مقررین نے مکرم نیاز کے فن افسانہ نگاری کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی فکر کی پرواز اونچی ہے، ان کا انداز بیان سلیس اور الفاظ کا سیل رواں غیر معمولی ہے اور ان سے مستقبل میں بہت ساری امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ فرحان عزیز نے 'راستے خاموش ہیں' سے منتخب شدہ افسانہ 'بے حس' سنایا۔ یوسف روش نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ مکرم نیاز کی صاحبزادی ملاحت مکرم نے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے۔ جواں سال صحافی محسن خاں نے انتظامات کی نگرانی کی۔ احمد ارشد حسین نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: مکرم نیاز، حیدرآباد، 5 جون 2022

وفیات

پروفیسر گوپی چند نارنگ

نئی دہلی: ممتاز اردو دانشور، ناقد، محقق اور ماہر لسانیات ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا 15 جون بروز بدھ امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 91 سال تھی۔ وہ شارلوٹ نارتھ کیرولینا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ترون نارنگ کے یہاں مقیم تھے۔ وہ 11 فروری 1931 کو بلوچستان کے دُکی ضلع لورالائی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دلی کالج سے بی اے، ایم اے اور دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ دہلی یونیورسٹی کے کے سینٹ اسٹیفنس کالج سے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر وابستہ رہے۔ یونیورسٹی آف وسکانسن، یونیورسٹی آف مینے سوٹا اور یونیورسٹی

آف اوسلو میں بھی وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بحیثیت صدر شعبۂ اردو، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز اور قائم مقام وائس چانسلر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ وہ اردو میں مابعد جدیدیت کے بنیاد گزار تھے۔ ان کی تقریباً 60 سے زائد کتابیں ہیں جن میں اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ہندوستان کی تاریخ آزادی اور اردو شاعری، غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، فکشن شعریات، کاغذ آتش زدہ، تپش نامہ تمنا، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، امیر خسرو کا ہندوی کلام، ادبی تنقید اور اسلوبیات، قاری اساس تنقید، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، بیسویں صدی میں اردو ادب، اطلاقی تنقید، اردو زبان اور لسانیات، ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت قابل ذکر ہیں۔ 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' پر انھیں 1995 میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا۔ اس کے علاوہ انھیں پدم شری، پدم بھوشن، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اقبال سمان، گیان پیٹھ مورتی ایوارڈ جیسے اعزازات مل چکے ہیں۔ مختلف اردو اداروں اور اکادمیوں سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ دہلی اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ ان کی تصانیف کے انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ ان کی مادری زبان سرائیکی تھی مگر انھوں نے اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور 'اردو' کو وہ زبانوں کا تاج محل بھی کہتے تھے۔ انھیں سفیر اردو کی حیثیت سے بھی جانا جاتا تھا۔ ان کے پسماندگان میں ان کی شریک حیات منورما نارنگ کے علاوہ ڈاکٹر ارون نارنگ، ڈاکٹر ترون نارنگ ہیں۔

دی ہندو (انگریزی)، 16 جون اور دیگر اخبارات سے

پروفیسر اسلم آزاد

پٹنہ: معروف ادیب، صحافی، شاعر، جنتا دل یونائیٹڈ کے سینئر رہنما، بہار قانون ساز کونسل میں جنتا دل یونائیٹڈ کے سابق ڈپٹی لیڈر اور پٹنہ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سابق

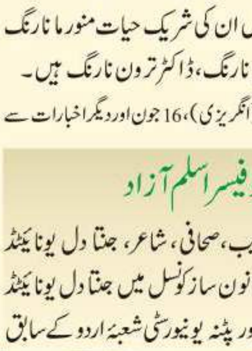

صدر پروفیسر اسلم آزاد کا 8 جون کو پٹنہ کے ایمس اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ پروفیسر آزاد کو گزشتہ سال کورونا ہوا تھا جس کے بعد ان کی صحت میں بتدریج گراوٹ آتی رہی۔ گزشتہ دنوں دہلی کے گنگا رام اسپتال اور میکس اسپتال میں ایڈمٹ کرایا گیا تھا۔ گنگا رام اسپتال میں قریب بیس دنوں تک ایڈمٹ رہنے کے بعد واپس پٹنہ آگئے تھے جہاں ان کی رہائش گاہ حرمت اپارٹمنٹ، پھلواری شریف میں رہ کر ان کا علاج ڈاکٹر وجے پرکاش کے یہاں ہورہا تھا مگر ان کی صحت میں خاطر خواہ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ تین دن قبل ان کو ایمس پٹنہ میں ایڈمٹ کرایا گیا تھا جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین 9 جون کو ان کے آبائی وطن مولا نگر، ضلع سیتامڑھی میں عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں پروفیسر فرزانہ اسلم کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

پروفیسر اسلم آزاد اردو فکشن تنقید کا ایک معتبر نام تھا۔ ان کی پیدائش 12 دسمبر 1948 کو ہوئی۔ انھوں نے بحیثیت استاد شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں لمبی خدمات انجام دیں، 1978 میں پروفیسر اسلم آزاد شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے۔ 1990 میں پہلی بار شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس کے بعد کئی مرتبہ صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز رہے، 2014 میں شعبۂ اردو سے سبکدوش ہوئے، اسلم آزاد نے کئی ادبی سرمایہ بھی چھوڑا جن میں اردو ناول آزادی کے بعد، عزیز احمد بحیثیت ناول نگار، قرۃ العین حیدر بحیثیت فکشن نگار، آنگن ایک تنقیدی مطالعہ، اردو کے غیر مسلم شعرا، مختلف وغیرہ شامل ہیں۔ اسلم آزاد شاعر کی حیثیت سے بھی منفرد شناخت رکھتے تھے، ان کے شعری مجموعے 'نشاط کرب' اور 'ریت پر اک نام' (نظموں کا مجموعہ) مقبول ہوا۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں ایک رسالہ 'شباب' کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا تھا۔ پروفیسر اسلم آزاد کا سیاسی سفر 1983 سے شروع ہوا۔ پھر 2006 میں جنتا دل یونائیٹڈ میں شامل ہوئے اور 11 مئی 2006 سے 2012 تک بہار قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ کونسل میں جنتا دل یونائیٹڈ کے ڈپٹی لیڈر بھی رہے۔

روزنامہ 'پندار'، پٹنہ اور دیگر اخبارات سے، 9 جون 2022

اصغر حسین قریشی

بھیونڈی: معروف ادیب، نقاد، سابق معلم اور ادبی رسالہ 'تکمیل' کے مدیر اصغر حسین قریشی 24 مئی 2022 کو انتقال کرگئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 68 سال تھی۔ انھیں 25 تاریخ کی صبح 10 بجے شانتی نگر میں واقع غیبی پیر قبرستان میں سیکڑوں سوگواروں، مداحوں، شاگردوں اور علمی وادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی موجودگی میں نم آنکھوں سے سپرد خاک کیا گیا۔

اصغر حسین قریشی 70 کی دہائی میں وطن مالوف خطہ برار کے مردم خیز شہر ملکاپور (ضلع بلڈانہ) سے تلاش معاش کے سلسلے میں بھیونڈی تشریف لائے تھے اور یہاں پیشہ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اصغر حسین قریشی نے چھوٹے بھائیوں مظہر سلیم (مرحوم)، اکبر عابد، حفظ الکبیر پرواز اور ذاکر حسین قریشی کے ساتھ مل کر 90 کی دہائی میں رسالہ تکمیل جاری کیا۔ اس رسالے نے ممبئی کے ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنی شناخت قائم کی بلکہ اپنے خصوصی نمبروں اور جدت طرازی کے دم پر اردو ادب اور اس کی صحافت کو نئی پرواز عطا کی۔ اصغر حسین قریشی نے تکمیل کے ذریعے نئی سوچ اور نئے اذہان کو سامنے لانے کے لیے انتھک محنت کی۔ رسالے کی کامیابی میں کلیدی کردار اصغر حسین قریشی کا تھا۔ تکمیل کی ادارت اور تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی انھوں نے تحقیق وتنقید میں بھی اپنی سعی جاری رکھی۔ اسی کے تحت 2004 میں تنقیدی مضامین پر مبنی ان کی تصنیف 'لکیریں' منظر عام پر آئی جبکہ حال ہی میں ان کی معرکۃ الآرا تصنیف 'بھیونڈی میں اردو نثر' منظر عام پر آئی تھی جس کی بھیونڈی واطراف کے اردو حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے تعلیمی میدان میں معیاری رسالے کی کمی کا خلا پر کرنے کے لیے 'نقیب تعلیم' کے عنوان سے خالص تعلیمی موضوعات پر ایک پرچہ جاری کیا تھا۔ 2013 میں تقریباً 38 سال کی تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد خاصی ہے۔ وہ ایک عرصے تک بال بھارتی اردو بورڈ (پونے) کے ممبر بھی رہے جبکہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے بھیونڈی سینٹر کے لیکچرار بھی تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ ان کے فرزند عامر اصغر بھی بھیونڈی کے ادبی وتعلیمی حلقوں میں معروف نام ہیں اور رئیس ہائی اسکول میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ رکن انقلاب مبشر اکبران کے بھتیجے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 25 مئی 2022

پروفیسر عطیہ نشاط

نئی دھلی: پروفیسر عطیہ نشاط خان سابق صدر شعبۂ

اردو الہ آباد یونیورسٹی کا 27 مئی کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 75 سال تھی۔ مرحومہ تدریسی دنیا کا ایک معتبر نام تھیں، انھوں نے بنیادی طور پر اردو ڈرامے پر کام کیا۔ ان کا آبائی وطن الہ آباد تھا۔ پروفیسر نشاط سابق ممبر پارلیمنٹ اور سینئر صحافی شاہد صدیقی کی خوش دامن تھیں۔ ان کی تدفین دہلی کے پنج پیران قبرستان میں عمل میں آئی، مرحومہ کے پسماندگان میں تین بیٹیاں ایک بیٹا شامل ہیں۔ شاہد صدیقی نے اپنی خوش دامن کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے تعزیت پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ مرحومہ ادب کے حوالے سے پوری دنیا میں جانی پہچانی جاتی تھیں۔ ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے سے ہمارے سر سے ایک بزرگ کا سایہ اٹھ گیا، ہم خدا سے ان کے بلند درجات اور مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2022

شہزادہ بسمل

سری نگر: نامور قلمکار اور کالم نگار شہزادہ بسمل کا 23 مئی 2022 کو انتقال ہوگیا۔ ان کا اصلی نام غلام قادر خان ہے۔ سہیل سالم کی ایک تحریر کے مطابق ان کا تعلق سری نگر سے بربرشاہ علاقے سے ہے۔ 13 ستمبر 1944 کو ستو بربرشاہ میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی علاقے میں حاصل کی۔ 1960 میں ایس پی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد سرکاری نوکری کا پیشہ اختیار کیا۔ سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر جوائنٹ سکریٹری آف اسکول ایجوکیشن کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔'' بنیادی طور پر وہ کالم نگار تھے۔ 25 سال کی عمر میں انھوں نے کالم نگاری کا آغاز کیا تھا۔ برصغیر کے مختلف اخبار و رسائل بالخصوص کشمیر کے اخبارات میں ان کے کالم تواتر کے ساتھ چھپتے تھے۔ سہیل سالم کی اطلاع کے مطابق ''1 جولائی 2009 کو کشمیر عظمیٰ کے لیے 'چلتے چلتے' کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کیا جو مسلسل 2019 تک شائع ہوتا رہا۔'' ان کی تقریباً آٹھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ہندو صحائف میں ذکر پیغمبر آخرالزماں، ڈل جھیل کی فریاد، رقص بسمل، خدا کے لیے مجھے بچاؤ، خوشبو کی موت، چلتے چلتے کالموں کے تین جلد، اور دو ناولٹ قابل ذکر ہیں۔ جموں و کشمیر فکشن رائٹر گلڈ کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ ز بھی مل چکے ہیں۔ کالم نگاری کے لیے تعمیل ارشاد کی طرف سے بھی ایوارڈ سے نوازے گئے۔

سہیل سالم کے مضمون مطبوعہ ہفت روزہ گواہ ایکسپریس 3 جون 2022 سے ماخوذ

علامہ ہاشم نعیمی

نئی دہلی: جامعہ نعیمیہ مراد آباد کے پروفیسر معقولات امام المنطق علامہ ہاشم نعیمی 21 شوال 1443ھ مطابق 23 مئی 2022 کو کوچ کر گئے۔ انھوں نے نصف صدی تک حدیث و تفسیر اور منطق و فلسفہ کا درس دیا۔ ان کی درس گاہ سے فیض پانے والوں میں بڑے بڑے علما مشائخ، ادیب وشعرا، تصنیف و تالیف کے شہ سوار پائے جاتے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً نوے سال تھی۔ آپ 1959 سے جامعہ نعیمیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، جو اخیر وقت تک جاری رہیں۔ آپ کا کل زمانۂ تدریس تقریباً 63 سال پر محیط ہے۔ دور حاضر میں درس و تدریس کا ایسا لمبا تجربہ رکھنے والی گنی چنی شخصیت ہیں۔ آپ کا انتقال تدریسی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان ہے جسے آسانی سے پر نہیں کیا جاسکتا۔ یوں تو انھوں نے باضابطہ تصنیف و تالیف نہیں چھوڑی، لیکن ان کی درس گاہ سے خوشہ چینی کرنے والوں میں بڑے بڑے نامور مصنفین اور ماہرین قرطاس وقلم پائے جاتے ہیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2022

عبدالمتین

دھنباد: 50 کے دہے کے مقبول افسانہ نگار عبدالمتین 6 جون کو نو بجے رات اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ عبدالمتین 18 مئی 1938 کو گیا کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد حکیم سید محمد ظہیر ڈپٹی نذیر احمد اور عبداللہ غازی پوری محدث دہلوی کے شاگرد اور گیا کے ممتاز عالم دین اور شہر طبیب

تھے۔ عبدالمتین نے تھوسوفیکل ماڈل اسکول گیا سے 1952 میں میٹرک کیا۔ گیا کالج گیا سے بی اے اور بہار یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ 1958 میں کول مائنس پراویڈنٹ فنڈ آرگنائزیشن میں ملازمت کے سلسلے میں آسنسول منتقل ہوگئے۔ وہاں 23 سال، آسنسول کے ادبی حلقے میں بطور روح رواں مقبول اور فعال رہے۔ 1976 میں انھوں نے آسنسول کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ 'ہمارے افسانے' نذیر احمد یوسفی اور شین کریمی کے ساتھ ترتیب دیا۔ 70-1960 کے دہے میں مقبول اور معیار ساز رسالہ 'سریر گیا'، کے ادارتی بورڈ سے منسلک رہے۔

عبدالمتین کا افسانوی سفر 1952 سے شروع ہوا۔ پہلے یہ متین صبا کے نام سے افسانے لکھتے رہے، پھر متین ظہیر ہوئے، لیکن بعد میں انھوں نے اپنا پورا نام 'عبدالمتین' اختیار کیا۔ رنگوں کا تعاقب، کائنات کی موت، چٹان، سوال، پیراڈاکس، الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، سفر ان کے نمائندہ اور مقبول افسانے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'رنگوں کا تعاقب' اور 'تلاش' شائع ہوکر شائقین ادب کی توجہ کا مرکز بنے۔ آسنسول سے تبادلہ کے بعد یہ 1963 میں دھنباد آگئے، اور 1996 میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر، کول مائنس پراویڈنٹ فنڈ آرگنائزیشن، ریٹائر ہوکر، یہیں سکونت اختیار کی اور زندگی کی آخری سانس لی۔۔۔!

پریس ریلیز: عشرت ظہیر، گیا، 9 جون 2022

ماسٹر نسیم اختر

سہارنپور: شہر کی معروف تعلیمی سماجی شخصیت اور نسیم اکول کے بانی ماسٹر نسیم اختر کا طویل علالت کے بعد 13 مئی کو انتقال ہوگیا۔ تدفین حضرت گوٹے شاہ کے قبرستان میں ہوئی ہے۔ نماز جنازہ باغوں والی مسجد میں ادا کی گئی، جنازہ میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی جس میں تعلیمی اور سماجی شخصیات کے علاوہ سیاسی شخصیات بھی شامل تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر سے تعلیمی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مرحوم کچھ سالوں سے کافی علیل تھے اور گھر سے باہر آنا جانا بند ہوگیا تھا۔ شہر میں جن لوگوں نے پرائمری اسکولوں کی داغ بیل ڈالی تھی ان میں مرحوم سرفہرست تھے۔ انھوں نے 1970 میں شاہ بہلول

کے علاقہ میں ایک گھر میں نسیم بیسک اسکول کھولا تھا جواب اپنی نئی بلڈنگ میں چل رہا ہے اور شہر کے پرائیویٹ پرائمری ہندی میڈیم کے قدیم اسکولوں میں سے ایک ہے۔

مرحوم ماسٹر نسیم اختر بی اے انتہائی شریف النفس، دیندار اور ملت کا درد رکھنے والی شخصیت تھے اور تعلیم کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ انتہائی کم فیس لے کر غریبوں کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کررہے تھے، تاحیات وہ اسی خدمت میں مصروف رہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے وسیم اختر، طیب ندیم اور شارق نجم کے علاوہ بیٹی اور داماد بھی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 مئی 2022

حافظ اقرار احمد عباسی

امروهه: نامور ماہر قانون، ماہر تعلیم اور ادبی وسماجی حلقہ کی نہایت معتبر شخصیت حافظ اقرار احمد عباسی کا 11 مئی کو انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے عادل عباسی پرنسپل عبدالکریم انٹر کالج نے بتایا کہ ان کی عمر 93 سال تھی اور گزشتہ کئی دن سے علیل چل رہے تھے۔ بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ جامع مسجد امروہہ میں ادا کی گئی جس کے بعد مرحوم کی تدفین آبائی قبرستان آواس وکاس میں ادا کی گئی جہاں شہر امروہہ کی معزز شخصیات کثیر التعداد میں شریک تھی۔ مرحوم کے انتقال پر ملال پر ادبی اور ثقافتی تنظیم کاروان خلوص کی جانب سے ایک دعائیہ جلسہ نواب منزل محلہ پوتہ میں منعقد ہوا، حافظ اقرار احمد عباسی مرحوم کی ادبی، سماجی وعلمی خدمات کو یاد کرتے ہوئے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ کاروان خلوص کے صدر محبوب حسین زیدی نے کہا کہ مرحوم کا ہماری نشست سے گہرا تعلق تھا اور ہمارے سرپرست نواب انتقام علی خان سے گہرے مراسم تھے، ہمیشہ ہماری ادبی محافل میں شرکت کرتے تھے۔ وہ قوم کے ہمدرد تھے، مرحوم کی کمی اہل امروہہ بڑی شدت سے ساتھ محسوس کریں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 مئی 2022

کلام الدین

نئی دهلی: نئی دہلی کے معروف صحافی وسماجی کارکن، اوکھلا پریس کلب کے صدر اور این ڈی ٹی وی کے چیف کوآرڈینیٹر محمد اطہر الدین عرف منے بھارتی کے والد جناب کلام الدین صاحب سابق اسسٹنٹ کمشنر سیلس ٹیکس اتر پردیش کا 96 سال کی عمر میں شاہین باغ میں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ انتقال کی خبر سن کر تمام صحافی برادری وسماجی کارکنوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مئی 2022

خراج عقیدت

لتا منگیشکر کو خراجِ تحسین

میرا روڈ: تہذیب کے بطن سے موسیقی کا ظہور ہوتا ہے، پھر موسیقی تہذیب کو پروان چڑھاتی ہے۔ چنانچہ دونوں ہی کا ساتھ ایک دوسرے کے تئیں چولی دامن کا ہے۔ 'سا گا تا دھا' موسیقی اور تہذیب کے لیے وقف ایک ایسا کارآمد ادارہ ہے جسے معروف موسیقار اُستاد جبار حسین خان کی رہنمائی حاصل ہے۔

28 مئی بروز سنیچر کی شام 7 بجے ورونگلا کینندر ہال، پونم ساگر کمپلیکس، میرا روڈ میں 'روئے غزل' کے عنوان سے بھارت رتن، نابغۂ روزگار گلوکارہ آں جہانی لتا منگیشکر کو خراج تحسین پیش کیا گیا، جس میں استاد جبار حسین خان، صبور خان اور سوما بنرجی نے لتا منگیشکر کے گائے ایک ایک گیت پیش کیے، جنھیں سامعین نے خوب سراہا۔ بعد ازاں مشہور و معروف شعرا کے کلام پیش کرکے سامعین کو محظوظ کیا۔ سوما بنرجی بالی ووڈ کی جانی مانی گلوکارہ ہیں۔ آپ نے متعدد فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا ہے۔ مذکورہ پروگرام میں سوما بنرجی نے اپنی مترنم آواز میں 'کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی' سنا کر سامعین کا دل جیت لیا۔

اس پروگرام کی نظامت کے فرائض آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر محترم آنند سنگھ انجام دے رہے تھے۔ جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر محترم محسن رحیم مریڈیا نے محفل کو رونق بخشی۔ علاوہ ازیں مہمانان میں علاقے کے کارپوریٹر ایس اے خان اور معروف شاعر محترم شمیم عباس رونق افروز تھے۔ مہمانان اور فنکاران کی خدمت میں گلوں کا نذرانہ نیز شال پیش کرکے عزت افزائی کی گئی۔ آخر میں 'سا گا تا دھا' کے فاؤنڈر ٹرسٹی استاد جبار حسین خان نے تمام مہمانان، فنکاران اور سامعین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ موسیقی ہماری روح کو تازگی بخشتی ہے، لہٰذا مستقبل میں بھی ہم اس قبیل کے پروگرام کرتے رہیں گے۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی، 30 مئی 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ.................................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شریمد بھگوت گیتا

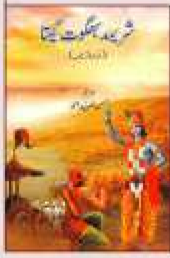

مترجم: حسن الدین احمد

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 105

قیمت 80 روپے

داراشکوہ: آثار و افکار

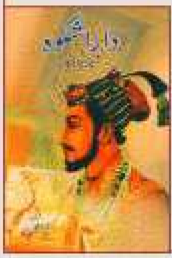

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 234

قیمت: 150 روپے

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں

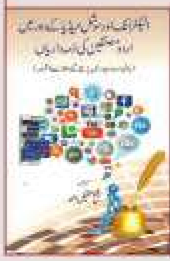

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 182

قیمت: 110 روپے

شاد عظیم آبادی

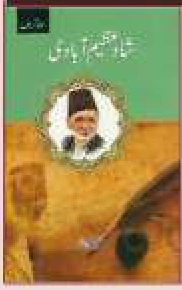

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 156

قیمت: 95 روپے

الف لیلہ و لیلہ (جلد اوّل تا ہفتم)

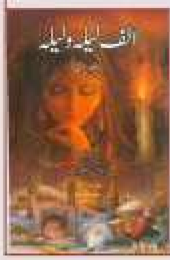

مترجم: ابوالحسن منصور احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 368 (جلد اوّل)، 455 (دوم)
429 (سوم)، 347 (چہارم)، 314 پنجم
313 (ششم)، 223 (ہفتم)

قیمت 1185 روپے (مکمل سیٹ)

اصول طب

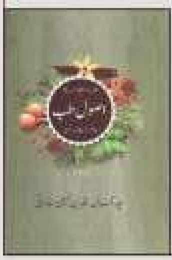

مصنف: سید کمال الدین حسین ہمدانی

ساتویں طباعت: 2022

صفحات: 598

قیمت: 160 روپے

کلاسیکی اور عصری سماجیاتی نظریے

مصنف: عذرا عابدی

پہلی اشاعت:: 2021

صفحات: 446

قیمت: 205 روپے

خلجی خاندان

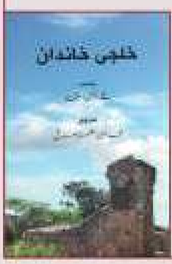

مصنف: کے ایس لال

مترجم: محمد یلیین مظہر صدیقی

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 481، قیمت: 220 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जूलाई-२०२२,वर्ष:२४, अंक:७
URDU DUNIYA Monthly, July-2022, Vol.24, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

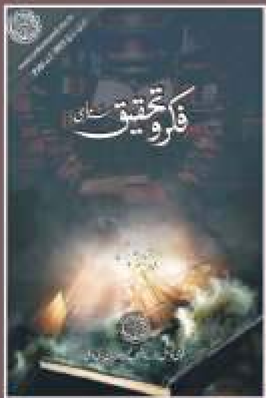

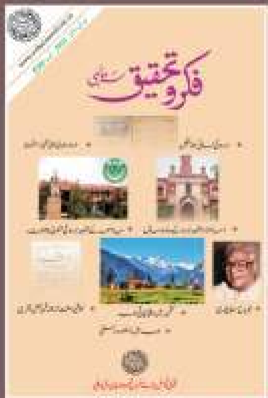

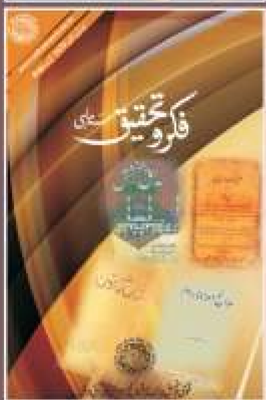

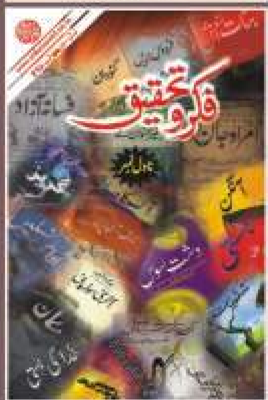

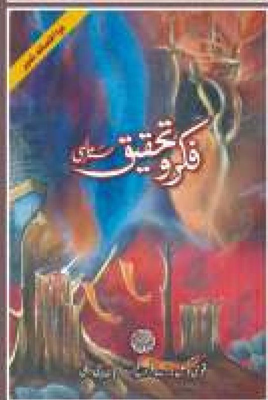

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6